ڈاکٹر وزیر آغا کی اردو نظم

کا

موضوعاتی و تجزیاتی مطالعہ

Accession No. TH15509

(مقالہ برائے ایم ایس اردو)

محقق: عرفان احمد

(رجسٹریشن نمبر: 87-fll/ms urdu/f10)

نگران: ڈاکٹر محمد ندیم اسلم

(روش ندیم)

INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY
ISLAMABAD

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

MS
891.4391008
وزر ع

TH 15509

وزیر آغا، ڈاکٹر۔ نظمیں۔ تنقیدی مطالعہ

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

فیکلٹی آف لینگو ایجز اینڈ لٹریچر

شعبہ اُردو

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ عرفان احمد ولد محمد احمد رجسٹریشن نمبر: 87-FLL/MSURDU/F-10 نے اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان ''**وزیر آغا کی اردو نظم کا موضوعاتی و تجزیاتی مطالعہ**'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس موضوع پر کہیں اور اس طرح کا کام نہیں ہوا اور یہ سرقے سے پاک ہے۔

ڈاکٹر محمد ندیم اسلم (روش ندیم)

شعبہ اُردو

فیکلٹی آف لینگو ایجز اینڈ لٹریچر

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست ابواب

		صفحہ نمبر
	دیباچہ	1
باب اوّل:	ڈاکٹر وزیر آغا: سوانح، شخصیت اور ادبی خدمات	4
باب دوم:	جدید اردو نظم اور وزیر آغا کی نظم نگاری	72
باب سوم:	وزیر آغا کی اردو نظم: موضوعات کی داخلی جہات کا تجزیہ	125
باب چہارم:	وزیر آغا کی اردو نظم: موضوعات کی خارجی جہات کا تجزیہ	188
	حاصلات و نتائج	244
	کتابیات	250

دیباچہ

جدید نظم نگاری کی بنیاد حالی نے مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس مدّ و جزر اسلام کے ذریعے جبکہ آزاد نے انجمن پنجاب کے مشاعروں کو رونق عطا کر کے رکھی تھی۔ بعد ازاں اقبال نے جدید اردو نظم کو اگلی منزلوں تک پہنچایا۔ اردو میں مختلف ادبی تحریکوں نے بھی جدید اردو نظم کو کافی تقویت بخشی۔ جس میں رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کا کردار بہت اہم رہا۔ رومانوی تحریک نے اردو نظم کو تازگی عطا کی تو ترقی پسند تحریک نے اس کے موضوعات میں بیش بہا اضافہ کیا اور بعد میں حلقہ ارباب ذوق نے جدید اردو نظم میں شاندار اضافے کیے۔ میراجی، ن م راشد، مجید امجد اور فیض احمد فیض جیسے باکمال شعرا نے جدید اردو نظم کے دائرہ کار کو بہت وسعت عطا کی۔ وزیر آغا اسی دور کے شاعر ہیں جب حلقہ ارباب ذوق جدید اردو نظم کو فروغ دے رہا تھا۔ وزیر آغا بھی آغاز میں حلقہ ارباب ذوق میں اپنی شاعری پیش کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم ''دھرتی کی آواز'' کو سال کی بہترین نظم کے طور پر منتخب بھی کیا گیا تھا۔

۶۰ء کی دہائی کے بعد جدید اردو نظم نگاری میں وزیر آغا کا کردار بہت اہم گِنا جاتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف خود نظم لکھی بلکہ ''اوراق'' کے ذریعے جدید نظم نگاری کے لیے راہ ہموار کی اور جدید نظم نگاروں کی ایک کھیپ متعارف کرائی۔ وزیر آغا کی انہی خصوصیات کے باعث میں نے وزیر آغا کی نظم نگاری کو اپنی تحقیق کے موضوع کے طور پر منتخب کیا۔ میں نے اپنے اس مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے جن کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

پہلے باب ''ڈاکٹر وزیر آغا: سوانح، شخصیت اور ادبی خدمات'' میں وزیر آغا کی زندگی کے احوال و واقعات، ان کی شخصیت کے اہم پہلو اور ان کی ادبی خدمات پر بات کی گئی ہے۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ کیسے وزیر آغا سرگودھا کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر اردو ادب کی ایک اہم شخصیت بنے۔ ان تمام اسباب، واقعات اور حالات کو بیان کیا گیا ہے جنہوں نے چک ۵۶ جنوبی کے وزیر آغا کو ڈاکٹر وزیر آغا

اور''اوراق'' جیسے مجلّہ کا مدیر بنایا۔وزیرآغا کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی کارناموں کو بھی منظرعام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے باب''جدید اردو نظم اور وزیرآغا کی نظم نگاری'' میں جدید اردو نظم نگاری کے آغاز و ارتقا اور وزیرآغا کی نظم نگاری پر نظر ڈالی گئی ہے۔پس منظر میں جنگ آزادی کے بعد اردو شاعری،غزل کی جگہ نظم اور اسے حب الوطنی وفطرتی مناظر کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔پھر بہت جلد اس جدید نظم نگاری کو بہت پذیرائی ملنے لگی جس کی وجہ عالمی حالات اور عالمی شاعری پر پڑنے والے اثرات بھی بنے۔عالمی ادبی تحاریک سے اردو ادب بھی متاثر ہوا اور ان تمام تحریکوں نے جدید اردو نظم کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔وزیرآغا نے بھی اس تبدیلی کا اثر قبول کیا اور اپنی شاعری میں نئے موضوعات اور نئے تجربات سے جدید اردو نظم میں وسعت پیدا کی۔

تیسرے باب''وزیرآغا کی اردو نظم: موضوعات کی داخلی جہات کا تجزیہ''میں وزیرآغا کی اردو نظموں کے اخلاقی،علمی،جذباتی اور داخلی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے جن میں دکھ وخوشی،ضمیر کی آواز،نیکی و بدی،آس و یاس،بہادری،محبت ،ماں،انسانی ارتقاء،انسان کی حیثیت ،انسان کی مجبوری و لاچاری، یادیں،انسانی زندگی کے ادوار،بڑھاپا،موت،اہلیہ کی وفات،سردی،تنہائی اور ہوا شامل ہیں۔وزیرآغا نے ان تمام موضوعات پر اپنے جذبات،احساسات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان موضوعات پر مشتمل نظموں کا موضوعاتی مطالعہ اس باب میں کیا گیا ہے۔

چوتھے باب''وزیرآغا کی اردو نظم: موضوعات کی خارجی جہات کا تجزیہ''میں وزیرآغا کی شاعری میں موجود سماجی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ان موضوعات میں جستجو وآگاہی،وقت،محنت،عالم کا کردار،صنعتی ترقی،اخلاقی اقدار کا فقدان،کاہلی و سستی،ظلم کے خلاف آواز،اسلاف کی پیروی،مغربی تہذیب،رہنما کی ضرورت،دنیا داری،دنیاوی کاموں میں الجھنا،فطرتی مناظر سے لطف اندوزی،خدمت خلق،نیک لوگوں کی صفات،جنگ،قدرتی آفات،پردیس اور تھوڑی زندگی شامل ہیں۔

دورانِ تحقیق اس مقالے میں سب سے بڑھ کر میرے شفیق استاد اور نگران جناب ڈاکٹر روش ندیم نے ایک ایک قدم پر میری رہنمائی کی۔انہوں نے ہمیشہ میری رہنمائی کے لیے خاص وقت نکالا۔میں ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں،کم ہے۔ڈاکٹر روش ندیم ایک ایسی ہستی ہیں جو اپنے ہر طالب علم کے دل میں بستے ہیں۔ان کی سادگی،عاجزی،محبت،خلوص،حسن سلوک،شفقت،صلہ رحمی اور اپنے کام میں مہارت نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ڈاکٹر روش ندیم میں ایک اچھے استاد اور ایک اچھے انسان کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔میں ان کی

رہنمائی، تعاون اور حوصلہ افزائی کے باعث یہ مقالہ مکمل کر پایا۔ ان کے علاوہ میں اپنے دیگر اساتذہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن میں ڈاکٹر طیب منیر صاحب، ڈاکٹر سہیل عباس صاحب اور ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب شامل ہیں۔

میں ''وزیریات'' کے ماہر جناب ذوالفقار احسن کا بہت شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے ہمیشہ میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ میں جب بھی تحقیق کے لیے سرگودھا گیا، انہوں نے ہمیشہ میرا بہت گرم جوشی سے استقبال کیا اور عزت بخشی۔ ذوالفقار احسن صاحب درویش صفت انسان ہیں۔ یہ میرا ہی نہیں میرے استاد جناب ڈاکٹر روش ندیم کا بھی ان کے بارے میں کہنا ہے۔ ان کی بدولت آج میں اس مقام پر پہنچا ہوں کہ اپنا مقالہ مکمل کر چکا ہوں۔ میں وزیر آغا کے بیٹے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جب ایک بار میں ان سے ملاقات کے لیے ان کے آبائی گاؤں وزیر کوٹ گیا تو انہوں نے مجھے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ میں کسی اجنبی سے ملاقات کر رہا ہوں۔ ویسے بھی مجھے وہ جگہ دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا جہاں میرے مقالہ کا مرکزی کردار ''ڈاکٹر وزیر آغا'' نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔ میری روحانی حالت وہاں پہنچ کر ایسی تھی جیسے انسان مسجد میں جا کر محسوس کرتا ہے۔ جناب ڈاکٹر رشید امجد کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جب کبھی ان سے رہنمائی چاہی، انہوں نے کبھی انکار نہ کیا اور میری ہر ممکن مدد کی۔ میں آخر میں اپنے دوست جناب عاطف افتخار کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے مقالہ کے دوران میری بہت مدد کی۔

میں اپنے گھر والوں خاص طور پر والد صاحب اور اپنی اہلیہ کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے مسلسل میری بہت حوصلہ افزائی اور معاونت کی اور قدم قدم پر میری کامیابی کے لیے دعائیں کیں۔

عرفان احمد۔

باب اوّل

ڈاکٹر وزیر آغا: سوانح، شخصیت اور ادبی خدمات

وزیر آغا کے پردادا ایران میں مقیم تھے اور وہ وہاں گھوڑوں کے سوداگر تھے۔ شاید وہ کاروبار کی وجہ سے یا سیاسی حالات کی وجہ سے ایران سے افغانستان ہجرت کر گئے تھے۔ افغانستان سے اُن کے دادا وزیر خان پشاور آئے اور وہاں سے لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب سلطان کی سرائے میں قیام کیا۔ لاہور میں قیام کے دوران اُن کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات اچھے بنے۔ لاہور میں اُن کی دوستی مشہور ناول نگار رڈیارڈ کپلنگ سے ہوئی۔ وہ اس دور میں لاہور کے ایک انگریزی اخبار میں کام کرتا تھا۔ وزیر آغا نے اپنی خودنوشت شام کی منڈیر میں لکھا ہے کہ:

> والد صاحب سے مجھے پتہ چلا کہ کپلنگ ہر شام میرے دادا کے پاس سلطان کی سرائے میں آجاتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ بعدازاں جب کپلنگ نے ناول KIM لکھا تو اس میں میرے دادا کے ایک بھائی کو بہ طور کردار شامل کیا۔ میرے دادا کے چھوٹے بھائی اچانک انتقال پا گئے تو ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔(۱)

اور اس وجہ سے اُن کے گھر کے مالی حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں برطانوی حکومت نے گھوڑی پال سکیم کے تحت مختلف لوگوں کو اس شرط پر زمینیں دیں کہ وہ ہر پچاس ایکڑ پر ایک گھوڑی پالیں گے اور گھوڑی کے بچے حکومت کو سستے داموں دیے جائیں گے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے والد وسعت علی خان نے حالات بہتر کرنے کے لئے حکومت سے گھوڑی پالی سکیم کے تحت سرگودھا میں سات سو ایکڑ زمین حاصل کر لی اور وہ لاہور سے نقل مکانی کر کے سرگودھا آ گئے۔ انہوں نے سرگودھا آ کر ایک چھوٹا سا گاؤں اپنے والد کے نام پر وزیر کوٹ آباد کیا۔ وسعت علی نے محنت کر کے اس زمین کے جنگل اکھیڑے اور زمین کو ہموار

کیا۔ وزیر آغا کی پیدائش تک ابھی زمین ہموار نہ ہوئی تھی۔ وزیر آغا کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد زمیندار طبقہ پریشانیوں کی زد میں آ گیا۔ زمیندار اپنا مالیہ اور آبیانہ تک دینے کے لیے مہاجن کا مرہون منت ہو گیا۔ وسعت علی خان نے اس بحرانی کیفیت کی زد میں آ کر آخر کار گھر کے زیورات تک فروخت کر دیئے۔ اِن واقعات نے وزیر آغا کے ننھے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتّب کئے لیکن اس کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے خاندان کے معاشی حالات میں بہتری پیدا ہوتی گئی اور دس پندرہ برس میں اُن کے خاندانی حالات معاشی طور پر کافی مستحکم ہو گئے۔ طارق حبیب نے وزیر آغا کے والد آغا وسعت علی خان کی پیدائش کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''آپ کے والد آغا وسعت علی خان ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ کو پیدا ہوئے۔''(۲) انہوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ دوسری بیوی سے ایک بیٹا وزیر آغا پیدا ہوا۔ وزیر آغا کے والد تصوف میں کمال رکھتے تھے۔ بقول وزیر آغا:

> میرے والد کو پتہ نہیں کیسے تصوّف سے شغف ہو گیا۔ وہ تصوّف اور ویدانت پر لکھی کتابیں لاتے اور برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر انہیں پڑھتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آدمی کو اپنی بات بچوں کی سی سیدھی سادی زبان میں کہنی چاہیے۔ تصوّف اور بعض دوسرے معاملات میں مجھ پر اپنے والد کا ہی اثر ہے۔(۳)

وزیر آغا اور اُن کا بھانجا شمس آغا، دونوں آغا وسعت علی خاں کی محفل میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہ دونوں اُن کی باتیں بہت غور و خوض سے سُنا کرتے تھے۔ وزیر آغا کے والد اُن دونوں کے بڑے بڑے سوالات کو چھوٹی چھوٹی کہانیاں بیان کر کے حل کر دیتے۔ اُن کے والد نے اُن دونوں کو بتایا کہ پچیس تیس سال تک انہوں نے تصوّف اور ویدانت کا مطالعہ کیا اور وہ ہندوستان بھر میں صوفیوں، یوگیوں اور ویدانتیوں کی تلاش میں پھرتے رہے۔ اُن کے والد کے مطالعے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ساری ساری رات چراغ کی روشنی میں پڑھتے رہتے تھے، وہ دنیا کو ترک کرنے یا سنیاس اختیار کرنے کے روایتی تصوّر کو نہیں مانتے تھے۔ وہ اکثر اُن دونوں کو مولانا روم اور فرید الدین عطار کے اشعار سناتے۔ انہوں نے الہامی کتب کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا اور وہ اکثر ان کا ذکر بھی کرتے تھے۔ پرانے عہد نامے میں تخلیق کائنات کی تمثیل کو وہ نئے نئے زاویوں سے بیان کرتے اور غزل الغزلات کے حصے کو شاعری قرار دیتے۔ ویدوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان میں موجود شاعری اُن دعاؤں پر مشتمل ہے جو برکھا اور دودھ اور پتر کے حصول کے لیے تھیں۔ البتہ وہ اپنشدوں کے بہت قائل تھے کہ ان سے فلسفے کے چھے مکاتب نے جنم لیا تھا۔ قرآن حکیم کے مطالعے پر بہت زور دیتے تھے۔ اِن تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ

اُن کے پاس کتنا وسیع علم تھا۔متعدد نامور لوگ آپ کے والد سے فیض یاب ہونے آپ کے گھر آیا کرتے تھے۔ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر وزیر آغا نجی محافل میں بتایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی مولانا صلاح الدین احمد اور پروفیسر حمید احمد خاں وہاں (وزیر کوٹ) پہنچتے اور میرے والد کے پاس بیٹھ کر ان سے تصوّف کے مسائل سے استفادہ کرتے۔''(۴) اس سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے والد کافی علم والے تھے یہی وجہ ہے کہ کئی نامور ادیب ان سے علم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ڈاکٹر پرویز پروازی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''وع خ'' نے وزیر آغا کو صرف زمین ہی نہیں دی، علم اور فلسفے کا ذوق بھی دیا۔وہ خود اپنے زمانے کے مانے ہوئے ویدانتی تھے۔لوگ دور دور سے اپدیش لینے کو آتے اور مہینوں قیام کر کے ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔نام ونمود سے نفور تھے،اس لیے اپدیش دینے کو فرض جانتے تھے مگر ان کا چرچا کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے یہ تو برادرم ڈاکٹر انور سدید کی ہمت ہے کہ انہوں نے وع خ کے اپدیشوں کو ''رادھے شیام کے نام'' کے عنوان سے یکجا کر کے، ان کا تھوڑا بہت ریکارڈ محفوظ کر دیا، ورنہ وہ اپدیش بھی ان کے وجود کی طرح وزیر کوٹ کے کسی حجرے میں دفن ہو جاتے۔(۵)

جب وزیر آغا سرگودھا شہر میں واقع اپنی کوٹھی میں منتقل ہوئے تو اُن کے والد بھی اُن کے ساتھ ہی آ گئے تھے جو شہر میں آ کر بڑی شان وشوکت سے رہتے تھے۔لوگ اُن کے ٹھاٹھ، لمبی مونچھوں سے بہت متاثر تھے۔اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے والد ایک بارُعب شخص تھے۔انتقال کے وقت اُن کی عمر نوّے برس کے لگ بھگ تھی۔وہ اس عمر میں بھی ذہنی طور پر بالکل چاق وچوبند تھے۔اُن کے معمولات میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔وہ ناشتے کے بعد ضعیف العمری کے باوجود باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو بعض اوقات تین تین گھنٹوں تک اُپدیش دیتے تھے۔۵جنوری ۱۹۷۰ء کو اُنہیں ہلکا سا بخار آیا اور وہ بے ہوش ہو گئے اور بے ہوشی کی حالت میں ہی وفات پا گئے۔وزیر آغا کے والد آغا وسعت علی خان ۸جنوری ۱۹۷۰ء/۲۹شوال المکرّم ۱۳۸۹ھ بروز جمعرات کو انتقال کر گئے۔

وزیر آغا کی والدہ کے بارے میں طارق حبیب سہ ماہی رسالہ ''اسالیب'' میں کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ: ''ڈاکٹر وزیر آغا کی والدہ کا نام حیدری بیگم تھا جبکہ آپ کے نانا کا نام مہدی حسین شاہ کاظمی تھا۔آپ کی والدہ کی وفات ۲۴اپریل ۱۹۶۶ء/۴محرم الحرام ۱۳۸۵ھ بروز اتوار ہوئی۔''(۶) وزیر آغا میں اُن کی

والدہ نے علم وادب کا شوق پیدا کیا اور یہ ان کی سعادت مندی تھی کہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے دو سوتیلے بھائی اور دو سوتیلی بہنیں تھیں جو عمر میں ان سے اتنے بڑے تھے کہ اُن کے بچے وزیر آغا کے ہم عمر تھے یا عمر میں ان سے بھی بڑے تھے۔

وزیر آغا ۱۸ مئی ۱۹۲۲/۲۱ رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ بروز جمعرات کو چک ۵۶ جنوبی وزیر کوٹ ضلع سرگودھا، پنجاب، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام وسعت علی خان تھا جو آخری ایّام میں ''وع خ'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ وزیر آغا کا تعلق ایران کے قزلباش خاندان سے ہے۔ وہ بچپن میں ایک مرتبہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئے جس کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر کمزور ہو گئے اور معدے کی بیماری مستقل صورت اختیار کر گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جوانی میں بھی اُن کا جسم صحت مند نہ ہو سکا۔ انہوں نے بچپن میں گاؤں میں کھیلے جانے والے تمام کھیل کھیلے۔ گرمیوں میں دن کا وقت نہر کنارے گزارتے۔ ۱۹۲۹ء کے عالمی بحران سے وزیر آغا کا گھر بھی بہت متاثر ہوا۔ جس کی وجہ سے وزیر آغا کے گھر کے معاشی حالات بھی خراب ہو گئے۔ حتیٰ کہ اُن کے گھر میں گوشت ہفتے میں صرف ایک بار پکتا تھا۔ بچوں کو لٹھے کی شلوار قمیص سال میں صرف ایک بار بنوا کے دی جاتی تھی۔ یہ بُحران وقتی تھا، عمومی طور پر وزیر آغا کا خاندان ہمیشہ معاشی طور پر مستحکم ہی رہا۔

وزیر آغا کے لڑکپن کا حصہ قدرے نامساعد حالات میں گزرا لیکن انہیں اس کا احساس اس لیے نہیں ہوا کہ علاقے کے دیگر لوگ بہت زیادہ غریب تھے۔ اُن کے لڑکپن کے دنوں میں اُن کے والد نے ایک تھرڈ ہینڈ کار چار سو روپے میں خریدی تھی۔ وزیر آغا شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے لڑکپن کا دَور ہر کسی کی طرح بھرپور اور شرارتوں بھرا تھا لیکن محرّم کے ایام میں اُن کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو جاتا۔ جب محرّم آتا، وہ مجالس سنتے، رباعیاں پڑھتے اور ذاکروں کے گرد گھومتے۔ اُن کے اکثر ہم جولی زور وشور سے ماتم بھی کرتے مگر وہ بہت شرمیلے تھے، اُن کے لیے عوام میں ماتم کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے وہ جب نہانے کے لیے غسل خانے میں جاتے تو اندر سے کنڈی لگا کر زور وشور سے ماتم کرتے۔ ایک روز اُن کے ماتم کی آواز سن کر اُن کی والدہ گھبرا گئیں مگر جب اُنہیں اس کی وجہ معلوم ہوئی تو ان کی والدہ نے انہیں ڈانٹا اور کہا کہ وہ ماتمیوں کے ساتھ ماتم کیا کریں۔ وہ پھر بھی ایسا نہ کر سکے کیونکہ اُنہیں شرم محسوس ہوتی تھی۔ وزیر آغا اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

> البتہ محرّم سے منسلک بعض دوسری باتوں میں میری شرکت بھرپور ہوتی۔ ایک تو یہ کہ رات کو مٹی کے تیل والے گیس روشن ہوتے۔ ٹڈیاں گھاس کے توتے، پروانے، سانپ کی نانیاں اور قسم قسم کے کیڑے گیس کی روشنی کی طرف کھنچے چلے آتے۔ ہم سب لڑکوں

کے پاس شیشے کی بوتلیں ہوتیں جس میں ہم طرح طرح کے پتنگوں کو پکڑ کر جمع کر لیتے اور پھر دوسرے روز مقابلہ کرتے کہ کس نے زیادہ کیڑے مکوڑے پکڑے۔ ہمارا دوسرا مشغلہ یہ تھا کہ ہم منبر کے پاس حضرت عباس کے علَم کے آگے رکھی چوکی پر، نئے سبیل کے فرش پر جو موم بتیاں جلائی جاتیں، ان کا موم اکٹھا کرتے اور اس کا گولہ سا بنا لیتے، پھر یہ گولہ بڑا ہونے لگتا، دسویں محرم کے بعد ہر لڑکے کے پاس ٹینس کے بال سے لے کر فٹبال تک ہر سائز کے گولے جمع ہو جاتے۔(۷)

وزیر آغا کی مادری زبان پنجابی تھی لیکن گھر میں فارسی بھی بولی جاتی تھی۔اس لیے وہ فارسی بھی جانتے تھے۔اُن کے پردادا ایران سے ہجرت کر کے آئے تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کے والد گھر میں فارسی بولتے تھے اس لیے اُنہیں فارسی زبان سے بھی واقفیت تھی۔انہوں نے فارسی علم و ادب کے مطالعے بھی کیے۔وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

میرے والد اپنی دونوں بڑی بیٹیوں کے ساتھ فارسی میں لیکن میری والدہ کے ساتھ پنجابی میں بات کرتے تھے۔وجہ یہ تھی کہ میری والدہ کو فارسی نہیں آتی تھی۔دراصل میرے نانا جان قزلباش نہیں تھے، سیّد تھے اور لکھنو کے باشندے تھے جہاں سے نقل مکانی کر کے کلکتے چلے گئے، وہیں میری والدہ پیدا ہوئیں۔بعد ازاں اپنے والد کی وفات پر میری والدہ اور خالہ لاہور آ گئیں جہاں وہ اپنے ماموں کے پاس مغل حویلی میں رہنے لگیں۔وہ پنجابی بولتی تھیں اور فارسی سے ناواقف تھیں۔زبان، ماں کے وسیلے سے اولاد تک پہنچتی ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے فارسی کے بجائے پنجابی سیکھی، یہی میری مادری زبان ہے۔(۸)

اس کے علاوہ وہ اردو اور انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے جوانہوں نے اپنی تعلیم کے دوران سیکھیں۔جوانی کے آغاز میں، انہوں نے فارسی بولنا سیکھ لیا تھا مگر جلد ہی فارسی کا شوق کم ہو گیا اور انہوں نے فارسی میں بات چیت کرنی چھوڑ دی جبکہ اُن کے لڑکپن کے زمانے میں اُن کے گھر میں دو زبانیں (پنجابی اور

فارسی) بہت زیادہ بولی جاتی تھیں۔

وزیر آغا کو ابتدائی تعلیم کے لیے وزیر کوٹ کے پرائمری سکول میں داخل کروادیا گیا۔اُن کی زندگی میں ۱۹۳۲ء کا سال ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سال لاہور سے دو سیّد بھائی، ایک طویل عرصے کے لیے اُن کے گاؤں میں آکر رہے۔دونوں صاحبان نہایت خوش گفتار تھے۔اُن دونوں نے اُن کے گھریلو معاملات میں بہت دخل اندازی دی اور اُن کے اتحاد کے ساتھ رہتے کنبے میں انتشار پھیلا دیا۔جب وزیر آغا کے والد صاحب نے یہ سب ہوتے دیکھا تو انہوں نے ان میں سے بڑے شاہ صاحب کو وزیر کوٹ سے تقریباً سات میل دور سکھوں کے ایک گاؤں چک ۳۴ جنوبی کے مڈل سکول میں ٹیچر لگوا دیا۔یوں بڑے بھائی کے ساتھ چھوٹا بھائی بھی وہیں اُس سکول کے ہاسٹل میں منتقل ہو گیا۔ویسے تو اُن دونوں نے جو بھی کیا اچھا نہ کیا لیکن وہ دونوں بہت علم والے تھے۔اُنہوں نے وزیر آغا کے والد سے کہا کہ وہ اُسے اُن کے سکول میں داخل کروادیں کیونکہ وزیر کوٹ کا ماحول اور سکول کی پڑھائی کی فضا کوئی زیادہ سازگار نہیں ہے۔وزیر آغا کی والدہ تو نہ مانیں لیکن والد صاحب نے انہیں گاؤں کے سکول سے نکلوا کر چک ۳۴ جنوبی کے اس مڈل سکول میں داخل کروادیا اور چند ہی روز میں، وزیر آغا چک ۳۴ جنوبی کے سکول کے ہاسٹل میں منتقل ہو گئے۔اُن میں سے بڑے شاہ صاحب کو ادب سے لگاؤ تھا۔وہ غزل گوئی میں کافی ملکہ رکھتے تھے۔وزیر آغا بڑے شاہ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> شاہ صاحب نے مجھے غزلیں اور نظمیں حفظ کرانا شروع کر دیں۔علاوہ ازیں وہ مجھ سے میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے پڑھواتے اور مجالس میں مرثیے پڑھنے کی مشق کراتے۔اس سے مجھے دو فائدے ہوئے ایک تو میں شعری آہنگ کو پہچاننے لگا اور اس بات نے مجھے آگے چل کر شعر کہنے کی ترغیب دی۔دوسرے مجالس میں مرثیہ پڑھنے سے میری فطری جھجک بھی کم ہوئی جس نے مجھے اپنی ذات سے باہر آنے کی اجازت نہ دی تھی۔(۹)

وزیر آغا نے بارہ سال کی عمر میں شعر گوئی شروع کر دی۔انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> وزیر آغا کی شعری تربیت میں ان رثائی مجالس کا عمل دخل بہت زیادہ ہے جو ان کے بچپن میں عشرۂ محرم میں ان کے گاؤں وزیر کوٹ میں منعقد ہوتی تھیں اور جن میں میر انیس اور میر زا دبیر کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔آغا صاحب نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ بارہ چودہ سال کی

عمر میں یہ مرثیے انہوں نے اتنی مرتبہ سنے اور پڑھے تھے کہ انھیں حفظ ہو گئے تھے۔(۱۰)

انور سدید نے وزیر آغا کی شعری تربیت میں رثائی مجالس کا کردار بیان کیا جبکہ انہوں نے خود ایک انٹرویو میں کہا:

> میری اَدبی تربیت میں زیادہ حصہ میرے ماحول کا تھا۔ ہمارے ہاں مجالس منعقد ہوتیں۔ اُن میں مجھ سے میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے سنے جاتے۔ اُس وقت میری عمر بمشکل بارہ برس ہوگی۔ بار بار پڑھنے سے مجھے یہ مرثیے حفظ ہو گئے۔ یوں میری شعر گوئی کی بنیاد مستحکم ہوئی کیونکہ شاعری کے وِرد ہو سے شعر کی موسیقیت کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ ویسے سکول میں بھی اساتذہ اس بات کا خاص اہتمام کرتے کہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ اشعار یاد کرائے جائیں، اب یہ روایت ختم ہو گئی ہے۔(۱۱)

وہ چک ۳۴ جنوبی کے مڈل سکول کے ایک ہونہار طالب علم تھے لیکن حساب کے مضمون میں کافی کمزور تھے۔ اِس سکول سے انہوں نے ایک ہی سال میں ششم اور ہفتم پاس کیں۔ جب انہوں نے ساتویں جماعت پاس کر لی اور آٹھویں میں داخل ہوئے تو اِسی اثناء میں ان دونوں شاہ صاحبان کا تبادلہ وزیر کوٹ سے تقریباً بیس میل دور سلاں والی ہائی سکول میں ہو گیا۔ یوں وزیر آغا کو بھی ان شاہ صاحبان کے ساتھ سلاں والی سکول جانا پڑا۔ اُس دَور میں سلاں والی ایک بالکل چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس کی وجہ شہرت اناج کی منڈی تھی جس پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ وزیر آغا کے لیے گاؤں سے قصبے میں آنا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ ایک تو اس لیے کہ وہاں آپ کو مختلف قسم کے لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملا، دوسرا اس لیے کہ ہندوؤں کا قصبہ ہونے کی وجہ سے وہاں ہندوؤں کے تیوہار بڑے زور وشور سے منائے جاتے تھے بالخصوص رام لیلا کے ڈرامے نیز بیل گاڑیوں پر نکالے گئے جلوس وغیرہ۔ وہاں آ کر اُن دونوں شاہ صاحبان کی شادیاں ہو گئیں اور وہ اپنی اپنی زندگی میں محو ہو گئے اور وزیر آغا وہاں تنہائی کا شکار ہو گئے۔ وزیر آغا کا قیام سلاں والی میں کم وبیش ایک سال پر محیط رہا۔

نویں جماعت کے داخلے کے لیے اُنہیں ساہیوال اپنے چچا آغا برکت علی خان کے پاس بھیج دیا گیا جو وہاں وکیل تھے۔ اُن کے چچا نے انہیں گورنمنٹ سکول کی بجائے ایک ہندو سکول میں داخل کروا دیا اور انہیں سائنس مضامین رکھوا دیئے حالانکہ انہیں سائنس میں بالکل دلچسپی نہ تھی اور یوں اُن کی ضِد کی وجہ سے انہیں آرٹس رکھوا دی گئی۔ انہوں نے آرٹس رکھنے کے بعد بہت ذوق وشوق سے پڑھائی کی۔ وہاں سکول میں انہیں

ایک اچھے استاد پنڈت جی میسر آئے ۔انہوں نے بلا کا حافظہ پایا تھا ،سینکڑوں اردو اشعار انہیں زبانی یاد تھے۔وزیر آغا کو چونکہ شعر پڑھنے کی تربیت پہلے سے حاصل تھی اس لیے جلد ہی وہ پنڈت جی کے پسندیدہ شاگرد بننے کے باعث اردو کلاس کے مانیٹر بن گئے۔انہیں جس سیکشن میں داخل کیا گیا وہاں اُن کے علاوہ صرف دو اور مسلمان لڑکے تھے اس لیے اُن تینوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے باقی طلباء نے شودر کا درجہ دے رکھا تھا۔

حالات کے پیش نظر وزیر آغا کو ساہیوال سے نویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد دوبارہ سرگودھا بلوالیا گیا اور یوں ۱۹۳۷ء میں انہوں نے سرگودھا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔میٹرک کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے گاؤں وزیر کوٹ آ گئے ۔وہاں وہ اپنے بچپن کے دوستوں سے ملے ۔اب انہوں نے اپنے اور ان کے درمیان ایک واضح فرق محسوس کیا کیونکہ وہ پڑھ لکھ نہ سکے جبکہ وہ میٹرک پاس کر چکے تھے۔وزیر آغا کے میٹرک کرنے تک گھر کے معاشی حالات خراب ہی رہے۔گھر میں تنگدستی کا یہ عالَم تھا کہ گھر کا کوئی زیور مہاجن کے پاس یا تو رہن رکھا جاتا تھا یا اسے بیچ کر زمین کا مالیہ ادا کیا جاتا تھا۔سال میں دو دفعہ عیدین کے موقع پر بچوں کو سوٹ سلوا کر دیئے جاتے اور بچے عید کی خوشی مناتے اور پھر سارا سال انہی کپڑوں سے کام چلاتے تھے۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اُنہیں گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخل کروا دیا گیا۔وہاں پہلے سال وہ اپنے ایک عزیز کے ہاں مقیم رہے اور دوسرا سال وہ کالج کے ہاسٹل میں رہے۔وہ جس عزیز کے ہاں رہے، وہ مگھیانہ شہر کے کوتوال تھے۔اُن کا تبادلہ کسی دوسری جگہ ہوا تو مجبوراً انہیں ہاسٹل منتقل ہونا پڑا۔جلد ہی وزیر آغا کالج کے ہونہار طلباء میں شمار ہونے لگے۔ڈاکٹر عبدالسلام (جنہیں بعد میں نوبل انعام ملا) بھی اسی دور میں جھنگ کالج میں پڑھتے تھے۔وزیر آغا گورنمنٹ کالج جھنگ کے میگزین کے مدیر رہے۔ڈاکٹر عبدالسلام کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ انہوں نے کالج کے میگزین میں شامل کیا تھا۔اس کالج میں انہیں دو اساتذہ معراج الدین اور ضیاء الحق کی شاگردی نصیب ہوئی جنہوں نے اُن کی اَدَبی تربیت کی۔انہوں نے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کالج بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور اس بناء پر اُنہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل کروا دیا گیا۔وزیر آغا کالج کے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''یہ اُن دنوں کی بات ہے جب دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے میں ابھی دو سال باقی تھے۔میں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔سر سے اونی ٹوپی اتار کر سولا ہیٹ پہن لیا تھا۔گلے میں نکٹائی آ گئی تھی اور پانچ گز کے گھیر دار پائجامے کی جگہ پائنچوں والی پتلون نے لے لی تھی۔'' (۱۲) کالج کے دَور میں اُن کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے۔وہ اپنے والدین سے ہر چیز کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ماں کے پاس بیٹھ کر صدیوں پرانی رسوم، تہواروں اور رواجوں پر

بھی نکتہ چینی کرتے اور پوچھتے کہ آخر یہ سب کچھ کیوں اتنا ضروری ہے۔اس کے علاوہ وہ اخلاقیات کے سارے نظام کے بارے میں سوالات کرتے۔اُن کی ماں اُن کے سوالات کا جواب تو کیا دیتیں بس دعائیں دینے لگتیں۔پھر کیا ہوا کہ اُن کے سوالات کا محور ہی تبدیل ہوگیا۔وہ پہلے بھی کئی بار اپنے ابّا کو بڑ کے درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھے گول مٹول باوا قسم کے لوگوں سے باتیں کرتے دیکھ چکے تھے،مگر انہوں نے کبھی ان کی باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔اُن کے والد ہر آنے والے سے اُس کی زبان میں بات کرتے۔بہت سی باتیں وزیر آغا کے فہم سے بالا تھیں۔اُن کے والد اپنی باتوں میں ذکر،مقام،طریق،وجد،ابن عربی،مولانا روم،عین الیقین اور حق الیقین اور اس قسم کے مشکل الفاظ فراوانی سے استعمال کیا کرتے تھے۔انہوں نے ایک روز اپنے والد سے سوال کیا کہ:

> بابا آپ اکثر لوگوں سے نروان کے بارے میں بات کرتے ہیں،یہ نروان کیا ہوتا ہے؟بابا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا بیٹا کہ نروان میں ''نر'' سے مراد ''بغیر'' اور ''وان'' کا مطلب ہے ''ہوا'' یعنی بغیر ہوا کے۔پھر کہنے لگے کہ کبھی تم نے تالاب کو دیکھا ہے جب ہوا چل رہی ہو اور اس کی سطح پر لہریں ہی لہریں پیدا ہوگئی ہوں۔اس وقت نہ تو اردگرد کے ماحول کا عکس ہی تالاب میں نظر آتا ہے اور نہ ہی تالاب کی تہہ میں پڑی ہوئی کوئی چیز ہی دکھائی دیتی ہے لیکن جب ہوا تھم جائے تو باہر کی ساری دنیا اس میں نظر آنے لگتی ہے اور خود اس کی تہہ بھی اُبھر کر سطح پر آجاتی ہے بس یہی حال انسان کا ہے جب تک وہ خواہشات کی زد میں رہے گا اسے نہ تو باہر کا کوئی علم ہوگا اور نہ ہی اندر کی کائنات ہی اس پر منکشف ہو سکے گی۔خواہشات کی آندھی رک جائے تو سمجھ بینائی مل گئی،نروان حاصل ہوگیا۔(۱۳)

انہوں نے اپنے والد صاحب کی یہ باتیں ایسی اپنے پلّے باندھیں کہ آپ کی زندگی بالکل بدل گئی۔اُنہوں نے اپنی خواہشات کو قابو میں کرنے کی دل میں ٹھان لی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے گوشت کھانا ترک کر دیا کیوں کہ گوشت جذبات کو بھڑکاتا ہے بلکہ انہوں نے تو کھانا پینا بھی اتنا کم کر دیا تھا کہ چند ہی دنوں میں اُن کا جسم سوکھ کر ڈھانچہ سا بن کر رہ گیا۔اُنہوں نے کانوں کو سماعت سے،زبان کو ذائقہ سے اور آنکھوں کو رنگ سے الگ کرنا شروع کر دیا۔وہ گھنٹوں مراقبے کی حالت میں رہنے لگے۔اُن کو زندگی میں بالکل بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔اُن کو

ہر چیز بیکار، بے معنی اور لاحاصل نظر آتی۔ چاروں طرف ایک تھکا دینے والی تکرار کا احساس ہوتا۔ یوں گویا وہ نروان کے نام پر دراصل موت کو اپنی طرف بلانے لگے۔

۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور (جو کہ پنجاب یونیورسٹی سے منسلک تھا) میں داخل ہوئے۔ اُس دَور میں یہ ادارہ دنیا کے اچھے اداروں میں شمار ہوتا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے بارے میں اس دور میں کہا جاتا تھا کہ یہ نہر سویز کے مشرق میں واقع دنیا کا بہترین تعلیمی ادارہ ہے۔ انہوں نے اُس دَور میں شاعری شروع کر دی۔ اُنہیں اپنی شاعری سے بہت محبت تھی۔ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے بی اے اور ۱۹۴۳ء میں اسی کالج سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ اس زمانے میں تقدیر کے نا منصفانہ طریق کار، معاشرتی استحصال اور معاشرتی عدم توازن نے آپ پر بہت اثرات مرتب کئے۔ صدیوں کی غلامانہ جکڑن نے اُن کے ذہن میں سوالات پیدا کئے۔ وہ فکری مراحل اور مدارج کے ایسے دَور سے گزر رہے تھے جس میں ایک طرف تو وہ تشکیک کی لہر کی زَد میں تھے، دوسری طرف اُن کا رُجحان تصوّف کے مطالعہ کی طرف بھی تھا۔ اُس دَور میں بھی اُن کے گھریلو معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ کالج ہاسٹل کے اخراجات بچانے کے لیے اُن کے والد نے اُنہیں اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں بھیج دیا جو لاہور میں موچی دروازے کے امام باڑہ رضا شاہ میں مقیم تھے۔ اُنہیں کالج فیس کے علاوہ دس روپے جیب خرچ کے لیے ملتے تھے۔ وہ جب اپنی معاشی بدحالی کا موازنہ اپنے کالج کے طلباء سے کرتے تو احساس کمتری کا شکار ہو جاتے۔ اُن کے اکثر ہم جماعت قیمتی لباس پہنتے، مہنگے سگریٹ پیتے اور کچھ کے پاس تو اپنی کاریں بھی تھیں۔

ایم اے کرنے کے بعد اُن کے والد آغا وسعت علی نے اُنہیں فوج میں لیفٹیننٹ بھرتی کرانے کی کوشش کی تو وزیر آغا نے یہ ملازمت کرنے سے انکار کر دیا جس میں آپ کی والدہ نے بھی تائید کی۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں: ''والد انہیں فوج میں لیفٹیننٹ بنانا چاہتے تھے لیکن وزیر آغا کو انگریزوں کی نوکری پسند نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے گھوڑوں کا آبائی کاروبار شروع کیا۔'' (۱۴) اُس دَور میں دوسری جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی۔ چاروں اطراف انگریزوں سے نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ اُنہیں سیاست سے کوئی لگاؤ نہ تھا لیکن ملکی و عالمی خبروں سے وہ اخبارات کے ذریعے آگاہ رہتے تھے۔ اس وقت وزیر آغا کو ہٹلر کے اصل کردار کا کوئی علم نہ تھا لیکن وہ اُن کے دشمن کا دشمن تھا اس لیے اُنہیں اُس سے ہمدردی اور اُس کی فتوحات سے دلچسپی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ کامیاب ہو گیا تو برِّ صغیر کو خود بخود آزادی مل جائے گی۔

فوج میں بھرتی نہ ہونے پر اُن کے والد نے اُنہیں گھوڑوں کے کاروبار میں لگانا چاہا۔ ان دنوں بمبئی اور پُونا گھوڑوں کے کاروباری مراکز تھے۔ بمبئی میں گھڑ دوڑ بہت مقبول تھی محض اس لیے نہیں کہ یہ ایک

پُر لطف کھیل تھا، اس لیے بھی کہ یہ ایک منافع بخش کاروبار بھی تھا۔ پونے میں گھوڑوں کے بڑے بڑے اصطبل تھے۔ چنانچہ اُن کے والد نے اُنہیں تین سو روپے دیئے اور مطالعاتی دَورے پر بمبئی اور پونا بھیج دیا۔ وہ پہلے بمبئی گئے، وہاں سے اُنہوں نے بہت کچھ سیکھا اور پھر وہاں سے پونا روانہ ہوئے جہاں اُنہوں نے ایک ہفتہ قیام کیا۔ وہاں اُنہوں نے بہت سے ہارس سٹڈ دیکھے اور گھوڑوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔ اِس سفر کے دوران وہ قدرتی وفطرتی مناظر سے بہت لطف اندوز ہوئے بلکہ اُن کے حُسن کو محسوس کیا۔ تمام نظارے اُن کے اندر اُتر گئے۔ شاعری کی طرف وہ پہلے ہی سے مائل تھے بلکہ اس دَور میں تو اُنہوں نے باقاعدہ طور پر مختلف شعراء کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ وزیر آغا گھوڑوں کے بارے میں قیمتی معلومات لے کر واپس آئے لیکن اس سفر میں وہ فطرت سے موانست کے نئے خواب دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے گھوڑوں کا کاروباری بننے کے بجائے زمین سے محبت پیدا کی اور کاشتکاری اختیار کر لی اور پھر اُس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی دنیا میں بھی قدم رکھا اور اردو ادب کی زندگی بھر خدمت اور ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی وزیر آغا کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ''تمام تر مناسب مواقع میسر آنے کے باوجود سرکاری ملازمت کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنی صلاحیتوں کو ادب کے لیے وقف کر دیا۔'' (۱۵) اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وزیر آغا نے ادب کی خاطر دیگر کئی پیشے ٹھکرا دیئے، جس سے وزیر آغا کی ادب سے محبت اور عقیدت ثابت ہو جاتی ہے۔ ارمان نجمی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> اُن کی قوت ارادی اور اہم موقعوں پر قوّتِ فیصلہ کے متعلق دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ ایک تو فوج میں لیفٹیننٹ (کی حیثیت سے) ملازمت سے انکار۔ دوسری مثال: گھوڑوں کی تجارت سے دست برداری کا حتمی فیصلہ۔ غور کیجئے، اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی کام ہاتھ میں لے لیتے تو زبان اور ادب کا کتنا بھاری نقصان ہوتا۔ (۱۶)

ایم اے کرنے کے بعد وزیر آغا دوبارہ اپنے گاؤں وزیر کوٹ آ گئے۔ وہاں آ کر انہوں نے فن گھڑ سواری سیکھا۔ انہوں نے شروع میں کاشتکاری کو ذریعہ رُوزگار بنایا۔ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے اردو شاعری کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ انہوں نے ایم اے کرنے کے بعد چھ سال سیاحت کی۔ سیاحت کے دَور میں اُن کی ملاقات دو ایسی شخصیات سے ہوئی جنہوں نے اُن کی رہنمائی کی۔ ان میں ایک شمس آغا اور دوسری شخصیت مولانا صلاح الدین احمد کی تھی۔ مولانا صلاح الدین احمد پرانی وضع کے اُن بزرگوں میں سے تھے جو جوہر شناسی کی اہلیت میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ مولانا ادب اور ادیب کے معاملے میں حد درجہ بالغ نظر اور نکتہ رس واقع ہوئے

تھے۔ شفیع ہمدم لکھتے ہیں: ''مولانا کسی کا دل توڑنا نہیں جانتے تھے، چنانچہ اکثر و بیشتر دوسروں کی خوشنودی پر اپنی مسرّت، آرام اور فراغت کو قربان کر دیتے تھے۔'' (۱۷) شفیع ہمدم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صلاح الدین ایک خوش اخلاق اور نرم دل انسان تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مولانا صلاح الدین نے گو بہت لکھا لیکن کبھی صاحبِ کتاب بننے کا نہیں سوچا۔ سوان کی وفات کے بعد ''تصوّرات اقبال''، ''محمد حسین آزاد'' اور ''اردو کا افسانوی ادب'' کے نام سے ان کے بکھرے مقالات جمع کیے گئے۔ ان تینوں کتابوں کے مطالعہ سے ان کی تنقیدی آراء کی گہرائی کے مقابلہ میں ان کا منفرد اسلوب زیادہ متاثر کرتا ہے۔ وہ تنقید میں اسلوب کی حد تک محمد حسین آزاد کی روایات کے پیرو قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ وہ صاحب طرز ادیب تھے اور ایک ایک سطر اس کی مظہر ہے۔ (۱۸)

مولانا صلاح الدین نے اردو زبان کے دفاع کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ دفاعِ اردو زبان کے لیے انہوں نے ہر قسم کی قربانی پیش کی۔ انہوں نے ہندی کے مقابلے میں اردو زبان کے فروغ کے لیے ''اردو بولو تحریک'' شروع کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے وسائل سے ''اکادمی پنجاب'' کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں انہیں وزیر آغا کے ساتھ ساتھ سید وحید الدین، اے ڈی اظہر وغیرہ کا ساتھ میسر آیا۔

مولانا ''ادبی دنیا'' کے نام سے ایک مجلّہ نکالتے تھے۔ شمس آغا (وزیر آغا کا بھانجا) مولانا کے مجلّے میں افسانے شائع ہوئے۔ شمس آغا کے توسّط سے وزیر آغا کی مولانا صلاح الدین سے ملاقات ہوئی۔ وزیر آغا نے اپنا اَدبی سفر اُنکے ہی مجلّہ کے ''شریک مدیر'' کی حیثیت سے شروع کیا حالانکہ اس سے قبل وہ نسیم شمائل پوری کے ساتھ مل کر ایک ماہنامہ جاری کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے اور انور گوئندی کے مجلّے ''کامران'' میں قلمی معاونت بھی کر چکے تھے لیکن اس کے باوجود اُن دو کوششوں کو وزیر آغا کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اُن کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ''ادبی دنیا'' کے شریک مدیر کے طور پر ہوتا ہے جس میں انھوں نے اردو ادب کے میدان میں نت نئے تجربوں اور نئے تناظر کو پھیلانے کی کوشش کی۔ ''ادبی دنیا'' نے قدیم سے اپنا رشتہ توڑے بغیر جدید کی طرف پیش قدمی کی۔ مولانا صلاح الدین نے وزیر آغا کو شاعری کے حصے کی ادارت سونپ دی تھی۔ مولانا صلاح الدین کے اس دَور کے رفقاء منصور احمد، میراجی اور وزیر آغا نے ان کی روایات کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں کئی نئے اور جاندار تجربوں کے ساتھ آگے بھی بڑھایا۔

وزیر آغا نے میرا جی، ن م راشد، اختر الایمان، فیض احمد فیض، قیوم نظر، یوسف ظفر، راجہ مہدی علی خاں، مجید امجد اور چند دیگر شعراء پر مضامین لکھے۔ اُنہوں نے ''ادبی دنیا'' کو نئے رنگ اور آہنگ سے ترتیب دیا اور بہت جلد اسے ایک خاص مجلّہ بنا دیا۔ تقسیمِ ہند کے دوران مولانا کا دفتر اور اس میں موجود بہت سا مواد ہنگاموں کی وجہ سے جل گیا تھا جس کی وجہ سے مولانا کا دل اچاٹ ہو چکا تھا لیکن وزیر آغا کے اِصرار پر مولانا نے دوبارہ دفتر کو اور اپنے ادبی مجلّہ ''ادبی دنیا'' کو چلانے کا فیصلہ کیا۔ یوں دسمبر ۱۹۴۸ء میں ادبی دنیا کے نئے دَور کا آغاز ہوا۔

مجلّہ ''ادبی دنیا'' فکشن کے معاملے میں جدیدیت پسند مگر شاعری کے معاملے میں ایک حد تک پرانے انداز کا رسیا تھا۔ وزیر آغا کو ''ادبی دنیا'' کے رویّے میں تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے یہ تبدیلی تین سطحوں پر لانے کی کوشش کی۔ ایک تو انہوں نے بزرگ شعراء سے قطع تعلق کیے بغیر، نئے شعراء سے رابطہ استوار کیا اور بہت سے نئے شاعروں کو (جو آج اردو شاعری میں معتبر نام ہیں) ''ادبی دنیا'' میں متعارف کرایا۔ دوسرا وزیر آغا نے جدید نظم کے بارے میں بطور خاص خود بھی مقالات لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے اور رسالے کے کالم ''بزم ادب'' میں شاعری کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا آغاز کر دیا۔ تیسرا اُنہوں نے عملی تنقید کا ایک ایسا نیا سلسلہ شروع کیا جس کی اردو ادب کی تاریخ میں اس سے قبل کوئی مثال موجود نہیں تھی، یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا اور بہت سے دیگر رسائل نے بھی نظم کے اس تجزیاتی مطالعے کی پیروی شروع کر دی۔ اُن کا طریقۂ کار یہ تھا کہ کسی جدید نظم گو شاعر کی نظم شاعر کا نام ظاہر کیے بغیر کچھ شعراء کو بھیج دیا کرتے اور اُن سے نظم کے بارے میں تاثرات وصول کر کے انہیں مرتّب صورت میں شائع کر دیتے۔ دراصل یہ سب حلقۂ اربابِ ذوق کی تنقید کے متوازی ایک اقدام تھا۔ وزیر آغا ثابت کرنا چاہتے تھے کہ حلقے کی تنقید، تخلیق کار کی شخصیت کی نسبت سے مثبت یا منفی رویہ اختیار کرتی ہے لیکن تخلیق کار کا نام معلوم نہ ہو تو پھر تنقید کا مزاج اور رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ نظم کے تجزیاتی مطالعوں کے اس تجربے میں بہت سی دلچسپ صورتیں سامنے آئیں۔ ایک صاحب نے اپنے ایک دشمن کی نظم کی بہت زیادہ تعریف کر دی اور ایک صاحب نے اپنے ایک گہرے دوست پر سخت تنقید کر دی۔ جب اُن کو بعد میں نظموں کے خالق کا نام معلوم ہوا تو بہت شرمندہ ہوئے۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ادیب کی شخصیت کی بجائے اس کی تخلیقات کا جائزہ لینے کی طرف راغب ہونے لگے۔ وزیر آغا ۱۹۶۱ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک مجلّہ ''ادبی دنیا'' لاہور کے شریک مدیر رہے۔ ڈاکٹر محمود احمد اسیر لکھتے ہیں: ''ادبی دنیا کا پانچواں دور ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا تو ڈاکٹر وزیر آغا ادبی دنیا کے شریک مدیر اور حصہ نظم کے نگران مقرر ہوئے۔'' (۱۹) اس بیان سے معلوم ہوا کہ وزیر آغا کو مولانا صلاح الدین احمد نے ''ادبی دنیا'' کی

اہم ذمہ داری سونپی۔ وزیر آغا نے ایک انٹرویو میں کہا: ''۱۹۶۱ء میں مولانا نے جب ادبی دنیا کو نئے روپ میں شائع کرنا شروع کیا تو مجھے اپنا شریک مدیر بنالیا۔ صحیح معنوں میں ادب کے میدان میں میری آمد اس واقعے کے بعد سے ہوئی۔'' (۲۰) ۱۴ جون ۱۹۶۴ء کو مولانا صلاح الدین احمد انتقال کر گئے جس کی وجہ سے وزیر آغا نے ''ادبی دنیا'' کو خیر باد کہا۔ وزیر آغا اسی انٹرویو میں ایوب جوہر کو مزید کہتے ہیں کہ ''ادبی دنیا'' غالباً ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ جاری ہوا تھا۔ مولانا نے یہ پرچہ اپنے دوست منصور احمد کے لیے خریدا تھا جن کی وفات کے بعد وہ خود اسے مدوّن کرنے لگے۔ اُن کی وفات کے بعد ''ادبی دنیا'' چند سال تک جاری رہا مگر میں بوجوہ اس سے الگ ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے اپنا پرچہ ''اوراق'' نکالا جو ''مولانا صلاح الدین کی یاد میں'' تھا۔

شمس آغا وزیر آغا کے بھانجے تھے۔ وزیر آغا شمس آغا سے بے حد محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ شمس آغا ایک سمجھدار اور ذہین ادیب تھا۔ اُسے اُردو اَدب سے گہرا لگاؤ تھا۔ شمس آغا کی افسانوں پر مشتمل کتاب کا نام ''اندھیرے میں جگنو'' ہے۔ شمس آغا اپنی زندگی سے تنگ تھا کیونکہ وہ کائنات کے راز کو جان چکا تھا۔ اچانک ۳ دسمبر ۱۹۴۵ء کو شمس آغا پراسرار طور پہ غائب ہو گیا اور اس کے بعد وزیر آغا کو پوری زندگی اس کی خبر نہ ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا شمس آغا کے اچانک غائب ہونے پر عجیب نا امیدی کی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔ شفیع ہمدم نے وزیر آغا کے شمس آغا پر لکھے ہوئے ایک مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''غربت اور افلاس کی پچھل پائیاں عمر بھر اس کا پیچھا کرتی رہیں جن سے وہ شدید جدوجہد کے باوجود پیچھا نہ چھڑا سکا۔'' (۲۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس آغا کے معاشی حالات ابتر تھے جس کی وجہ سے وہ غربت بھری زندگی گزارتا رہا۔ شفیع ہمدم مزید لکھتے ہیں:

> شمس آغا نے کئی خوبصورت افسانے تحریر کیے جنہیں مولانا صلاح الدین احمد نے بہت پسند کیا اور ادبی دنیا میں شائع کیا لیکن اس کی ساری ذہانت غربت اور افلاس کے ڈھیر تلے دب کر رہ گئی۔ وہ تواتر سے افسانے لکھتا رہتا تو اُس کا شمار اردو ادب کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا مگر مصائب و آلام نے اسے اتنی فرصت ہی نہ دی۔ (۲۲)

یعنی شمس آغا ایک اچھا افسانہ نگار تھا لیکن حالات کے پیشِ نظر وہ زیادہ افسانے نہ لکھ سکا۔ اس کی غربت نے اردو ادب سے ایک اچھا افسانہ نگار چھین لیا۔ وزیر آغا نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ: ''شمس آغا میرے ساتھ دو سال تک رہا، اس کے بعد آج تک اس کا کوئی اَتا پتا نہیں چل سکا۔ شمس آغا کے اچانک غائب ہونے سے میرا دل بھی

زندگی سے اچاٹ ہوگیا۔'' (۲۳) وزیرآغا کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیرآغا کی شمس آغا سے نہ صرف دوستی تھی بلکہ وہ شمس آغا سے دلی محبت اور عقیدت بھی رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ شمس آغا کے اچانک غائب ہوجانے سے وزیرآغا بھی زندگی سے مایوس ہوگئے۔ وزیرآغا نے ایک انٹرویو کے دوران مزید کہا:

> میرا ایک ہم عمر بھانجا شمس آغا، افسانے لکھتا تھا جو'' ادبی دنیا'' میں چھپتے تھے۔ وہ دو برس ہمارے ہاں گاؤں میں رہا اور اس دوران میں اُس نے متعدّد شاہکار افسانے لکھے جن کی پورے برصغیر میں دھوم مچ گئی مگر وہ تئیس برس کی عمر میں اچانک غائب ہوگیا، اس کے بعد آج تک اس کا کچھ پتا نہیں۔ (۲۴)

۱۹۴۶ء میں وزیرآغا دوبارہ ناامیدی سے امید کی طرف لوٹے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دوران اُنہوں نے قرآن کے تراجم پڑھے اور اس کے علاوہ انہوں نے عہد نامہ قدیم کی کتابیں پڑھیں۔ اِنہی دِنوں مولانا صلاح الدّین نے انہیں نفسیات کا مطالعہ کرنے کو کہا۔ یوں انہوں نے مولانا کے کہنے پر نفسیات کے مضمون کو پڑھا۔ انہوں نے فرائڈ کا مطالعہ کیا جس کا اس دَور میں علم نفسیات میں چرچا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے نفسیات کے موضوع پر کئی مضامین لکھ ڈالے۔ اُن کے مضامین ''شباب تسلسل اور خودکشی''، ''لذت اور صوفیانہ تصورات''، ''قانون اور اس کا پس منظر'' اور ''میری پسندیدہ نظمیں'' شامل تھے جو کہ انہوں نے نصیرآغا کے قلمی نام سے لکھے تھے۔ نصرت آرا نصرت کے نام سے نظمیں بھی شائع کروائی تھیں۔ گو مولانا صلاح الدین نے انہیں مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے نکالا اور اُن کی زندگی میں امید کی شمع روشن کی۔

ڈاکٹر وزیرآغا نے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی کے ادبی جریدہ ''ساقی'' میں نصرت آرا نصرت اور نصیرآغا کے فرضی ناموں سے لکھنا شروع کیا۔ مدیر کے تصویر مانگنے پر نصرت آرا نصرت کا فرضی نام ختم ہوگیا۔ انہوں نے مجلّہ ''ساقی'' میں اپنی نظمیں چھپوائیں۔ اُن کی اس دَور کی ایک نظم ''دھرتی کی آواز'' نے اہل نظر کو چونکا دیا۔ حلقۂ ارباب ذوق کی ۱۹۴۶ء کی بہترین نظموں میں یہ نظم بھی منتخب ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کی وجہ سے یہ سال اُن کے لئے کافی مشکل رہا۔ تقسیم ہند کے واقعے نے دیگر کئی ادبا کی طرح وزیرآغا پر بھی گہرے اثرات مرتّب کئے، ملکی حالات کافی خراب رہے۔ تقسیم کے دنوں میں قتل وغارت کا بازار گرم رہا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ:

> میرے لیے ۱۹۴۷ء کا آخری حصہ ایک انتہائی کرب ناک زمانہ تھا، گو

اس کرب کا تعلق میرے شخصی غم سے کم اور ملکی صورت حال اور اس کے
نتیجے میں ہونے والے فسادات سے زیادہ تھا یا شاید یوں تھا کہ میرا
شخصی سطح کا احساس زیاں، اجتماعی احساس زیاں سے ہم آہنگ ہو کر
ایک کرب ناک صورت حال میں تبدیل ہو گیا تھا۔ (۲۵)

۱۹۴۸ء میں وہ دوبارہ سنبھلے اور انہوں نے اب ''ادبی دنیا'' میں اپنے اصل نام کے ساتھ مضامین چھپوانے کا ارادہ کیا۔ اُن پر کائنات اور زندگی کے بے پناہ حسن کا ایک سہانا احساس چھا گیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ: ''میں طلوع آفتاب کے منظر دیکھنے کے لیے سحر خیزی میں مبتلا ہوا اور پھر ہر شام نہر کنارے غروب آفتاب کے دل کش مناظر میں کھو جاتا۔ پہلے مجھے سب کچھ بے معنی نظر آتا تھا لیکن اب ہر شے معنی سے لبریز تھی۔ نئے نئے مفاہیم کی ایک پوری دنیا وجود میں آ گئی تھی۔'' (۲۶) اُن دنوں انہوں نے ''محبت کا تدریجی ارتقاء'' کے نام سے ایک مضمون لکھا جسے مولانا صلاح الدین پڑھ کر انتہائی خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے بھانجے کی جدائی میں اُس کے بارے میں ایک مضمون ''ٹوٹا ہوا تارہ'' ۱۹۴۸ء میں لکھا جو ۱۹۴۹ء میں ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔

وزیر آغا خاندان کے واحد ایم اے پاس فرد تھے اس لئے سب کی خواہش تھی کہ شادی کسی امیر گھرانے میں ہو لیکن انہوں نے ایک غریب گھرانے میں شادی کرنے کو اس لیے ترجیح دی کہ وہ اس گھرانے کو اخلاقی طور پر اچھا سمجھتے تھے۔ ۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء/۱۹ جمادی الثانی ۱۳۶۸ھ بروز سوموار کو وزیر آغا رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ بارات نے وزیر کوٹ کی گلیوں میں ایک کونے سے دوسرے کونے کا سفر کیا اور دلہن اُن کے گھر آ گئی۔ شادی کے بندھن کے نتیجے میں آپ کی کتاب ''مسرّت کی تلاش'' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا دیباچہ مولانا صلاح الدین کے بڑے بیٹے وجیہ الدین احمد نے لکھا۔ یہ اُن کی پہلی باقاعدہ کتاب تھی۔ ان کی بیوی کا نام صفیہ آغا تھا جو ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کے سسر کا نام انور علی تھا۔ یہ وہی انور علی ہیں جن کے گھر وزیر آغا گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم کے حصول کے دوران قیام پذیر رہے تھے۔ وزیر آغا شادی کے بعد کافی سنبھل گئے۔ اُن کی اہلیہ بہت صفائی پسند خاتون تھیں۔ وہ گھر کو ہر وقت صاف ستھرا رکھتی تھی۔ جس سے متاثر ہو کر وزیر آغا نے اپنے گاؤں کی صفائی کی طرف توجّہ دی۔ اُس دَور میں وزیر آغا کا رجحان زراعت کی طرف بھی کافی رہا۔ اپنے گاؤں کو سنوارا اور کسانوں میں مقابلے کا رُجحان پیدا کیا۔ انہوں نے گاؤں میں بہتری لانے کے لیے تین طرح کے انعامات کا اعلان کیا۔ پہلا انعام زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے والے کے لیے تھا، دوسرا انعام اُس کے لیے تھا جس کے بیل دوسروں سے زیادہ صحت مند ہوں اور تیسرا انعام اس کے لیے تھا جس

کا گھر سب سے زیادہ صاف ستھرا قرار پائے گا۔آپ نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ:

میری والدہ کو گھر کی صفائی دھلائی کا مطلق شوق نہیں تھا اور یہی حال گھر
کی دوسری مستورات کا تھا۔میری بیوی جب گاؤں میں آئی تو اپنے
ساتھ صفائی کا جن بھی لائی اور اس جن نے کچھ ہی دنوں میں پَر
پُرزے نکالنا شروع کر دیئے۔اسکا آغاز اُس کمرے سے ہوا جو ہمیں
عطا کیا گیا تھا اور اب جسے اہل خانہ حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے بلکہ
جب کوئی مہمان آتا تو وہ اسے اسی کمرے میں بٹھاتے۔(۲۷)

شادی کے وقت تک وہ زراعت کو بطور پیشہ اختیار کر چکے تھے مگر اُن پر یہ بات منکشف ہوئی کہ زمین سے اُن کا رشتہ کاروباری نوعیت کا ہرگز نہیں تھا اصلاً جذباتی نوعیت کا تھا۔اُن دنوں وہ خود کھیتوں میں کام کرتے تھے۔کُھر پا ہاتھ میں لیے گھنٹوں پنیری میں سے گھاس نکالتے یا پودوں کی نرسری میں پیوند لگانے اور فاضل شاخوں کو تراشنے میں محو رہتے۔پھر وہ کھیتوں میں نکل جاتے اور فصلوں کے اُگنے،ان کی نشو ونما پانے اور بالآخر بیج میں ڈھل جانے کے عمل کا بغور مشاہدہ کرتے۔گو ان تمام فطرتی مناظر نے وزیر آغا میں ادبی لگاؤ پیدا کیا۔فطرت ہی انہیں ادب میں لانے کا باعث بنی۔ان کی اہلیہ ۱۲اپریل ۲۰۰۴ء/۲۱صفر المظفر ۱۴۲۵ھ بروز سوموار کو وفات پا گئیں۔

۱۵اکتوبر ۱۹۵۲ء/۱۵محرم الحرام ۱۳۷۲ھ بروز اتوار کو وزیر آغا کو اللہ نے بیٹی عطا فرمائی جس کا نام مینا (وقار النساء) رکھا گیا۔وقار النساء نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔فروری ۱۹۷۲ء کو وقار النساء کا نکاح ہوا اور رخصتی جنوری ۱۹۷۴ء کو ہوئی۔اُن کے داماد کا نام ملک زوار علی ہے۔بیٹی کی شادی نے وزیر آغا پر بہت اثر ڈالا۔وزیر آغا کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کر سکتا ہے۔ایک بیٹی کی شادی سے پہلے کا دور اور دوسرا بیٹی کی شادی کے بعد کا دور۔بیٹی کی شادی کے بعد انسان اچانک خود کو بوڑھا تصور کرنے لگتا ہے۔وہ زندگی کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوئے اور یاس سے آس کی طرف چلے آئے۔

۲۲نومبر ۱۹۵۶ء/۱۸ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ بروز جمعرات کو اللہ تعالی نے انہیں بیٹے کی نعمت سے نوازا جس کا نام سلیم آغا رکھا گیا۔سلیم آغا کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔سلیم آغا نے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۷۹ء میں ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۹۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اُن کے مقالے کا عنوان ''جدید اردو افسانے کے رجحانات'' تھا۔سلیم آغا اب تک آٹھ نو کتابیں لکھ چکے ہیں۔یہ کتب انشائیے،افسانے اور نثری نظموں پر مشتمل ہیں۔

وزیر آغا نے ایک مضمون ''اردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت'' حلقہء ارباب ذوق لاہور کے ایک اجلاس میں پڑھا جس پر بہت تنقید ہوئی لیکن مولانا صلاح الدین نے اُن کی بہت حوصلہ افزائی کی اور اس موضوع پر اُنہیں ''پی ایچ ڈی'' کا مقالہ لکھنے کی تجویز دی۔ وزیر آغا کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور انہوں نے اس پر کام شروع کر دیا۔ وہ اِس مقالے کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ سے ملے اور اس کے علاوہ رہنمائی کے لیے اور کئی بڑے بڑے نامور ادیبوں سے ملے۔ انہیں پنجاب یونیورسٹی نے اس عنوان پر مقالہ لکھنے کی اجازت دے دی۔ اُن کے نگران ''ڈاکٹر عبادت بریلوی'' مقرر ہوئے اور ممتحن ''رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر صادق'' مقرر ہوئے۔ رشید احمد صدیقی نے جب اُن کا مقالہ ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' پڑھا تو یونیورسٹی کو لکھا کہ اس مقالے پر طالب علم کو فوراً ڈگری دی جائے۔ یوں وزیر آغا کو ۱۹۵۶ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ اب وہ وزیر آغا سے ڈاکٹر وزیر آغا بن گئے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی سے وزیر آغا کے مراسم نگران ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ بڑھ گئے۔ وقار عظیم نے بھی اُنہیں مقالہ کے سلسلے میں نہایت قیمتی مشورے دیے تھے۔ اُن کے مقالے کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہنسی کے محرکات کا تجزیہ کیا گیا اور مزاح کے اماثل کا مزاج دریافت کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ قیوم نظر نے اپنے طلبہ سے اس مقالے اور وزیر آغا کے بارے میں کہا کہ:

> وزیر آغا سرگودھا کے ایک بڑے جاگیردار ہیں لیکن ان میں ایسی کوئی خرابیاں نہیں جو جاگیرداروں سے منسوب ہیں، وہ صاف ستھرے کردار کے انسان ہیں۔ علم و ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں اور مطالعے کے شائق ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور اب یہ مقالہ چھپ گیا ہے۔ یہ آپ لوگوں کے لیے بہت مفید ہے اور طلبہ کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (۲۸)

وزیر آغا کی زندگی میں جس استاد سے اُن کا سب سے زیادہ پیار تھا وہ تھے سید عباس حسین زیدی۔ وزیر آغا کو زیدی صاحب کی شفقت اس وقت ملی جب انہوں نے ابھی اپنی پرائمری تعلیم کا آغاز ہی کیا تھا۔ اس طرح آغا صاحب کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنے میں زیدی صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ زیدی صاحب، میر انیس کے حافظ تھے، پورے کے پورے مرثیے انہیں یاد تھے۔ وزیر آغا کے شعری ذوق کی ابتدائی نشو و نما زیدی صاحب کے زیر اثر ہوئی۔ اپنے اسی استاد کی وساطت سے اُن کی جس اردو شاعر سے شروع میں آشنائی ہوئی، وہ میر انیس تھے۔

اس کے علاوہ بھی وزیر آغا کو اپنی زندگی میں کئی نامور اور بہترین اساتذہ و احباب میسر آئے۔ اساتذہ میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، وقار عظیم شامل ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایک خاص مزاج کی شخصیت تھی۔ اُن کے علم وادب کے احترام کے باوجود اُن کا انداز گفتگو وزیر آغا کو پسند نہیں تھا، وہ نہایت رعونت سے باتیں کرتے اور لاہور کے ادباء کی جہالت کا ذکر بطور خاص کرتے۔ وزیر آغا کے لیے اس طرح کی باتیں سننا کسی بہت بڑی اذیّت سے کم نہ تھا مگر مجبوراً سنتے رہتے۔ قابل ذکر احباب میں مولانا صلاح الدین، شمس قمر، غلام الثقلین نقوی، مشتاق قمر، غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، سجاد نقوی، خورشید رضوی، رشید امجد، جمیل آذر، رشید نثار، شاہد شیدائی شامل ہیں۔ اُن کے پسندیدہ شعراء میں فیض احمد فیض، میرا جی، ن م راشد، مجید امجد، ورڈزورتھ، کولرج، بائرن اور شیلے شامل ہیں۔ وزیر آغا کا راولپنڈی میں احباب کا جو حلقہ بنا تھا، اُس کی بنیادی وجہ ان کا ہر سال مری کا قیام تھا۔ راولپنڈی کے احباب میں یوسف ظفر، ضمیر جعفری، مشتاق قمر، جمیل ملک، جمیل آذر، رشید نثار، منشایاد، رشید امجد، احمد ظفر، توصیف تبسم، اعجاز راہی، شبنم منار وی، سرور کامران، نثار ناسک، اکبر حمیدی اور بشیر سیفی شامل تھے۔

کسی زمانے میں سرگودھا شہر کے باہر، ریلوے سٹیشن کے قریب، ڈاکخانے کی ایک خستہ حال پرانی عمارت تھی جسے وزیر آغا کے والد صاحب نے خرید لیا تھا۔ جب بھی ان کے گھر کا کوئی فرد شہر جاتا تو اسی عمارت میں قیام کرتا۔ وزیر آغا کو ضرورت کے تحت سرگودھا شہر رہائش رکھنے کا خیال آیا تو اس عمارت کو گرا کر اپنے لیے ایک نیا گھر بنوا لیا اور یوں ۱۹۵۹ء میں بیٹی وقار النساء اور بیٹا سلیم آغا کی تعلیم کی وجہ سے وزیر آغا نے ۵۸۔ سول لائنیز، ریلوے روڈ، سرگودھا شہر میں اپنا گھر بنالیا۔ اب اس روڈ کا نام بدل کر وزیر آغا روڈ رکھ دیا گیا ہے۔ سرگودھا آ کر وزیر آغا کے گھر میں شام دوستاں آباد ہونے لگی۔ اس کے علاوہ اُن کا تعارف اور رکنیت شہر کی انجمنوں اور اداروں میں ہونے لگی۔ وہ بیشتر انجمنوں کے بنیادی رکن بھی بنے اور ان کے جلسوں میں التزام کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ یہ ادارے زرعی اور نہری مشاورتی کمیٹیوں، روٹری کلب، آرٹ کونسل، سرگودھا اکادمی اور بعض دیگر ادبی اور سوشل تنظیموں پر مشتمل تھے۔ انہیں اِن میں سے متعدد انجمنوں کا صدر یا نائب صدر مقرر کر دیا گیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ایم اے اردو کی کلاسز کو پڑھایا۔ اپنی مصروفیات کے باعث اُنہوں نے چھ ماہ تدریس کی۔ صدر ایوب نے بنیادی جمہورتوں کا جو نظام قائم کیا تھا اس میں نچلی سطح پر انتخابات اور بالائی سطح پر نامزدگی کا اصول اپنایا گیا تھا۔ اُس وقت مغربی پاکستان کے لئے بیس بائیس ارکان پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی نامزد کرنا تھی جس کے لئے وزیر آغا کا نام بھی آیا لیکن وہ اس

کے ذریعے سیاست میں نہ آئے اور جیسے ہی اس کی رکنیت ختم ہوئی، وہ ہمیشہ کے لئے سیاست سے دور چلے گئے۔انہوں نے اس کمیٹی میں رہتے ہوئے دیہاتی مدرسوں میں زرعی تعلیم کو لازمی قرار دلوانے کی کوشش کی۔اُن کی یہ تجویز اُس وقت تو مان لی گئی لیکن بعد میں اس پر عملدرآمد نہ ہوسکا۔وزیر آغا یہ حکومتی عہدہ بھی نہیں اپنانا چاہتے تھے لیکن مولانا صلاح الدین کے کہنے پر آپ نے یہ عہدہ اپنالیا تھا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہوئی تو وزیر آغا کے دل میں بھی اپنے وطن کی سرزمین کے ساتھ محبت کا جذبہ بیدار ہوا۔اِس جذبے کے ساتھ ساتھ اُن کے دل میں جنگ سے نفرت کا وہ جذبہ بھی بیدار ہوگیا جو دوسری عالمی جنگ کے موقع پر اُن کے دل میں پیدا ہوا تھا۔وہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم جیسی ہولناکیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔وزیر آغا کے لیے وطن اور دھرتی کی بے عزّتی ایک جان لیوا اور کرب ناک تجربہ تھا اور یقیناً اس کا تعلق اس دھرتی سے بھی تھا جو اُن کے اعماق میں ایک مقدّس جذبے کی طرح موجود تھی۔اس جذبے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوری ۱۹۶۶ء میں انہوں نے ایک مجلّہ نکالا جس کا نام ''اوراق'' رکھا جو اُن کی اصل پہچان بھی بنا۔اوراق کے بارے میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم لکھتے ہیں کہ:

> اس کا مقصد حب الوطنی کے اس جذبے کو فروغ دینا تھا جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ناگزیر ہوگیا تھا۔اوراق کا یہ مؤقف تھا کہ جب قوم تحفظ ذات کے عمل میں مبتلا ہوتی ہے تو اپنے اندر غوطہ لگاتی ہے کہ خارجی حالات کا پوری طرح مقابلہ کر سکے اور اس طرح قوم ان خزائن تک رسائی حاصل کرتی ہے جو عام حالات میں اس کی نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔(۲۹)

اس سے پتہ چلا کہ وزیر آغا نے یہ مجلّہ حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے نکالا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ذریعے اردو ادب کی آبیاری بھی کرتے رہے۔وزیر آغا نے اس مجلّے کو مولانا کے مسلک ادب کے مطابق چلانے کا اعلان کیا۔وزیر آغا نے اپنے مجلّہ ''اوراق'' کی پیشانی کو ''مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں'' کے الفاظ سے سجایا جو ''اوراق'' کے ہر شمارے پر چمکتے نظر آتے ہیں جو وزیر آغا کا مولانا صلاح الدین احمد سے بے حد محبت کا ایک خاص انداز اور اظہار تھا۔وہ خود اس مجلّہ کے مدیر بنے اور اپنے ''ادبی دنیا'' کے تجربہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔یہ مجلّہ ۱۹۶۶ء سے لے کر ۲۰۰۵ء تک مسلسل چھپتا رہا۔مجلّہ ''اوراق'' نے انشائیہ، جدید نظم، افسانہ، ہائیکو، ماہیہ اور دیگر ادبی صناف کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔۲۰۰۰ء میں (اوراق) کا پینتیس سالہ نمبر جاری کیا۔ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں کہ:

جدیدیت کو فروغ دینے اور اسے ایک رویے کے طور پر شناخت کرانے میں جن دو پرچوں نے اہم کردار ادا کیا، ہوشب خون اور اوراق ہیں۔ اوراق کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت سے پاکستان میں سکہ بند بڑے پرچوں کی مناپلی ٹوٹ گئی۔ اوراق نے نہ صرف جدیدیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا بلکہ اسے ایک متوازن صورت بھی عطا کی۔ اوراق کے فکر انگیز اداریوں نے جدیدیت کے وہ راہنما اصول وضع کئے جس نے کئی انتہا پسندوں کو اعتدال کی راہ دکھائی۔ (۳۰)

جدیدیت کی طرف وزیر آغا کا جھکاؤ ''اوراق'' سے شروع نہیں ہوا بلکہ اوراق سے کم وبیش پانچ سال پہلے جب وہ ''ادبی دنیا'' سے وابستہ تھے تو انہوں نے نہ صرف جدیدیت کی حامل تخلیقات کا خیر مقدم کیا بلکہ اس سلسلے میں نئے لکھنے والوں کو ادب کے نئے آفاق کی طرف متوجہ کیا، اور جدیدیت نے علوم میں ہونے والی جس پیش رفت سے فائدہ اٹھایا تھا، اس کی طرف بھی انھیں مائل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کے باعث ''ادبی دنیا'' کے آخری دور میں جدید نظم کے تجزیاتی مطالعوں کا سلسلہ شروع ہوا، علمی موضوعات پر مباحث کرائے گئے۔ وزیر آغا نے ایک انٹرویو میں کہا: ''اوراق'' کے حوالے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے جدید نظم، جدید افسانے، انشائیے، ماہیے، ہائیکو اور دیگر اصناف کو دائرہ نور میں لانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ''جدیدیت'' اور بعد ازاں ''مابعد جدیدیت'' سے اذہان کو آشنا کیا۔'' (۳۱)

سقوط ڈھاکہ کے بعد لوگ اندر سے ٹوٹ گئے تھے اور اس خوف میں مبتلا ہو گئے تھے کہ مشرقی پاکستان جیسا واقعہ مغربی پاکستان میں بھی رونما نہ ہو جائے۔ پاکستان کے دونیم ہونے کے اثرات بہت گہرے تھے خاص طور پر اردو ادباء نے اس سانحے کو بہت زیادہ محسوس کیا۔ یوسف ظفر اس کی تاب ہی نہ لا سکے اور جلد ہی وفات پا گئے۔ اس دور کے افسانوں، نظموں اور غزلوں میں بے بسی اور یاسیت ملتی ہے سیاسی استحکام کے امکانات کم نظر آ رہے تھے۔ بھٹو حکومت نے بظاہر استحکام کی صورت پیدا کی تھی مگر انتشار کی کیفیت بھی کچھ کم توانا نہ تھی۔ پورے ملک میں دائیں اور بائیں کی تفریق پیدا ہو گئی تھی جو روز بروز بڑھ رہی تھی۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ کل کیا ہوگا۔ اس دور کے لوگ عجیب حالت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ملک کا ایک بڑا طبقہ پیروں اور گدی نشینوں کی طرف راغب ہو رہا تھا۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران وزیر آغا نے رات کے سوتے وقت اپنے گھر

والوں کو احتیاطاً کہا کہ ہوسکتا ہے کہ رات کے وقت دشمن گولہ باری کرے اگر ایسا کچھ ہوا تو سب گھر کی نچلی منزل میں جو پختہ سیڑھی ہے، اس کے نیچے کی جگہ پناہ لیں۔ رات بارہ بجے کے قریب بھارتی جہاز ان کے گاؤں پر منڈلانے لگے۔ وہ سب گھر والوں کے ہمراہ اسی سیڑھی کے نیچے جا کر چھپ گئے اور بہت دیر تک توپوں اور گولوں کی آوازیں سنتے رہے۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ گاؤں چلے گئے۔ وہاں وہ سب اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھے تھے کہ اچانک دشمن کے ایک جہاز نے ان کے گاؤں پر پانچ بم برسائے جن میں سے ایک بم سے ان کے گھر کا ایک حصہ تباہ ہوگیا۔ اُن دونوں واقعات نے وزیر آغا کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا اور ان کی ان واقعات کے بعد کی شاعری میں اس کا اثر جا بجا دیکھا بھی جا سکتا ہے۔

ایک اور اہم واقعہ کچھ یوں ہے کہ جنوری ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ ایک روز وزیر آغا لاہور جا رہے تھے کہ شیخوپورہ سے ذرا پہلے ریل کا پھاٹک عبور کرنے کے بعد اُن کی کار خراب ہوگئی۔ وہ سڑک کے ساتھ ہی ریل کی پٹڑی پر لاہور کی طرف منہ کر کے چہل قدمی کرنے لگے۔ وہ اپنی سوچوں میں گُم چلتے جا رہے تھے کہ انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ اُن کے عقب میں لاہور کی طرف جانے والی ایک تیز رفتار ریل گاڑی آ رہی ہے۔ ریل گاڑی کی سیٹیوں کی آواز بھی اُنہیں سنائی نہ دی۔ اتنے میں ایک شخص نے اُنہیں دھکا دے کر پٹڑی سے ہٹایا اور یوں وہ اس حادثے سے بال بال بچے۔ انہوں نے زندگی میں ایک بار پھر موت کو قریب سے دیکھا۔ یہ واقعہ اُنہیں جب بھی یاد آتا تو اُن پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔

وزیر آغا ۱۹۸۸ء کے موسم بہار میں شدید بیمار ہوگئے۔ اُن پر یرقان کا حملہ ہوا۔ ابھی وہ بیماری سے نجات نہ پا سکے تھے کہ اُنہیں یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ اُن کا داماد ''زوار'' وفات پا گیا ہے۔ پورے خاندان کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ وزیر آغا کے لیے تو یہ واقعہ سوہان روح سے کم نہ تھا کیونکہ بیٹی کے بیوہ اور اس کے بچوں کا یتیم ہو جانا ان کے لیے بہت تکلیف کا باعث تھا۔ ۱۹۸۹ء میں ایک اور سانحہ پیش آیا۔ اس سال وزیر آغا کے بے حد عزیز دوست مشتاق قمر، جن سے آپ کے مراسم تیس برسوں پر پھیلے ہوئے تھے، وفات پا گئے۔ مشتاق قمر راولپنڈی کے رہنے والے تھے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں کہ انہوں نے ہر خوشی غمی میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ ان تمام واقعات کا وزیر آغا کی شاعری پر اثر دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۹۸۶ء میں وزیر آغا نے اپنی خودنوشت سوانح حیات تحریر کی۔ اُن کی خودنوشت مکتبہ عالیہ لاہور نے ''شام کی منڈیر سے'' کے نام سے شائع کی۔ جس کا نیا ایڈیشن: دوسرے حصے کے اضافے کے ساتھ ۲۰۰۹ میں اظہار سنز، اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔ ہارون الرشید تبسم لکھتے ہیں کہ:

اپنی خودنوشت میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ایسا اسلوب اپنایا ہے کہ قاری کو

ڈاکٹر وزیر آغا کی داستان ایک ادبی تاریخ محسوس ہوتی ہے۔ وزیر کوٹ کا ماحول، ادبی تقاریب، پاکستان کے مختلف شہروں اور بیرون ملک سفر کی روداد، زیر مطالعہ کتب اور مختلف علمی و ادبی شخصیات سے ملاقات کا حال کتاب میں بڑی خوب صورتی سے قلم بند کیا گیا ہے۔(۳۲)

۱۹۷۳ء میں وزیر آغا سرگودھا سے لاہور منتقل ہو گئے۔ وہاں انہوں نے ایک مکان کرائے پر لے کر رہائش اختیار کر لی۔ انہوں نے لاہور میں اَدبی محافل میں شامل ہونا شروع کیا۔ وزیر آغا نے لاہور جس گھر میں دو برس گزارے، مصیبتوں میں گرفتار ہو کر گزارے۔ گھر کے کسی بھی فرد کی طبیعت ٹھیک نہ رہی۔ نہ جانے اُس گھر میں کیا ایسا تھا کہ ہر کوئی بیمار ہونے لگا۔ اُن کی بیٹی، بیٹا اور اہلیہ بہت سخت بیمار ہو گئے۔ وزیر آغا بیمار تو نہ ہوئے لیکن جسمانی طور پر کمزوری کا شکار ہو گئے۔ اُن کی بیوی کا خیال تھا کہ کوٹھی منحوس ہے کیونکہ یہاں کچھ ایسا تھا جو سب کے آرام و سکون کو درہم برہم کر رہا تھا۔ جب حالات زیادہ ہی بگڑ گئے تو وزیر آغا کی بیوی اُن سے کہنے لگیں کہ ہم لاہور میں اپنا ذاتی گھر خرید لیتے ہیں اور سرگودھا والا گھر بیچ دیتے ہیں لیکن وزیر آغا سرگودھا والا گھر کسی قیمت پر بیچنے پر تیار نہ ہوئے کیونکہ اس گھر کے ساتھ ان کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ لاہور میں قیام کے دوران وزیر آغا نے ایک خاص قسم کی اجنبیت اور تنہائی محسوس کی جس کی وجہ وہ اہل لاہور کا رویّہ بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> یہ نہیں کہ اہل لاہور ملنسار نہیں تھے یا میل جول کو ناپسند کرتے تھے، ان کی نیاز مندی تو مثالی حیثیت رکھتی ہے مگر کچھ ہی عرصے کے قیام کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہاں کے باسی، باہر سے آنے والوں کو دل میں جگہ دینے پر مائل نہیں تھے۔ وہ مصافحہ کرتے، پھر معانقہ کرتے، پھر خیر خیریت دریافت کرتے، پوچھتے کہ کب آئے، کب رخصت ہوں گے پھر سلاما الیکم اور یہ جا وہ جا۔(۳۳)

وزیر آغا کچھ عرصہ تک اہل لاہور کا بغور مشاہدہ کر کے اس نتیجہ تک پہنچے کہ لاہور کے رہنے والے شخصی ترجیحات کی زد پر ہیں اور اِسی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ چکے ہیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ جہاں بھی چار چھ ادیب جمع ہوتے، جملے بازی کا مظاہرہ کرتے، گفتار کے جوہر دکھاتے، کالج کے طلباء کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے، قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے کے نجی معاملات سے پوری واقفیت کا

مظاہرہ کرتے۔ یوں لگتا جیسے یک جان سو قالب ہیں مگر جیسے ہی ان میں سے کوئی رخصت ہوتا، فوراً اس کی بُرائی شروع کر دیتے۔ یہ ان کا آپس کا رویّہ تھا۔ وزیر آغا سے ان کا رویّہ ایسا تھا کہ انہیں بڑے احترام سے بٹھاتے، خیر خیریت دریافت کرتے مگر ایک مناسب فاصلہ ہمیشہ قائم رکھتے۔ اُن کی زندگی کا اکثر حصہ گاؤں میں گزرا تھا۔ اس لئے انہیں لاہور جیسے بارونق شہر کی آب و ہوا راس نہ آئی اور اسی لیے دوبارہ اپنے گاؤں لوٹ آئے۔ جب وزیر آغا گاؤں رہتے تھے، تین چار ماہ میں دو تین روز کے لیے لاہور جاتے تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاس میں شریک ہوتے۔ بعض اوقات مضمون، انشائیہ یا نظم تنقید کے لیے پیش کرتے۔ چونکہ لاہور میں ان کا کوئی حلقۂ احباب نہیں تھا اور وہ لاہور کے ادبا کے لیے محض مضافات کا ایک اُبھرتا ہوا ادیب تھا، اِس لیے وہ وزیر آغا کی تخلیقات پر بطور خاص سخت تنقید کرتے۔ صرف مولانا صلاح الدین نے اُن کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ حلقۂ ارباب ذوق اُن کی جس تخلیق کو رد کرتا، مولانا صلاح الدین اسے ادبی دنیا میں بڑے اہتمام سے شائع کرتے۔ اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ لاہور کے ادیب مضافات کے ابھرنے والے نئے ادیبوں سے خائف تھے اور ان کی حوصلہ شکنی کر کے انہیں دبا دینا چاہتے تھے۔ وزیر آغا نے قیوم نظر کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> قیوم نظر حلقے میں زیادہ تر اداکاری کرتے تھے اور اس کا نتیجہ حلقے کے باب میں بہت مضر نکلا کیونکہ قیوم نظر نے حلقے کی سیاست کو جس طرح متاثر کیا اور تنقید میں جو متشدد رویہ اختیار کیا، وہ بعد ازاں حلقے کی سرشت میں داخل ہو گیا اور اس کے زوال کا باعث ثابت ہوا۔ (۳۴)

جب اُن کے بیٹے سلیم آغا کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ ملا تو وزیر آغا بھی اکثر گورنمنٹ کالج جایا کرتا تھے۔ میرزا ریاض کے کمرے میں بہت سے اہل دانش اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ لاہور میں قیام کے دوران ہی وہ کبھی کبھی اورینٹل کالج بھی جایا کرتے۔ وہاں آپ کی ملاقات سجاد باقر، تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سہیل احمد سے ہوئی۔ زیادہ تر ان سے وزیر آغا کی بات جدید ادب کے بارے میں ہوتی تھی۔ ان تینوں ایک یہ بات قابل ستائش تھی کہ انہوں نے اورینٹل کالج کی کلاسیکی فضا میں جدیدیت کا چراغ روشن کر رکھا تھا۔ لاہور میں قیام کے دوران وزیر آغا مختلف قسم کی تنقیدی مجالس میں شریک ہوتے رہے۔ وہ مختلف باہر سے آنے والے سکالرز کی تقاریر سنتے۔ بعض اوقات مشاعروں میں بھی شرکت کرتے اور مختلف کالجوں میں ہونے والے تقریری مقابلوں میں جج کے فرائض بھی ادا کرتے رہے۔ اس سب کے باوجود وہ بار بار یہ محسوس کرتے رہے کہ وہ یہاں ایک اجنبی ہیں۔ وہ اِس شہر کی زندگی کے مطابق خود کو شاید ڈھال نہ سکے۔

۱۹۷۵ء میں وزیر آغا نے لاہور کو خیر باد کہا اور دوبارہ اپنے گاؤں کی طرف رُخ کیا۔ انہوں

نے گاؤں آ کر محسوس کیا کہ جس طرح ساری دنیا دو متحارب گروپوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور دنیا کے ایک گروپ کی قیادت امریکہ کر رہا تھا اور دوسرے کی قیادت روس کر رہا تھا۔ اسی طرح گاؤں بھی دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔ گاؤں کے دو بڑے زمیندار ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے جس کی وجہ سے گاؤں دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ وزیر آغا کے نظریے کے مطابق اِن دو گروپوں کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا گروپ بھی ہمیشہ ہوتا ہے۔ یہ گروپ بین بین چلتا ہے جس کی وجہ سے اس گروہ کے لوگ متحارب گروہوں کے تشدد اور نفرت کا نشانہ بنتے ہیں۔ وزیر آغا نے اس کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اور ان کا مجلّہ ''اوراق'' بین بین چلے جس کی وجہ سے متحارب گروہوں کی نفرت اور طنز کا نشانہ بنے لیکن وہ اپنے مسلک پر ہمیشہ قائم اور ثابت قدم رہے۔

زندگی کے آخری ایّام میں وزیر آغا بڑھاپے کے باعث گھر میں اپنے کمرے میں زیادہ وقت گزارنے لگے۔ وہ زندگی کے آخری ایام میں تنہا رہ گئے تھے کیونکہ اب وہ چلنے پھرنے کے لائق نہ رہے تھے۔ اس تنہائی کے وقت میں اُن کے دو ساتھی تھے ٹیلی فون اور ٹی وی۔ فون کے ذریعے اُن کا رابطہ دنیا میں پھیلے اپنے دوستوں سے قائم تھا جن میں ناروے سے فیصل ہاشمی، افضل عباس اکثر فون کرتے تھے۔ حیدر قریشی جرمنی سے، کینیڈا سے ڈاکٹر پرویز پروازی، امریکہ سے ستیہ پال آنند، بھارت سے جوگندر پال، بلراج کومل، اسلم حنیف، جمال اویسی، شازیہ عمیر، ڈاکٹر کیول دھیر اور مجتبیٰ فہیم فون کرتے رہتے تھے۔ ملکی دوستوں میں اکثر پروفیسر جمیل آذر، صبا اکرام، رشید امجد، انور محمود خالد، رشید نثار، امین راحت چغتائی، منشا یاد، انجم نیازی، اکبر حمیدی، اقبال آفاقی، ادیب سہیل، محمود واجد، احمد زین الدین، ڈاکٹر رؤف نیازی، راغب شکیب سے اکثر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

ٹی وی پہ وزیر آغا زیادہ تر ڈاکومنٹریز دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اینیمل پلینٹ کا چینل بھی شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کھیل کے مقابلے بھی اکثر دیکھا کرتے تھے۔ وہ اس عمر میں باہر دوستوں سے ملنے نہیں جا سکتے تھے لیکن اُن کے دوست اکثر اُن سے ملنے آ جایا کرتے تھے۔ یوں تقریباً ہر شام کوئی نہ کوئی دوست آ جایا کرتا تھا جو اُن کی تنہائی کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتا تھا۔ انور سدید، سجاد نقوی، خالد اقبال یاسر، شاہد شیدائی، خالد فتح محمد، ایئر مارشل (ر) ظفر چوہدری، رشید قیصرانی، ناصر عباس نیر، نیاز احمد صوفی، مظفر بخاری، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر شبیہ الحسن، اسلم کولسری، رؤف ظفر، مظفر غفار، امجد پرویز، شاہد واسطی، سجاد نقوی، منور عثمانی، مشتاق احمد، منیر سیفی، زاہد منیر عامر، ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر محمد علی، امجد طفیل، حسین مجروح، مسعود مفتی، رشید نثار، رشید امجد، سحر انصاری، نصیر احمد ناصر، رفیق سندیلوی، ناصر شہزاد، انجم نیازی، صفدر سلیم سیال، صبا اکرام، انور محمود خالد، محمود واجد، شمشاد احمد، علی محمد فرشی، عبید بازغ امر، غفار پاشا، جاوید حیدر

جوئیہ، ڈاکٹر عمران مشتاق، شہزاد نیر، توقیر عباس وغیرہ وزیر آغا سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وزیر آغا کے بھارت سے آنے والے دوستوں میں سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، شہریار، شمیم حنفی، کیول دھیر اور شین کاف نظام، جب بھی پاکستان آتے تو وزیر آغا سے ضرور ملتے۔ وزیر آغا اپنے ان دوستوں سے ملاقات کر کے تازہ دم ہو جایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک طویل عمر پائی۔ اُن کا عرصہ ٔ حیات ۸۸ برس، ۳ ماہ اور ۲۰ دن (شمسی) جبکہ ۹۱ برس، ۷ دن (قمری) پر مشتمل تھا۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ کی پیدائش اور وفات دونوں ہی رمضان میں ہوئیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۷ ستمبر ۲۰۱۰ء بروز منگل رات ساڑھے گیارہ بجے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ رمضان المبارک کی اٹھائیسویں رات تھی۔ وہ نیشنل ہسپتال، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی لاہور کینٹ میں فوت ہوئے۔ اُن کی نماز جنازہ ۸ ستمبر ۲۰۱۰ء/ ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ بروز بدھ وزیر کوٹ ضلع سرگودھا میں ادا کی گئی۔ سینکڑوں لوگ نماز جنازہ اور تدفین کے مرحلے میں شامل ہوئے۔ وزیر آغا کو اُن کے آبائی گھر کے پچھلے احاطے میں اپنی اہلیہ کے دائیں پہلو میں دفن کیا گیا۔ جلیل عالی، شاہد شیدائی، اقتدار جاوید، شاہد بخاری، افتخار عارف، انور سدید، رشید امجد، منشا یاد، علی محمد فرشی، انور محمود خالد اور ناصر عباس نیر کے علاوہ سرگودھا کے بیش تر اہل قلم نے اُن کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ اُن کی رسم سوئم ۱۲ ستمبر ۲۰۱۰ء/ ۲ شوال المکرّم ۱۴۳۱ء بروز اتوار گیارہ بجے دن بمقام وزیر کوٹ سرگودھا میں ہوئی۔ رسم چہلم ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۰ء بروز اتوار بمقام وزیر کوٹ سرگودھا میں ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات پر پورے پاکستان میں جگہ جگہ تعزیتی اجلاس ہوئے اور ان کی ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۱۰ء کو مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں تعزیتی ریفرنس ہوا۔ اس کے علاوہ ۲۶ ستمبر ۲۰۱۰ء کو قائداعظم لائبریری لاہور میں، اس تاریخ ہی کو سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہء اردو میں، ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ایوان اقبال زیر اہتمام حلقہ ارباب ذوق لاہور میں، اکتوبر ۲۰۱۰ء ہی میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں، ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء زیر اہتمام سرگودھا رائٹر کلب سرگودھا میں، ۱۰ نومبر ۲۰۱۰ء کو قائداعظم لاء کالج سرگودھا میں تعزیتی ریفرنس ہوئے۔

وزیر آغا نے ۱۹۵۸ء میں ریلوے روڈ سرگودھا پر ایک سادہ سی کوٹھی اپنی رہائش کے لیے تعمیر کروائی تھی۔ اُن کی وفات کے بعد ادبی حلقوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل ادبی خدمات کے ضمن میں ریلوے روڈ کو ڈاکٹر وزیر آغا روڈ کا نام دیا جائے۔ سرکاری سطح پر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر ریلوے روڈ کا نام وزیر آغا روڈ رکھنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ سرگودھا شہر میں کسی بھی ادیب کے نام پر حسب ضابطہ یہ پہلی سڑک ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کو ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو تمغہء امتیاز سے اور ۲۳ مارچ ۱۹۹۹ء کو ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ ۲۰۰۴ء میں مسعود کھدر پوش ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اردو ادب کی ایک اہم اور ہمہ جہت شخصیت تھے۔ ایک ادیب کے ساتھ ساتھ ان کی ایک الگ متاثر کن شخصیت بھی تھی۔ اُن کے ہم عصروں نے ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور اکثر نے ان کی تعریف ہی کی ہے۔ اگر وزیر آغا کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو اُن کی پیدائش (۱۸ مئی ۱۹۲۲ء) سے لے کر اُن کی وفات (۷ ستمبر ۲۰۱۰ء) تک کے تمام ملکی و عالمی واقعات نے ان کی زندگی پر اسی طرح اثرات ڈالے جیسے دیگر لوگوں پر، لیکن چونکہ وزیر آغا ایک ادیب اور شاعر تھے، اس لیے اُنہوں نے اپنی زندگی کے حالات اور اپنے معاشرے کے حالات کو اپنی نثر اور شاعری میں ڈھال دیا۔ وزیر آغا نے اپنی ذاتی زندگی کو بھی اپنی شاعری اور نثر کا حصہ بنایا لیکن اس طرح کہ اس میں اجتماعیت کا عنصر شامل ہو گیا۔ وزیر آغا کی نفسیات کو ان کی شاعری اور دیگر تصانیف کے ذریعے سمجھا اور جانا جا سکتا ہے۔ اُن کی زندگی کسی ایسے انسان کی نہیں معلوم ہوتی جو زندگی کی اہمیت کو نہ جانتا ہو بلکہ وزیر آغا نے اپنی زندگی کو بہت سنجیدگی سے بسر کیا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا اور زندگی کو اپنے نصب العین کے مطابق گزارا۔ اُن کی زندگی کا مقصد ادب کی خدمت کرنا تھا۔ اگر بحیثیت انسان وزیر آغا کی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے تو اُن کے اکثر ناقدین کے مطابق وزیر آغا نہایت شریف النفس، نفیس اور باذوق انسان تھے۔ ہارون الرشید تبسم لکھتے ہیں کہ:

> وہ سراپا محبت تھے، دوستوں کے غموں کو مسرتوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے۔ بے ساختہ پن ان کی شخصیت کا خاصا تھا۔ قنوطیت اور حوصلہ شکنی ان کی ذات سے کوسوں دور تھی۔ اپنے مخالفین کو بھی حقارت سے نہیں دیکھتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا وسیع الظرف اور وسیع القلب تھے۔ وہ درویش صفت شخصیت کے مالک تھے اور دوسروں میں اچھائی تلاش کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں کشش، مٹھاس اور برجستگی کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ گفتگو میں ادبیت اور مزاح کا رنگ پیدا کرنا ڈاکٹر وزیر آغا کا ہی کمال تھا۔ (۳۵)

وزیر آغا مثبت سوچ کے حامل انسان تھے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وزیر آغا نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کسی ادیب سے اختلاف ہو لیکن ادبی سیاست نے کئی ادیبوں کو ان کے خلاف کر دیا۔ شفیع ہمدم لکھتے ہیں: ''وزیر آغا اونچی آواز میں نہیں بولتے تھے اور نہ ہی قہقہہ مار کر ہنستے تھے۔ ان کا تحمل، بردباری، نرم و گداز لہجہ ان کی تہذیب و شائستگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔'' (۳۶)

وزیر آغا کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' وزیر آغا کی نفسیات اور حالاتِ زندگی کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ان کی سوانح عمری ''شام کی منڈیر سے'' بھی ان کو سمجھنے میں بہت اہم ہے۔وزیر آغا کا بچپن دیگر گاؤں کے بچوں کی نسبت کافی بہتر گزرا حالانکہ ان کے گھریلو معاشی حالات اتنے اچھے نہ تھے جس نے اُن کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا۔جب وہ کالج جانے لگے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہوئے کیونکہ اُن کے گھریلو حالات تب تک بہتر نہ ہوئے تھے۔کالج کے امیر لڑکوں کو دیکھ کر وزیر آغا اکثر ایک محرومی کا شکار ہو جایا کرتے۔اس سب کے باوجود وزیر آغا اپنی زندگی سے بہت لطف اندوز ہوئے۔اُنہوں نے مختلف علاقوں کی سیّاحت کی۔سجاد نقوی لکھتے ہیں:''جوانی میں انہیں نئے نئے کھانے پکوانے کا شوق تھا،سیر وسیاحت کا بھی بہت شوق تھا۔خلوص،محبت،سادگی،ایثار،انکساری اور شرافت کے مجموعے کا دوسرا نام وزیر آغا ہے۔غصہ تو شاید ان کی ذات میں سرے سے موجود نہیں۔''(۳۷) تعلیم مکمل کرنے کے بعد زراعت سے وابستہ ہو گئے اور ساتھ ساتھ اپنے شوق و ذوق یعنی ادب سے اپنا تعلق قائم رکھا۔جس سے لگاؤ اُن کو کالج بلکہ سکول کے دنوں سے ہی ہو گیا تھا۔شادی کے تجربے نے وزیر آغا کی زندگی میں بہت تبدیلی لائی،انہیں زندگی سے پیار ہو گیا۔بیٹی کی پیدائش نے انہیں مزید خوشی عطا کی۔پی ایچ ڈی مکمل کی،اللہ نے بیٹی کے بعد بیٹے کی خوشی دی۔یہ دَور وزیر آغا کی زندگی کا خوشگوار دور تھا۔پھر وہ گاؤں چھوڑ کر شہر آ گئے جس کا مقصد بچوں کی اچھی تعلیم اور اُن کا ادبی ذوق تھا۔انہوں نے شہر آ کر بہت سی ادبی محافل میں شرکت کرنی شروع کر دی۔ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے لاہور شہر جانے لگے،بعد میں بیٹے کی تعلیم کی غرض سے لاہور جانا پڑا لیکن دوبارہ گاؤں آ گئے اور ساری زندگی فطرت کے نظاروں کے درمیان گزار دی۔

وزیر آغا کی زندگی کے آخری بیس سال بہت سے صدموں میں گزرے جس میں اُن کے داماد اور اُن کے قریبی دوستوں کی وفات کے علاوہ اُن کی اہلیہ کی وفات بڑے بڑے صدموں میں شامل ہیں۔ان صدمات نے وزیر آغا کی نفسیات کو بہت متاثر کیا اور وہ خود کو تنہا متصور کرنے لگے یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں بڑھاپے میں تنہائی کا احساس بہت شدت اختیار کر گیا ہے۔شرم وحیا کا عنصر وزیر آغا کی ذات میں بہت زیادہ پایا جاتا تھا۔پروفیسر غلام جیلانی اصغر لکھتے ہیں:

> مجھے وزیر آغا کی شکل اچھی لگی اور اس کی یہ ادا اور بھی بھلی لگی کہ وہ حیادار بہو بیٹیوں کی طرح منہ ڈھانپ کر رکھتا۔وزیر آغا کسی نجی یا غیر نجی محفل میں ننگے سر نہیں جاتا۔وزیر آغا میں،مَیں نے یہ خوبی دیکھی کہ وہ بلا وجہ خوش نظر آتا ہے۔وزیر آغا کی دوستیاں انہیں لوگوں سے پختہ ہیں جو

مذاق کے باہمی رشتہ میں منسلک ہیں۔(۳۸)

مجموعی طور پر وزیر آغا کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وزیر آغا فطرت کے چاہنے والے تھے اور اُنہیں شہری زندگی سے سخت چڑ تھی۔اس کے ساتھ ساتھ یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی دکھوں اور خوشیوں کا مجموعہ ہے۔وزیر آغا شرم وحیا کے پیکر، تحمل و بردباری سے لبریز اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے دوست تھے۔

وزیر آغا اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کو ادب کی تمام اصناف میں شاعری کی صنف سب سے زیادہ محبوب ہے اور شاعری میں بھی نظم اُن کو زیادہ محبوب تھی۔ایک انٹرویو میں سوال کے جواب میں اُنہوں نے کہا:''آپ نے پوچھا ہے کہ مجھے اپنی کون سی جہت زیادہ پسند ہے تو میں کہوں گا شاعری۔۔۔شاعری ہی سے میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا اور زندگی کے آخری ایّام میں یہی ایک جہت باقی جُملہ جہات پر حاوی ہوگئی ہے۔''(۳۹)

بھارت کے وہ ادباء جو انگریزی میں لکھتے تھے، وزیر آغا کی نظموں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان میں سے بیشتر نے اُن کی نظم نگاری پر مبسوط مقالے یا تاثرات تحریر کیے جو بھارت کے انگریزی رسالوں میں شائع ہوئے اور بعد میں سرگودھا اکادمی اور سرگودھا آرٹ کونسل کی مشترکہ مساعی سے شائع ہونے والی کتاب میں بھی شامل ہوئے۔ان لکھنے والوں میں ڈاکٹر سامل، ڈاکٹر سائمن پال پاٹنک، شوکے کمار، بی کاویری اور ڈاکٹر کرشن سری نواس شامل ہیں۔لیکن سلیم اختر جیسے نقاد بھی ہیں جو ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اُلٹا طنزاً لکھتے ہیں کہ:''ساقی فاروقی نے''نابالغ شاعری کی ایک مثال۔۔۔۔وزیر آغا''جیسا پُر معنی مقالہ لکھ کر وزیر آغا کو زندہ کر دیا۔''(۴۰)

وزیر آغا کی پہلی نظم''دھرتی کی آواز''کے نام سے رسالہ''ساقی''میں چھپی۔وزیر آغا کی شاعری کا پہلا مجموعہ''شام اور سائے''۱۹۶۴ء کو لاہور سے مکتبہ جدید ناشرین نے شائع کیا۔خواجہ محمد زکریا اپنے ایک مضمون میں وزیر آغا کے فنِ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> وہ تکنیک میں اردو شاعروں سے کم تر اور مغربی شاعروں سے زیادہ تر استفادہ کرتے رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے مغربی شاعری سے یوں استفادہ کیا ہے کہ اس کی بازگشت ان کی شاعری میں سنائی دیتی ہے۔ان کی نظموں کو آپ کسی ایک یا گنتی کے دو چار شاعروں سے مستفاد قرار نہیں دے سکتے۔اگرچہ مغربی شاعری کی عمومی تکنیک سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا ہے تاہم ان کی شاعری کی

فضا سراسر پاکستانی ہے۔ان کی امیجری،علامات ،تشبیہات و
استعارات کا نظام،غرض پوری فضا،بالعموم پاکستان اور بالخصوص وسطی
پنجاب کے منظر نامے سے مربوط ہے۔مغربی شاعری کی تکنیک سے
قرب کے سبب ان کے ہاں ابہام بھی موجود ہے اور موضوعات کی
ندرت ،پیچیدگی اور وسعت،قاری کے لیے تفہیم کے مسائل بھی پیدا
کرتی ہے۔یہ بڑے جدید شعراء کی طرح بہت توجہ چاہتی ہے اور سمجھنے
کے لیے کئی کئی قرأتوں کی متقاضی ہے لیکن جب قاری اس کے قریب
ہو جاتا ہے اور اس سے گہری آشنائی حاصل کر لیتا ہے۔(۴۱)

مکتبہ جدید ناشرین ہی نے ۱۹۶۹ء میں نظموں اور غزلوں پر مشتمل ایک کتاب ''دن کا زرد پہاڑ'' شائع کی۔اس مجموعے میں زیادہ تر آزاد نظمیں شامل ہیں۔بقول ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم:

وزیر آغا نے یکم جنوری ۱۹۶۹ء کو ''دن کا زرد پہاڑ''
نظموں اور غزلوں کے دوسرے مجموعے کے بارے میں ''نرد بان''
کے نام سے پیش لفظ میں ایک صدیوں پرانی کہانی بیان کی ہے اور اس
کے اختتام میں وزیر آغا لکھتے ہیں: ''ہر روز جب صبح پھوٹتی ہے تو
میرے سامنے دن کا زرد پہاڑ سینہ تانے آ کھڑا ہوتا ہے اور پھر اس کی
چوٹی سے ایک تیز،بھیانک چیخ میں تبدیل ہوتی ہوئی آواز
مسلسل،متواتر اور یہ نظمیں تو صرف اس کرب کے اظہار کی ایک نا
تمام کوشش ہیں جو زرد پہاڑ کے بلاوے پر شاعر کے دل میں پیدا ہوا
اور اس کی نس نس میں دوڑتا چلا گیا۔(۴۲)

۱۹۷۳ء میں مکتبہ اردو زبان سرگودھا نے ۱۹۷۲ء تک کی اُن کی تحریر کردہ غزلوں کا مجموعہ شائع کیا۔۱۹۷۹ء میں مکتبہ اردو زبان سرگودھا نے اُن کی نظموں کا مجموعہ ''نرد بان'' شائع کیا۔۱۹۸۱ء میں مکتبہ فکر و خیال لاہور نے اُن کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کو کتابی صورت میں شائع کیا۔یہ مجموعہ ایک طویل سوانحی نظم پر مشتمل ہے۔یہ نظم ۱۹۸۹ء میں انگریزی میں ترجمہ بھی کی گئی۔۱۹۹۴ء میں یہ نظم پنجابی میں بھی ترجمہ کی گئی۔یہ ترجمہ راکھ سنتوکھ سری نے کیا۔اس طویل نظم میں وزیر آغا نے اپنی زندگی کے حالات کو بہت خوبصورتی سے پینٹ کیا ہے۔کتاب کا انتساب انہوں نے معروف نظم گو مجید امجد کے نام کیا ہے۔یہ ایک طرح کی اُن کی سوانح عمری

ہے جوانہوں نے نظم کی صورت میں بیان کی ہے۔اس نظم میں انہوں نے اپنے اندر کی تمام خواہشوں اور آرزوؤں کو بیان کیا ہے۔ایسا اردو ادب میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی شاعر نے اپنی سوانح عمری کو منظوم صورت میں لکھا ہو۔وزیر آغا ایسے چند شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اپنی سوانح عمری منظوم صورت میں لکھی ہے،اس سوانح عمری کو عالمی سطح پر بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔وزیر آغا اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: میرے لیے یہ نظم ایک طویل سفر تھا جو میری زندگی کے تقریباً پچاس برسوں پر پھیلا ہوا تھا۔انہوں نے اس سفر کا حال لکھتے ہوئے واقعات وحادثات کے بجائے ان داخلی کیفیات کو بیان کیا تھا جو واقعات وحادثات سے پھوٹی تھیں اور انہیں بہا لے گئی تھیں۔(۴۳) اُنہوں نے اس کتاب کے دیباچے میں اسے ایک داخلی اوڈیسی کا نام دیا ہے۔وزیر آغا نے اس نظم میں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کو ندی، دریا اور سمندر کی علامتوں میں پیش کیا۔سلیم اختر وزیر آغا کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' سے یہ رمز بلیغ آشکار ہوتی ہے کہ ادنیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا حامل شاعر کیسے عظیم موضوع کو اپنی تخلیقی شخصیت کی پست سطح پر لا کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اسے ''داخلی اوڈیسی'' قرار دیا ہے۔اگر ڈاکٹر وزیر آغا کا داخل محض پانی ہی ہے تو یقیناً یہ شخصیت کی تخلیقی توانائی کا استعارہ بننے والا صاف شفاف پانی نہیں بلکہ مریضانہ رجحانات کی دلدل ہے۔(۴۴)

غزلوں اور نظموں پر مشتمل مجموعہ ''گھاس میں تتلیاں'' ۱۹۸۵ء میں مکتبہ فکر وخیال لاہور نے شائع کیا۔یہ مجموعہ نظموں، غزلوں اور تین طویل نظموں کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔صابر لودھی لکھتے ہیں کہ: ''گھاس میں تتلیاں'' کی بیشتر غزلیں اور نظمیں شاعر کے صادق جذبوں کا ابلاغ کر کے قاری کے جمال کو آسودگی عطا کرتی ہیں جنہیں ڈاکٹر وزیر آغا نے جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔''(۴۵) صابر لودھی کے بیان کے مطابق وزیر آغا کے اس مجموعہ کی شاعری قاری کے جمال کو آسودگی عطا کرتی ہے لیکن سلیم اختر وزیر آغا کی شعری کتاب ''گھاس میں تتلیاں'' پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر وزیر آغا: ''گھاس میں تتلیاں'' درحقیقت گھاس پر ٹڈیاں ہیں۔''(۴۶) یوں وزیر آغا پر ہمیشہ کی طرح ان کے مخالفین نے خامیاں تلاش کیں اور حامیوں سے ہمیشہ ان کے خواص کی نشاندہی کی۔ہارون الرشید تبسم لکھتے ہیں کہ: ''اس مجموعے کی نظمیں جہاں قارئین کے دل ودماغ کو معطّر کرتی ہیں وہاں ان کی نظمیں بھی قاری کو بڑی دیر اپنے کلاوے میں جکڑے رکھتی ہیں۔''(۴۷)

۱۹۸۸ء میں ''غزلیں'' کے عنوان سے اُن کی غزلوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جدید پریس لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب میں ان کی چھیاسی غزلیں شامل ہیں۔ ان غزلوں میں کئی نئے استعارے اور علامتیں لے کر آئے ہیں۔ ان غزلوں میں دیگر موضوعات کے علاوہ رومانوی موضوع بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ غزل کے تمام فنی محاسن اور لوازمات کا خیال رکھا گیا ہے۔ ان غزلوں میں داخلیت کا رویہ بڑا توانا ہے، وہ دلی واردات کو بڑی خوبصورتی سے غزل کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ وزیر آغا کی غزلوں میں نئی نئی دنیائیں آباد کرنے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں آنسو کا استعارہ کرب اور انسانی دردمندی کے روپ میں بار بار ابھرتا ہے۔

اسی مکتبہ نے ۱۹۹۰ء میں ''اک کتھا انوکھی'' کے عنوان سے ایک طویل نظم شائع کی۔ اس مجموعہ میں اکیس نظمیں، سات غزلیں اور ایک طویل نظم شامل ہے۔ اس کتاب کا انگریزی، یونانی اور سویڈش زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس مجموعے کی غزلوں میں ایک جوش ایک ولولہ قاری کو ملتا ہے جس میں رجائیت کا پہلو بڑا نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جو سفر پر اکساتا ہے، رکنے کا نہیں بلکہ چلتے رہنے کا درس دیتا ہے۔ وزیر آغا نے اپنی نظموں کے بارے میں ایک انٹرویو میں کہا:

> خود میں نے کبھی نظم میں تازگی لانے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ میں کسی خاص موضوع یا واقعے پر اپنے تاثرات پیش کرنے کے لیے نظم نہیں لکھتا؛ مگر موضوعات اور واقعات ہمہ وقت ریزوں کی طرح میرے باطن میں گرتے رہتے ہیں اور پھر کسی روز جڑ کر، ایک clot بن جاتے ہیں جس سے میرے لہو میں کہرام اور سانس میں ناہمواری آجاتی ہے۔ پس اس کہرام اور ناہمواری سے نجات پانے کے لیے میں نظم لکھتا ہوں۔ (۴۸)

۱۹۹۰ء تک شائع ہونے والے مجموعے ۱۹۹۱ء میں ''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' کے نام سے ایک ہی جلد میں پیش کیے گئے۔ اسی کلیات کو ۱۹۹۸ء میں کتب نما لاہور اور ۲۰۰۷ء میں اظہار سنز نے شائع کیا۔ یہ اُن کی عمر کا تقریباً بہتر واں سال تھا اور اب انہیں لگتا تھا کہ شاید وہ مزید شاعری تخلیق نہ کر سکیں، اس لیے جتنی شاعری کر چکے تھے، انہوں نے اپنے تمام طبع شدہ شعری مجموعوں کو کلیات کی صورت میں مرتب کیا اور اس کا نام ''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' رکھا۔ اس کلیات کے چھپنے پر بھی دو طرح کی آراء آنے لگیں، کچھ لوگوں نے اس کی تائید میں لکھا اور کہا جبکہ کچھ نے اس کے خلاف بہت کچھ کہا اور لکھا۔ شعراء کی نئی نسل نے اسے بہت سراہا۔ کوئی بھی کتاب ہر اعتبار سے بے عیب نہیں ہوتی لیکن معترضین نے تو اس کے خلاف حد سے زیادہ لکھا جو بالکل غیر ادبی

رویہ ہے۔ وزیر آغا شاعری چھوڑ دینے کا ارادہ کر چکے تھے لیکن معترضین نے اُن میں دوبارہ جوش پیدا کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کتاب کے بعد اگلے دس بارہ سالوں میں آپ کے شاعری کے چھے مزید مجموعے شائع ہوئے یوں یہ مخالفت فائدہ مند ثابت ہوئی۔

۱۹۹۵ء میں مکتبہ نردبان سرگودھا نے نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''یہ آواز کیا ہے'' شائع کیا۔ اس مجموعہ میں ۳۱ غزلیں شامل ہیں۔ نظموں کے موضوعات اور ان کا مزاج جدیدیت کا رنگ رکھتا ہے۔ ''یہ آواز کیا ہے'' طویل نظم ہے جو شاعر کے خیال کی زندہ تصویر ہے۔ مکتبہ نردبان سرگودھا نے ۱۹۹۷ء میں نظموں کا مجموعہ ''عجب اک مسکراہٹ'' شائع کیا۔ ہارون الرشید تبسم نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا کا اس مجموعے کی نظموں کا تجزیہ بیان کیا ہے کہ:

> زیرِ نظر شعری مجموعہ سے میری ان گزارشات کا تعلق بالواسطہ نوعیت کا ہے۔ میں دراصل کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جس طرح ہر نئے منظر یا صورت کو دیکھنے کے لیے آنکھ کے زاویے میں موزوں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے اسی طرح ہ نئے شعری مجموعہ کو پڑھنے کے لیے بھی قاری کو اپنی مقررہ جگہ سے کسی نہ کسی حد تک سرک جانا چاہیے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ ارتقاء کی دوڑ میں جب بینائی کا دور آیا تو سب سے پہلے انسان بطور ایک کائناتی آنکھ نمودار ہوا جس نے پلٹ کر کائنات کو دیکھنے کا آغاز کر دیا اور سوالات پوچھنے لگا۔ پھر اسی انسانی آنکھ کے اندر ایک اور آنکھ نمودار ہوئی اور یہ شعری آنکھ تھی جس نے خود شاعر کی آنکھ کی کارکردگی میں اضافہ کر دیا۔ اس کے بعد شعری آنکھ کے اندر بھی ایک آنکھ ظاہر ہوئی اور یہ قاری کی آنکھ تھی جس نے خود شاعر کی آنکھ کی کارکردگی میں اضافہ کر دیا۔ مختصر یہ کہ آنکھ کو پڑھنے کے لیے بھی ایک آنکھ درکار ہے۔ (۴۹)

۱۹۹۹ء میں لاہور سے نظموں کا مجموعہ ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' چھپا۔ ہارون الرشید تبسم نے اس کتاب کے بارے میں نصیر احمد ناصر کا بیان اپنی کتاب میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

> وزیر آغا کے اس مجموعے کی نظموں میں جو بات سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ اسلوب و بیان کی سادگی ہے۔ ان نظموں میں الفاظ کی

سادہ کاری اور صناعت میں نقطہ اور شوشے کا فرق ہے جسے ایک خاص تخلیقی مقام پر پہنچنے کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مقام پر شاعر نہ صرف لفظوں کو نرمل، صاف اور واضح طور پر دیکھنے اور انہیں آر پار چھید نے بلکہ ان کی قلب و ماہیت تک صلاحیت حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ لہذا وہ صنائع و بدائع کی بجائے الفاظ و مفاہیم کی شفافیت کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس سطح پر تو اظہار کے لیے الفاظ بھی اسے بوجھل محسوس ہونے لگتے ہیں۔ وہ ریشم کی اک کترن، خوشبو کی اک چٹکی اور بادل کے اک اڑتے پرسے ترسیل کا کام لے سکتا ہے۔ وہ حروف اس کے سامنے خود بخود شبنم ایسی شمعیں لے کر ابھر آتے ہیں۔ (۵۰)

۲۰۰۱ء میں نظموں کا مجموعہ ''ہم آنکھیں ہیں'' شائع ہوا۔ وزیر آغا نے ان نظموں میں آنکھ کو ایک کیمرے کی شکل دی ہے جس نے حال کو مستقبل کے لیے مقید کر لیا ہے۔ غم دوراں، غم جاناں اور تغیر و تبدل کے سارے سلسلے آنکھوں کے راستے شعور کے کینوس پر منتقل نظر آتے ہیں۔ ۲۰۰۳ء ہی میں اُن کی پنجابی شاعری کا مجموعہ ''واجاں باجھ وچھوڑے'' شائع ہوا جس پر اُنہیں مسعود کھدر ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ آغا صاحب ٹھیٹھ پنجابی الفاظ پنجابی شاعری میں لے کر آئے جنہوں نے پنجابی حلقوں کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُن کی پنجابی نظموں میں مکالمے کی سی فضا پائی جاتی ہے۔ اس مجموعہ میں وزیر آغا کی مکالمے اور تمثیلی انداز کی نظمیں شامل ہیں۔ وزیر آغا کی پنجابی شاعری میں لوک داستانوں اور قصے کہانیوں کو تلمیحات کے ذریعے برتا گیا ہے۔ اُنہوں نے ہیر رانجھے کے قصے کو اپنی متعدد پنجابی نظموں میں تلمیحات کی مدد سے اجاگر کیا ہے۔ اسی سال یعنی ۲۰۰۳ء میں کاغذی پیرہن لاہور نے اُن کی نظموں کا مجموعہ ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' شائع کیا۔ احمد صغیر صدیقی اس مجموعے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> شاعر وزیر آغا کی نظموں کی کتاب ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' کی نظمیں اس شاعر کو پوری طرح منعکس کرنے والی کہی جا سکتی ہیں جو کسی ایسے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا ہوا ہے جس کے چاروں طرف عمودی گہرائی ہے، جسے طے کرنے میں اسے اسّی سال لگے ہیں۔ اس کی مشقت، اس کا ریاض، اس کے تجربات، اس کے مشاہدوں اور اس کے علم کے سارے رنگوں کی جھلک ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' کی نظموں میں بھری

ہوئی ہے۔(۵۱)

مکتبہ کاغذی پیرہن لاہور نے ۲۰۰۵ء میں اُن کی نظموں کا مجموعہ ''چٹکی بھر روشنی'' شائع کیا چونکہ وزیر آغا کی اہلیہ ۱۲ اپریل ۲۰۰۴ء کو وفات پا گئی تھیں۔اس مجموعے میں زیادہ تر نظموں کا پس منظر شریک سفر کے بچھڑنے کا غم ہے اسی لیے اس شعری مجموعے کا انتساب اپنی اہلیہ صفیہ آغا کی یاد میں رکھا گیا۔۲۰۰۹ء کو اسی مکتبہ نے نظموں کا مجموعہ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' شائع کیا۔ہارون الرشید تبسم نے اپنی کتاب میں رشید امجد کا ان نظموں کے بارے میں نظریہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> یہ نظمیں شعور ذات اور تعین خود کے عصری مفاہیم کی تفسیر ہیں۔موجودہ کونیاتی تناظر میں ،تازہ فکری و علمی پس منظر کے ساتھ باطن میں اترنے اور ہونے نہ ہونے کی حقیقت دریافت کرنے کا عمل وزیر آغا کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ایک ہی معنیاتی کل میں بنی ہوئی ان نظموں میں دو آوازیں، بہ تکرار ابھرتی اور اپنا آپ نقش کرتی ہیں۔ان میں سے ایک توانا و تابندہ اور ہونے کی اثبات کی کہانی ہے۔یہ بھیگی چاپ بن، دستک میں ڈھل، مقفل بستیوں کو نیند سے بیدار کرنے ،سجل ماتھوں کی قوموں پر، سیہ آنکھوں کے حلقوں پر، لرزتے بند ہونٹوں پر تحریر ہو کر، انہیں زندگی دینے اور اک اک سمت ہونے کا میلہ لگائے رکھنے کی آرزو مند ہے۔دوسری آواز ایک گھاؤ اندر گھاؤ کہانی، پہاڑوں میں دراڑیں، دراڑوں سے دھواں، اندر ہی اندر جل بجھنے کی کیفیت سے متعلق ہے۔وزیر آغا نے ان دونوں آوازوں کو کبھی جدا جدا اور کبھی باہم ایک کر کے مصور کیا ہے۔(۵۲)

۲۰۱۱ء کو اسی مکتبہ نے ''کاسہ شام'' کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا جو کہ وزیر آغا کی زندگی کا آخری شعری مجموعہ ہے اور اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ہارون الرشید تبسم نے اپنی کتاب میں اس مجموعے کے بارے میں ارمان نجمی کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> تازگی اور شدت کی حامل وزیر آغا کی تمثیلیں ،ان کی نظموں کو ان کی پہچان ہی نہیں بخشتیں ،قاری کو متحرک بھی کرتی ہیں او رلاشعور کی گہرائیوں میں بھولے بسرے تجربات کی یاد دہانی سے ان کے ذہن کو

منقلب بھی کرتی ہیں۔ گویا ایک ذاتی اسطورہ کی تخلیق کرتی ہیں۔ ان کی تمثالوں کی یہ خوبی بھی لائق توجہ ہے کہ دوراز کار نہیں ہوتیں، موضوع کے موقع و مناسبت کے مطابق عمل میں آتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ اعلیٰ اور بے جوڑ تمثالوں کو یکجا کر کے تخلیقیت کی ایسی مثال قائم کرتے ہیں جو ایک نابغۂ عصر ذہن ہی سے ممکن ہے۔(۵۳)

وزیر آغا نے ضعیف العمری میں بھی اتنی نظمیں لکھیں کہ ایک مکمل شعری کتاب وجود میں آ گئی۔ اُن کی اس خوبی کے بارے میں شاہد شیدائی لکھتے ہیں کہ: ''وزیر آغا کا ذہن اس قدر تخلیقی فعالیت کا حامل تھا کہ وہ زندگی کے آخری ایام تک نظمیں لکھتے رہے جو سب کی سب ادبی سائل میں شائع ہو چکی ہیں۔''(۵۴) شاہد شیدائی نے وزیر آغا کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ وزیر آغا نے اپنی نظم نگاری سے محبت اور لگاؤ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں عمران نقوی سے کہا:

میری شاعری کا آغاز نظم نگاری سے ہوا تھا اور یوں لگتا ہے، اختتام بھی نظم نگاری پر ہوگا۔ درمیان میں، مَیں غزل بھی لکھتا رہا جس کی کلیات کے تین ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں؛ لیکن نظم سے میرا لگاؤ اوّل تا آخر قائم رہا۔ اب میری عمر چھیاسیویں برس کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ میں نہ تو غزل لکھ رہا ہوں اور نہ ہی تنقید۔ مگر نظم کے ذریعے میرا رشتہ ماورا سے پوری طرح جُڑا ہوا ہے۔ مہینے میں ایک دو نظمیں لکھ لیتا ہوں اور شاعری کے طلسم میں کھویا رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں، اگر مجھے نظم لکھنے اور نظم سے لطف اندوز ہونے کی سعادت نصیب نہ ہوتی تو میرے بڑھاپے کے ان ایّام میں زندہ رہنا کتنا مشکل ہوتا۔(۵۵)

۱۹۷۴ء کو ''وزیر آغا کی نظمیں'' کے عنوان سے ایک شعری انتخاب شائع ہوا۔ اس کے مرتب غلام حسین اظہر تھے۔ ۲۰۰۱ء میں اُن کی شاعری کا ایک انتخاب کاغذی پیرہن لاہور نے شائع کیا۔ اس کا عنوان ''برکھا بھیگے خوابوں کی'' تھا۔ ۲۰۰۷ء میں کاغذی پیرہن لاہور نے ایک اور شعری انتخاب شائع کیا۔ اس کا عنوان ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں'' تھا۔ اس مجموعہ کا انتخاب فیصل ہاشمی نے کیا۔

۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء کی بہترین نظمیں انتخاب وزیر آغا اکادمی پنجاب لاہور

نے شائع کیا۔ ۱۹۷۸ء میں جمیل اظہر اور مشتاق قمر نے آپ کی منتخب نظموں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جسے مکتبہ اردو زبان سرگودھا نے شائع کیا۔ وزیر آغا کی نظموں کا سرائیکی ترجمہ ''جونڑویاں نظماں'' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ نظم'' آدھی صدی کے بعد'' ہندی ترجمہ ش ک نظام نے ۱۹۸۳ء میں انڈیا سے کیا۔ اسی نظم کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۹ء میں راجندر سنگھ ورما نے مغربی پاکستان اکیڈمی لاہور سے شائع کروایا۔ آزاد گلاتی نے ۱۹۹۲ء میں وزیر آغا کی سات نظموں کا انگریزی ترجمہ کیا۔ مظفر عبدالغفار نے winds of fire کے نام سے وزیر آغا کی نظموں کا انگریزی ترجمہ کیا۔ A tale so strange کے نام سے یونانی زبان میں اُن کی نظموں کا ترجمہ Dance Papastaratou نے کیا۔ ۱۹۹۴ء میں اُن کی نظموں کا پنجابی ترجمہ آدھی صدی پچھوں کے عنوان سے سنتوکھ سری نے کیا۔ ستیہ پال آنند نے ۱۹۹۷ء میں اُن کی نظموں کا ترجمہ Poems Mild and Mellows کے نام سے کیا۔ ۱۹۹۸ء میں نظم اک کتھا انوکھی ڈینش زبان میں ترجمہ کی گئی۔ یہ ترجمہ نصیر ملک نے کیا۔ اس کتاب کا نام Half a century later رکھا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے خود انگریزی زبان میں اپنی نظمیں ۲۰۰۰ء میں Poems and Haiku poems کے نام سے ترجمہ کیں۔ ۲۰۰۰ء میں ہی Is Let any one out there کے نام سے انہوں نے اپنی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ۲۰۰۱ء میں the springs viberate کے نام سے انہوں نے خود اپنی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اُن کی ہائیکو یونانی زبان میں Zoe Savina نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیں۔ اُن کی بیس نظمیں اٹالین زبان میں ۲۰۰۳ء میں Brono Rombi نے ترجمہ کیں۔ Late Showers کے نام سے اُنہوں نے خود ۲۰۰۴ء میں اپنی نظمیں ترجمہ کیں۔ ناروی زبان میں افضل عباس اور Paul erik norton نے مل کر اُن کی نظمیں ۲۰۰۵ء میں ترجمہ کیں۔ Zoe Savina نے ۲۰۰۵ء میں Qnros کے عنوان سے یونانی زبان میں اُن کی نظمیں ترجمہ کیں۔

۱۹۵۸ء میں اکادمی پنجاب لاہور نے وزیر آغا کی تنقیدی کتاب ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' شائع کی جو کہ اُن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا۔ اُن کے اس مقالے کو بہت سراہا گیا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ وزیر آغا نے کلاسیکی ادب اور جدید ادب میں طنز و مزاح کو نہ صرف تلاش کیا ہے بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہ کس معیار کا ہے۔ نثر، نظم، ڈرامہ، اردو صحافت، مزاحیہ کالم اور اردو ادب کے مزاحیہ کردار پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے، بلکہ انہوں نے طنز اور مزاح کے درمیان حائل باریک سے فرق کو بھی نہایت ہنرمندی سے واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا نے مسکراہٹ، ہنسی اور قہقہہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ان تینوں کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کتاب میں جن مغربی ناقدین کی

آراء کو شامل کیا ہے۔ان میں کانٹ ،شو پنہار ،پروفیسر سلی ،برگساں ،فرائڈ ،ایسٹ مین اور آرتھر کولسلر شامل ہیں۔مزاح کی اہمیت ،مشرق ومغرب کے مزاح نگار،اودھ پنچ سے لے کر دور جدید تک طنز ومزاح کے ارتقاء کو ترتیب زمانی کے اعتبار سے پیش کیا ہے۔صحافت ہو یا ڈرامہ،مزاحیہ کردار ہوں یا طنز ومزاح سے بھرپور کلام،خطوط میں مزاح کا عنصر ہو یا خوبصورت مکالمہ جات ڈاکٹر وزیر آغا نے ان سب کو ایک کتاب میں مقیّد کر دیا ہے۔محمد رفیع از ہر وزیر آغا کی تنقید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ڈاکٹر وزیر آغا کی شروع سے ہی کوشش رہی ہے کہ تنقیدی روایت کو عام ڈگر سے ہٹ کر نئی جہت سے آشنا کیا جائے تا کہ اس میں جدّت آنے کے ساتھ ساتھ اسے عالمی ادب میں بھی ایک اعلیٰ مقام مل سکے۔ان کا اسلوب تنقید یہ ہے کہ وہ برسوں سے رائج نظریات اور عقائد کو من وعن قبول نہیں کر لیتے بلکہ جو تبدیلیاں وقت کے تقاضوں کے ساتھ لازم ہوتی ہیں،وہ ان تبدیلیوں پر بھی توجہ مرکوز کرتے ہیں اور رائج اور گھسے پٹے نظریات میں تازگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔(۵۶)

جہاں وزیر آغا کے حامی محمد رفیع از ہر نے ان کی تنقید نگاری کو سراہا وہیں اُن کے مخالف سلیم اختر اُن کی تنقید نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:''پہلے تو ڈاکٹر وزیر آغا اردو تنقید میں دھرتی پوجا کے نظریہ سے پہچانے جاتے تھے۔البتہ اب متعصب گروہ پسند اور خود پسند نقّاد کی حیثیت سے شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں مگر بے برکت ایسے کہ جس کی تعریف میں مقالہ لکھا،اس کی لٹیا ڈبودی۔''(۵۷)

۱۹۶۳ء میں ادارہ اکادمی پنجاب لاہور نے اُن کی ایک تنقیدی کتاب ''نظم جدید کی کروٹیں'' شائع کی۔اس کتاب میں تمام جدید نظم نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ڈاکٹر جمال اویسی وزیر آغا کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> وزیر آغا نے اردو تنقید کی سمت کو موڑا ،کئی متنازع بحثیں اٹھائیں۔انہوں نے اپنی تنقیدی بحث میں تمام علوم سے استفادہ کیا۔انہوں نے ظاہر کے بجائے باطن میں گھسنے کی کوشش کی۔جو علوم وزیر آغا کی تنقید کے اسلوب اور بنیادی فکر کو تراشتے ہیں،ان میں علم الانسان،نفسیات،ارضیات،طبیعات،کونیات،مذہبیات،تاریخ اور ادبیات عالم اساسی نوعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔چنانچہ یہ اس درجے

کی تنقید ہے جس میں محض ادب کی اصناف اور ان کی صورتوں سے
بحث نہیں ملتی، یہ ہمیں ادب کے تخلیقی عمل کے بارے میں بھی بتاتی
ہے۔ادب کن مراحل سے گزر کر فنی کمال کے درجے پر فائز ہوتا
ہے،اس کی تفصیل وزیر آغا پیش کرتے ہیں۔(۵۸)

۱۹۶۵ء میں جدید ناشرین لاہور نے اُن کی تنقیدی تصنیف ''اردو شاعری کا مزاج'' شائع کی۔اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی ملک اور ملک کے باہر ادبی حلقوں میں نئے مباحث ابھرنے لگے۔اس کتاب کے بارے میں متضاد مضامین بھی سامنے آنے لگے۔اس کتاب میں تہذیبی اور ثقافتی سطح پر اردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے دراوڑی تہذیب سے آریائی تہذیب کے ملاپ کو بیان کیا ہے اور اردو گیت کی جڑوں کو اسی ملاپ میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔پھر اس کے بعد عجمی اسلامی تہذیب کی آویزش کو بیان کیا ہے اور اردو غزل کی جڑوں کو اسی آویزش میں تلاشا ہے اور آخر میں وزیر آغا نے انگریزی تہذیب سے اس کے تصادم کا ذکر کیا ہے اور اس کے سنگم پر اردو نظم کی جڑوں کو ڈھونڈنے کی سعی کی ہے۔یہ بڑی بات ہے کہ انہوں نے تہذیبی عناصر کی روشنی میں گیت،غزل اور نظم کے مزاج کو متعین کیا ہے۔یہ کام واقعی اردو ادب میں نیا تھا جسے بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔اس کتاب میں اردو گیت،غزل اور نظم کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب نے شائع ہوتے ہی اردو کی ادبی دنیا میں بہت تحرک پیدا کیا۔خالد فتح محمد اپنے ایک مضمون میں اس کتاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

اردو ادب میں پہلی مرتبہ دھرتی پوجا کو موضوع بنایا گیا اور شاعری کو اپنی
زمین سے جوڑ کر پیش کیا گیا۔اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ترقی
پسند تحریک نے ادب کو زندگی اور سیاسی نظریات سے وابستہ ضرور کیا تھا
مگر ترقی پسند ادیب زیادہ تر اشتراکی نظریات کا شکار تھے اور ان کی
تخلیقات محض پراپیگنڈہ بن کر رہ جاتی تھیں۔(اردو ادب کا مزاج)
نے اس دور میں وطنیت سے گریزاں قوم پرستی کو اپنی مٹی سے جوڑ کر
دکھایا۔یہ نقطۂ نظر اس مکتب فکر کو قابل قبول نہ تھا جو ملکی سرحدوں میں
یقین نہیں رکھتے تھے۔اس کتاب کی اشاعت پر ادب کے نام نہاد
پارکوں نے اس کے بطون میں اترے بغیر ایک کہرام برپا کر
دیا۔مصنف پر (دراوڑیت) پھیلانے کا الزام لگایا اور کتاب کو تنگ

نظری کی طرف اقدام جانتے ہوئے اسے ملکی مفاد کے منافی قرار
دیا۔(۵۹)

خالد فتح محمد کے بیان کے مطابق وزیر آغا کے مخالفین کو ان کا اچھا کام بھی بُرا ہی دکھائی دیتا تھا کیونکہ انہوں نے حقارت کی نظر سے ہمیشہ اُن کی ہر تصنیف کو دیکھا۔یہی وجہ ہے کہ انہیں وزیر آغا کی تصنیف ''اردو ادب کا مزاج'' بھی بُری لگی حالانکہ اس کتاب کو بین الاقوامی شہرت ملی۔سلیم اختر نے وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اردو شاعری کا مزاج'' ایک نزاعی کتاب ہے جس کا رشید ملک نے ''معاصر'' میں مطبوعہ مقالہ ''طلائی تثلیث'' میں جدید ترین علوم کی روشنی میں پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اس کے بنیادی تھیسس کو لغو اور بے معنی ثابت کیا۔انہوں نے سرقہ کی مثالیں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کی ''علمیت'' کا بھانڈا پھوڑ دیا۔(۶۰)

شاہد شیدائی نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ دراصل اس کتاب کی مقبولیت کی کئی ایک وجوہ تھیں۔اوّل یہ کہ ہمارے ہاں تنقید نے ابھی وہ مقام حاصل نہیں کیا تھا جو مغربی تنقید کو حاصل ہو چکا تھا اور یہ کتاب طے شدہ تنقیدی فارمولوں سے ہٹ کر لکھی گئی تھی۔دوم یہ کہ موضوع کا انتخاب نہایت اچھوتا تھا اور اس کے ساتھ مصنف نے پورا پورا انصاف کیا تھا۔سوم یہ کہ پہلی بار اردو شاعری کی جڑوں کو برصغیر کی تہذیب اور ثقافت میں تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔چہارم یہ کہ تہذیب وثقافت کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس میں اردو شاعری کی تاریخ بھی مرتب ہو رہی تھی کہ مصنف نے مختصر طریق مگر نہایت عمدہ سلیقے سے اردو شاعری کے ادوار مرتب کیے تھے۔پنجم یہ کہ اس کا اسلوب عام ڈگر سے بالکل ہٹا ہوا تھا اور مصنف نے تنقید کی مروّجہ جناتی زبان سے گریز کرتے ہوئے اپنے بیان کو سادہ، پرمعنی اور پرکشش بنا کر پیش کیا تھا اور آخری یہ کہ کتاب کے ابواب کی تقسیم اور ان کی نشست برخاست میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا جس کے باعث قاری کہیں بھی کوئی جھول محسوس نہیں کرتا اور کتاب کو روانی سے پڑھتے چلا جاتا ہے۔شاہد شیدائی اس کتاب کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

> کتاب کی اشاعت نے اردو تنقید کا رخ موڑ دیا۔اس کی تعریف اور مخالفت میں بے شمار مضامین لکھے گئے مگر اس کی اہمیت سے انکار نہ کیا جا سکا۔اس پر تبصرے بھی ہوئے اور مذاکرے بھی۔اب تک اس

کتاب کے تیرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس نے مفکرین، محققین
اور ناقدین کے لئے سوچ کے نئے دروازے کھول رکھے ہیں۔(۶۱)

شاہد شیدائی کا نکتہ نظر تو ہمارے سامنے واضح ہو گیا۔ وزیر آغا خود اس کتاب کے بارے میں ایک انٹرویو میں کچھ یوں کہتے ہیں:

دراصل ''اردو شاعری کا مزاج'' ایک وسیع تر جدلیات پر مبنی کتاب تھی۔ عام خیال یہی ہے کہ ہر دو قوتیں ہمہ وقت ایک دوسرے سے بر سر پیکار ہیں اور ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہیں۔ ہیگل کا نظریہ یہ تھا کہ ہر تھیسس اپنے اینٹی تھیسس کے روبرو آ کر سینتھی سس میں بدل جاتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میں نے قدیم ہندوستان کی دراوڑی تہذیب کو تھیسس اور باہر سے آنے والی آریائی تہذیب کو اینٹی تھیسس کا درجہ دیا اور پھر ان کے سینتھی سس کو گیت یا گیت نما شاعری کا محرک قرار دیا۔ بعد ازاں میں نے ''تخلیقی عمل'' لکھتے ہوئے اپنے اس نظریے کی توسیع کی اور کہا کہ تھیسس اور اینٹی تھیسس مل کر سینتھی سس نہیں بناتے، یہ ٹکرا کر بے ہئیت ہو جاتے ہیں۔(۶۲)

جدید ناشرین لاہور نے ۱۹۶۸ء میں اُن کا تنقیدی مجموعہ ''تنقید اور احتساب'' شائع کیا۔ اس کتاب میں موجود مضامین گہری تخلیقی کاوشیں ہیں۔ افسانہ، ڈرامہ، غزل، نظم، انشائیہ اور تنقید کا منظر اور پس منظر جیسے موضوعات پر وزیر آغا کے لکھے یہ مضامین غور و فکر پر مائل کرتے ہیں۔ اُن کی اس کتاب میں عملی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ یہ تنقیدی مضامین جہاں اردو ادب کے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں وہاں اردو ادب کے طالب علموں کے لیے بھی بہت مفید ہیں، طلبہ بیک وقت قدیم اور جدید اردو شاعری، اردو افسانے نیز اردو افسانے میں علامت کے استعمال کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن پاکستان اور ہندوستان میں شائع ہو کر اہل فن سے داد وصول کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں کہ:

وزیر آغا کے تنقیدی سرمائے کو غور سے دیکھیں تو دو دھارے بہت واضح ہیں۔ اول ان کا تہذیبی حوالے سے دیومالائی تعلق۔ یہ رشتہ کلچر کے مسائل، تہذیب و تمدن کی عہد بعہد نشو و نما سے شروع ہوتا ہے جسے انہی کو زبانی زمینی رشتہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے دوسرے سرے پر وہ ذہنی

رویے ہیں جنہیں آسمانی رشتے کہا جا سکتا ہے۔اسی زمین اور آسمان
کے رشتوں میں عمودی اور افقی زاویے بھی شامل ہیں۔اس لحاظ سے
وزیر آغا کے تصورات کی بنیادی کلید چار لفظوں میں پوشیدہ ہے
زمین، آسمان، عمود، افق۔(۶۳)

اقبال اکادمی پاکستان نے ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''غالب کا ذوق تماشا'' شائع کی۔اس کتاب میں وزیر آغا نے ۹۹ صفحات پر مشتمل مضامین میں ۲۰۷ اشعار کا سہارا لے کر دیوان غالب کے اختصار کی طرح اپنی علمیت کا سکہ بٹھایا ہے۔اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے مضامین اس انداز سے لکھے گئے ہیں کہ غالباً ڈاکٹر صاحب غالب کے ہم عصر رہے ہوں۔غالب کی زندگی، اُس کے دور کے سیاسی حالات، اس کی شاعری کے نمایاں خدوخال، خطوط غالب اور کلام غالب کی ہمہ گیر حیثیت کو وزیر آغا نے بڑے کمال فن سے اجاگر کیا ہے۔فیض اور غالب کی مماثلت اور غالب اور تصوف کی روایت میں بھی وزیر آغا نے آنے والے ناقدین کے لیے بہت کچھ لکھ دیا ہے۔

مکتبہ اردو زبان سرگودھا نے فروری ۱۹۷۲ء میں ''نئے مقالات'' کے عنوان سے ایک تنقیدی کتاب شائع کی۔۱۹۷۵ء میں مکتبہ اردو زبان سرگودھا نے تنقیدی کتاب ''تخلیقی عمل'' شائع کی۔۲۰۰۳ء میں اس کتاب کے چھٹے ایڈیشن میں انھوں نے ایک نئے مقالے کا اضافہ کیا جس میں تنقیدی تھیوری کے حوالے سے تخلیقی عمل کی ساخت کا جائزہ لیا گیا۔۲۰۰۹ء میں اس کتاب کا آٹھواں ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں ایک اور باب کا اضافہ کیا گیا۔وزیر آغا کی اس کتاب میں انہوں نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ پوری کائنات میں تخلیقی پیٹرن ایک ہی ہے۔چنانچہ انہوں نے حیاتیات، اسطور، تاریخ اور ادب کی سطح پر تخلیقی عمل کی کارفرمائی کا جائزہ لے کر اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ کتاب لکھتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب مخالف قوتیں آپس میں ٹکرا کر بے ہیئت ہو جاتی ہیں تو اس بے ہیئتی میں سے تخلیق ایک جست لگا کر باہر آ جاتی ہے۔

۱۹۷۶ء میں اسی مکتبہ نے ''تنقید اور مجلسی تنقید'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کتاب کے پیش لفظ میں اس کتاب میں موجود مضامین کی تروتازگی کو یوں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرا ایک اور پسندیدہ موضوع ظرافت ہے۔زیر نظر مجموعہ میں اس موضوع کی حدود افقی اور عمودی دونوں سمتوں میں پھیلتی چلی گئی ہیں۔اُفقی سمت نے مجھے مسلمان اقوام میں ظرافت کی رو کا جائزہ لینے پر مائل کیا ہے جب کہ عمودی سمت نے مجھے معنویت سے لبریز اس تبسم زیر لب کا منظر دکھایا ہے جو ہمہ بینی اور ہمہ دانی اور ہمہ رنگی کی ایک صورت ہے۔یہ بہرحال ان خاص موضوعات سے میری وابستگی ایک طویل عرصہ پر محیط ہے مگر میں

مطمئن ہوں کہ ابھی میرے لیے یہ موضوعات باسی نہیں ہوئے۔

اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے ۱۹۷۷ء میں تنقیدی مجموعہ ''تصورات عشق وخرد'' شائع کیا۔ ہارون الرشید اپنی کتاب میں وزیر آغا کی اس کتاب پر معروف شاعر شہزاد احمد کا بیان لکھتے ہیں کہ:

> آغا صاحب نے اقبال کا مطالعہ مغربی اور اسلامی دونوں حوالوں سے کیا ہے، اس مطالعہ سے نہ صرف اقبال کے بہت سے نئے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں بلکہ بہت سے مفکرین کے معتقدات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ فکر اقبال کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ آغا صاحب نے اقبال کے بارے میں بہت سے مباحث پھر سے نئی معنویت کے ساتھ چھیڑے ہیں اور آخر میں فکر اقبال کی ایک نئی توجیہہ بھی کی ہے۔ کلام اقبال کی بعض علامتوں کی مدد سے عشق وخرد کے بارے میں اقبال کے موقف کو وسیع تر تناظر میں پیش کیا گیا ہے جو اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ (۶۴)

ایک اور کتاب ''عبدالرحمٰن چغتائی شخصیت اور فن'' مئی ۱۹۸۰ء کو مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مختلف ادباء و ناقدین کے بھرپور مضامین ہیں اور دوسرے حصے میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کا ایک طویل مضمون ہے جس میں محمد عبدالرحمٰن چغتائی کے فن مصوری کے علاوہ ان کے خاندانی پس منظر، ابتدائی ایام، مختلف اسفار کی تفصیل ہے۔ یہ مضمون عبدالرحمٰن چغتائی کے فکر وفن کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ عبدالرحمٰن چغتائی نے اسلامی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے اسلامی روایتِ مصوّری کو ارتقاء بخشا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ علامہ اقبال سے لے کر موجودہ دور کے تمام نامور ادباء اور معروف ناقدین کے متعلق مضامین اس میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک چغتائی کا فن تجریدی آرٹ کے ذیل میں نہیں آتا مگر کچھ حد تک اس میں تجریدیت کا عنصر بھی موجود ہے۔ اس طرح ان کے فن مصوری کو زندگی کا آئینہ قسم کا آرٹ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

''انتخاب نظم جدید'' مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، سجاد نقوی ۱۹۸۱ء کو انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کی۔ بھارت سے ''نئے تناظر'' کے نام سے ایک تنقیدی مجموعہ ۱۹۷۹ء کو شائع ہوا جو پاکستان میں آئینہ ادب لاہور نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی اس کتاب میں مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ نئے تناظر اور دوسرا حصہ نئے نقوش کے نام سے ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ساحل احمد

نے لکھا جو سات صفحات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنے پیش لفظ میں ارسطو اور افلاطون سے لے کر دور جدید تک تنقید کی مختلف کروٹوں پر بحث کی ہے۔ انہوں نے نیاز فتح پوری، حسن عسکری، آل احمد سرور اور مسعود حسین خان کی اردو تنقید کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا کو جدید تنقید کا ہیرو قرار دیا ہے۔ ساحل احمد نے اس کتاب میں موجود مضامین پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ مضامین تاریخی، ادبی اور نفسیاتی اہمیت کے حامل ہیں اور قاری اپنے ذوق کے مطابق ان مضامین سے استفادہ کر سکتا ہے۔

مکتبہ فکر و خیال لاہور نے ۱۹۸۶ء میں تنقیدی مجموعہ ''دائرے اور لکیریں'' شائع کیا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا ادب کے نت نئے رجحانات کو زیر بحث لائے ہیں۔ افسانے میں اگر علامت آئی ہے تو اس کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ اگر کوئی صنف اردو ادب میں آئی ہے تو اس پر بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں وزیر آغا نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ اردو تنقید کا غالب حصہ متفرق موضوعات پر لکھے گئے مقالات پر مشتمل ہے اور کسی ایک موضوع پر کتاب تصنیف کرنے کی روایت خاصی کمزور رہی ہے۔ البتہ اب کچھ عرصہ سے پی ایچ ڈی کے لیے خاص خاص موضوعات پر پوری کتاب لکھنے کی روش عام ہو رہی ہے مگر کوئی نئی تھیوری وضع کرنا اور پھر اس تھیوری کا اطلاق سارے ادب پر کرنا آج بھی (کم از کم اردو تنقید کی حد تک) شجر ممنوعہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے پچھلے تیس سال میں کوشش کی ہے کہ عام روش سے ہٹ کر کچھ کام کروں۔ اس کتاب کے مقالات بغیر کسی ریپر کے پیش کئے جا رہے ہیں مگر میں دراصل سنگ زنی کرنے والوں کے بجائے ان چند قیامت کی نظر رکھنے والوں کی تلاش میں ہوں جو ان مضامین کے مطالعہ کے بعد مجھے بھید کی وہ بات بتا سکیں جس تک بوجوہ میری رسائی نہیں ہو سکی۔ کتاب کا انتساب ڈاکٹر وزیر آغا نے فیض احمد فیض کے نام کیا ہے۔

''قومی یک جہتی اور ادب کا کردار'' ۱۹۸۶ء میں مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہوئی۔ ۱۹۸۷ء میں انڈیا سے آپ کی تنقیدی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' کا ہندی میں ترجمہ سیمانت پرکاش نے شائع کروایا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی نے ۱۹۸۹ء میں ''تنقید اور جدید اردو تنقید'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ یہ کتاب اسی سال مکتبہ جامعہ، نئی دہلی سے بھی شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اقبال کی ادبی تنقید کو بہت سراہا ہے اور ان کے حوالے درج کیے ہیں۔ اس سے پہلے اقبال کو ہمیشہ ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھا اور پڑھا جاتا رہا ہے مگر وزیر آغا کے نزدیک وہ شاعر تو بڑے ہیں ہی، اس کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی اور تنقیدی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد ''فن اور شخصیت'' مرتبین ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید انجمن ترقی اردو کراچی نے ۱۹۹۰ء میں شائع کی۔

۱۹۹۰ء میں مکتبہ فکر و خیال لاہور نے ''انشائیہ کے خدوخال'' شائع کی۔ ۱۹۹۱ء میں اسی

کتاب کو جامعہ نگر، دہلی نے بھی شائع کیا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کتاب میں انشائیہ کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے۔انہوں نے اردو میں لائٹ ایسے (Light Essay) کے لیے انشائیہ کا لفظ رائج کیا۔چونکہ اردو میں انشائیہ کی کوئی خاص روایت موجود نہیں تھی اور قارئین نے ایسے کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے الگ اور جدا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔اس لیے جب ماہنامہ ''ادب لطیف'' میں لائٹ ایسے کو پیش کرنے کی تحریک کا آغاز ہوا تو وزیر آغا اور میرزا ادیب کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ لائٹ ایسے کو کیا نام دیا جائے تا کہ یہ دوسری اصناف سے الگ نظر آ سکے۔کچھ عرصہ کے لیے انہوں نے ''لطیف پارہ'' کی ترکیب استعمال کی لیکن یہ مقبول نہ ہو سکی۔پھر انہوں نے ''انشائیے لطیف'' کی ترکیب کا احیاء کیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ ''انشائیے لطیف'' کے ساتھ ٹیگوریت چپک کر رہ گئی تھی چنانچہ اسے بھی ترک کرنا پڑا۔اسی دوران میں نے کسی ادبی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا، میرزا ادیب صاحب سے وزیر آغا نے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔اس کے بعد ''ادب لطیف'' میں ''لائٹ ایسے'' کے لیے ''انشائیہ'' کا لفظ ہی استعمال ہوتا رہا اور خوش قسمتی سے یہ مقبول بھی ہو گیا۔

مکتبہ فکر و خیال لاہور نے نومبر ۱۹۹۱ء میں ''ساختیات اور سائنس'' شائع کی۔اس کتاب میں شامل مضامین ساختیات اور پس ساختیات کے تناظر میں شامل کیے گئے ہیں۔اس کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا نے جہاں عملی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں وہاں جدید تھیوریوں کے بارے میں بھی عام قاری کو آگاہ کیا ہے۔ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ڈاکٹر وزیر آغا کا کمال یہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل بات کو آسان پیرائے میں بیان کرتے ہوئے مثالوں کا سہارا بھی لیتے ہیں جس سے عام قاری ان کی دقیق باتیں آسانی سے سمجھنے لگتا ہے۔ساختیات کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ادبی فن پاروں کا مطالعہ اس طرح کیا ہے کہ ان اصولوں اور ضوابط یا آنکھوں سے اوجھل ان رشتوں اور روابط کا پتہ چلایا جا سکے جو باہم مل کر ادبی روایت کے تجریدی نظام کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں اور جن کی رو سے ادب کی مختلف شکلیں شاعری، ناول، افسانہ وغیرہ وجود میں آتی ہیں۔(۶۵)

معین اکادمی لاہور نے نومبر ۱۹۹۱ء میں ''مجید امجد کی داستان محبت'' شائع ہوئی۔وزیر آغا نے مجید امجد کی اہمیت کو اس وقت پہچانا جب بہت کم لوگ اس کا نام جانتے تھے اور اس کے شعری مقام سے آگاہی رکھنے والے تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ادبی دنیا میں وزیر آغا نے مجید امجد کی نظمیں مسلسل شائع کیں۔ان

پر تجزیے لکھوائے اور ان کے کلام پر مسلسل تنقیدی مضامین لکھے۔ ان کی ان کاوشوں کے سبب مجید امجد کا نام ادبی حلقوں میں سنجیدہ توجہ کا مستحق ٹھہرا۔ انہی مضامین کو انہوں نے مجید امجد کی داستان محبت میں یکجا کیا۔ اب جب کہ مجید امجد پر بہت سی یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں، ان پر کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں اور رسائل میں ہر ماہ مضامین طبع ہو رہے ہیں، ظاہر ہے کہ مجید امجد شناسی کی ان کوششوں کی بنیاد وزیر آغا نے رکھی تھی۔ وزیر آغا نے مجید امجد کو دھیمے، مگر صاف الفاظ میں میرا جی، راشد اور فیض سے بڑا اور زیادہ اہم شاعر قرار دیا ہے اور دیر اور دور تک وقت کا ساتھ دینے کی صلاحیتوں کا حامل گردانا ہے۔ وہ مجید امجد کو جدید اردو نظم کا بانی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی شاعری میں اپنی مٹی کی خوشبو موجود ہے جسے وزیر آغا جدید نظم کی جان قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید اپنی کتاب میں وزیر آغا کی اس کتاب کے بارے میں جاوید قریشی کا بیان لکھتے ہیں:

> ادب میں تحقیق و جستجو اور دریافت و یافت کا یہ قطعی منفرد، انوکھا اور غالباً پہلا چونکا دینے والا تجربہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے مجید امجد کی شاعری سے ریزے چنے اور انہیں گوندھ کر ایک مجسمہ تشکیل دیا یا یوں کہیے کہ داستان محبت کا تاج محل بنایا اور پھر خود ہی اسے پاش پاش کر دے اور اس کے ریزوں، ذروں اور کرچیوں کو ناظرین اور قارئین کے سامنے بکھیر دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس کی لطافتوں، نزاکتوں اور جمالیاتی لامتناہیوں سے لطف اندوز ہوں اور اس داستاں کے تناظر میں مجید امجد کو ایک نئے انداز میں دریافت کریں۔ (٦٦)

۱۹۹۸ء میں مکتبہ نردبان سرگودھا نے وزیر آغا کی کتاب ''معنی اور تناظر'' شائع کی۔ اس کتاب میں وزیر آغا کے چالیس مقالات شامل ہیں۔ نظری تنقید کے ذیل میں ۲۲ مضامین اور عملی تنقید کے ذیل میں ۱۸ مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کو مختلف یونیورسٹیوں نے اپنے تنقید کے نصاب میں شامل کیا ہوا ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن انڈیا سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کتاب کے پیش لفظ میں مشرقی اور مغربی تنقید پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے امتزاجی زاویہ نظر کو خاص موضوع بنایا ہے۔ آپ نے اس کتاب میں مشرق و مغرب میں زیر بحث ادبی نظریات کو موضوع بنایا گیا ہے جو اس وقت ادب میں رائج ہیں۔

۲۰۰۷ء میں آپ کی تنقید کی ایک کتاب ''نظم جدید کی کروٹیں'' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں

جدید اردو نظم کے مختلف ادوار کے نامور نظم گو شعراء کو جدید اردو نظم کے حوالے سے پرکھا گیا ہے جیسے اقبال۔۔۔۔۔فطرت پرستی کی ایک مثال،ن۔م۔راشد۔۔۔۔۔۔بغاوت کی ایک مثال،میراجی۔۔۔۔۔ دھرتی پوجا کی ایک مثال،فیض احمد فیض۔۔۔۔۔۔انجماد کی ایک مثال،مجید امجد۔۔۔۔۔۔توازن کی ایک مثال،قیوم نظر۔۔۔۔۔افسردہ دلی کی ایک مثال،راجہ مہدی علی خان۔۔۔۔۔مسرت وبہجت کی ایک مثال،اختر الایمان۔۔۔۔۔مراجعت کی ایک مثال،ضیاء جالندھری۔۔۔۔۔پرآشوب لمحہ کی ایک مثال،بلراج کومل۔۔۔۔۔متحرک لمحہ کی ایک مثال اور آزاد نظم وغیرہ۔

۲۰۰۷ء ہی میں اردو سائنس بورڈ لاہور نے وزیر آغا کی کتاب ''امتزاجی تنقید کا سائنسی وفکری تناظر'' شائع کی۔اسلم حنیف کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ وزیر آغا کی امتزاجی تنقید،کشادگی اور افلاطون سے دریدا تک کے فکری نظاموں کے انجذاب کی لچک،قدیم نظریات نقد ونظر اور ساختیات وپس ساختیات اور ساخت شکنی پر مشتمل جدید لسانی و ادبی تصورات کے محدود مطالعات ہی کا نتیجہ نہیں،یہ نظریات سے متعلق فلکیاتی،نفسیاتی،حیاتیاتی،طبیعاتی،ریاضیاتی اور بشریاتی علوم سے متعلق نئے سائنسی تجربات ومشاہدات کے براہ راست گہرے مطالعوں سے نتائج اخذ کرنے کی فطری صلاحیتوں اور تخلیقی عمل میں ذہنی قوتوں کے پراسرار عوامل کی تفہیم کی آمیزش کا حاصل بھی ہے۔۲۰۰۹ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے وزیر آغا کی تصنیف ''کلچر کے خدوخال'' شائع کی۔ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک اور تنقیدی تصنیف ''اردو ادب میں عورت کا سماجی کردار'' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کی۔

۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کے چند تنقیدی مضامین کو سجاد نقوی نے منتخب کر کے مکتبہ عالیہ لاہور سے شائع کروایا۔۲۰۱۰ء میں طارق حبیب نے ''میراجی بہ حوالہ ڈاکٹر وزیر آغا'' کے عنوان سے وزیر آغا کے چند تنقیدی مضامین منتخب کر کے شائع کئے۔طارق حبیب ہی نے ۲۰۱۰ء میں دوست پبلیکیشنز اسلام آباد سے ڈاکٹر وزیر آغا کے منتخب مضامین ''کشف ذات کی آرزو کا شاعر'' ن م راشد پر ڈاکٹر وزیر آغا کے مقالات شائع کیے۔

وزیر آغا کے مطابق اردو ادب میں انشائیے کے فروغ کے سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ رہی ہے کہ احباب انشائیہ اور سنجیدہ انشائیہ،اصلاحی طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں مشکل ہی سے کوئی حد فاصل قائم کرتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ انشائیہ کے دامن کو اس قدر پھیلا دیتے ہیں کہ رجب علی بیگ سرور اور سر سید احمد خاں سے لے کر رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری تک اس کے دائرے میں سمٹ آتے ہیں حالانکہ وزیر آغا کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ ان تمام لوگوں نے یا تو زندگی کو فراز سے دیکھا ہے یا اسے نشیب سے دیکھا ہے،دوسری طرف انشائیہ نگار ہموار سطح سے زندگی کو دیکھتا ہے اور اپنے موضوع کو طنز ومزاح یا اصلاح کے لیے ایک ذریعہ نہیں

بنا تا بلکہ مثبت انداز میں آگے بڑھ کر موضوع سے مسرت کشید کرتا ہے اور اس عمل کے دوران میں اپنی ذات کے کسی گمنام گوشے کو بھی دائرہ نور میں لے آتا ہے اور وہ سب کچھ ایک ایسے میٹھے ملائم اور مترنم انداز میں کرتا ہے کہ اس کے مضمون میں شعر کی شعریت اور فکر کی جولانی، نفسی انبساط کی ایک زیریں لہر سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ کم از کم ایک مثالی انشائیہ کا مزاج یہی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ میں یہ دعوی تو نہیں کرتا کہ اورق میں جو انشائیے آج تک پیش کیے گئے ہیں، وہ انشائیہ کے اس اعلی و ارفع معیار کے عین مطابق ہیں مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ سب انشائیے کہلانے کے لائق ضرور ہیں، طنزیہ مزاحیہ یا اصلاحی مضامین ہرگز نہیں ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد نے وزیر آغا کے انشائیہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

> جہاں تک انشائی مزاج کا تعلق ہے، سرسید سے بہت پہلے اردو داستانوں میں اس کے ٹکڑے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ سرسید نے اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز کر کے جو تحریریں لکھیں، ان میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مزاحیہ اور انشائی عناصر بھی موجود تھے حتی کہ مقالہ بھی مضمون ہی کہلاتا تھا لیکن بعد میں طنز و مزاح عام مضمون سے علیحدہ ہو گئے اگرچہ سنجیدہ اور استدلالی مضمون میں قائم نہیں ہو سکا۔ وزیر آغا پہلے شخص ہیں جنہوں نے انشائیے کو علیحدہ پہچان دی۔ (٦٧)

سلیم اختر نے وزیر آغا پر بہت تنقید کی ہے۔ انہوں نے وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> پاکستان میں انشائیہ کے فروغ میں وزیر آغا خاصا اہم کردار ادا کر سکتے تھے لیکن ان کا Complex یہ ہے کہ وہ صرف اپنی تکنیک میں لکھے گئے انشائیوں کو ہی انشائیہ مانتے کیونکہ مشتاق قمر اور جمیل آذر نے صرف ان ہی کے رنگ میں لکھا اس لیے وہ تو بہت اچھے انشائیہ نگار ٹھہرے جبکہ نظیر صدیقی (شہرت کی خاطر) اور مشکور حسین یاد کو وہ انشائیہ نگار ہی تسلیم نہیں کرتے حالانکہ اپنے اپنے انداز میں یہ دونوں ہی صاحب اسلوب انشائیہ نگار ہیں۔ مشکور حسین یاد کی ''جوہر اندیشہ'' میں بہت اچھے انشائیے ہیں۔ اسے ہر لحاظ سے ڈاکٹر وزیر آغا پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔ (٦٨)

سلیم اختر کا کہنا ہے کہ اگر وزیر آغا خود پسند نہ ہوتے تو وہ انشائیہ نگاری کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ سلیم اختر مزید لکھتے ہیں کہ:

> یہ ڈاکٹر وزیر آغا کی بدقسمتی ہے کہ تخلیقات انشائیہ کو قدیم سے قدیم تر ثابت کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے جملہ ذرائع ابلاغ استعمال کرتے ہوئے انشائیہ کی بحث کو یوں الجھا دیا اور مختلف انشائیہ نگاروں (جیسے مشکور حسین یاد) کی یوں کردار کشی کی کہ انشائیہ کی اصطلاح ایجاد کرنے کا تاج اپنے سر پر سجانے کا موقع مل جائے حالانکہ تحقیق سے لفظ انشائیہ اور انشائیہ کی صنف کی قدامت واضح ہو جاتی ہے۔ جس زمانہ (۱۹۵۷ء) میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریریں ''ادب لطیف'' میں نثر لطیف، لطیف پارہ یا خیالیے کے عنوان سے چھپتی تھیں اور ہنوز لفظ انشائیہ سے نا آشنا تھے تو اس سے کہیں پہلے ۱۹۴۴ء میں سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کا مجموعہ ''ترنگ'' پٹنہ سے شائع ہو چکا تھا۔ (۶۹)

سلیم اختر کے بیان کے مطابق وزیر آغا نے اپنے آپ کو انشائیہ کا موجد کہلوانے کے لیے باقی تمام دلائل کو رد کر دیا ہے۔ سلیم اختر وزیر آغا کے انشائیہ کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

> ہمارے ہاں مریضانہ خود پسندی کے پیش نظر ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو انشائیہ کی ایجاد کو جب سے اپنے نام سے منسوب کیا ہے تب سے اردو ناقدین اور محققین میں ایسی بحث چھڑ گئی جو اپنی بے معنویت کے باوجود ہنوز جاری ہے۔ ہر زبان میں اصناف کی قدامت کے ضمن میں اس کے اوّلین نقوش اور قدیم ترین مثالیں تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر آغا صاحب اردو میں انشائیہ کی قدامت کے تمام تحقیقی مواد کو محض اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ ان شواہد کی روشنی میں وہ انشائیہ کے موجد نہیں رہتے۔ ادھر محققین ہیں کہ نئے مواد کی روشنی میں انشائیہ کی قدامت ثابت کر کے بالواسطہ طور پر گویا اس موجد کی ایجاد کا بھانڈا پھوڑتے رہتے ہیں۔ (۷۰)

سلیم اختر نے وزیر آغا کو خود پسند اور انا پسند قرار دیا ہے جبکہ ایک انٹرویو میں انشائیہ کے متعلق وزیر آغا سے پوچھے

گئے ایک سوال کے جواب میں وزیر آغا نے کہا کہ:

> میں نے کبھی خود کو اردو انشائیہ کا موجد یا بانی نہیں کہا کیونکہ جو صنف مغرب میں تین سو سال سے پھل پھول رہی ہو، اسے اردو میں رائج کرنا کوئی ایسا اقدام نہیں کہ اس پر کسی کو موجد قرار دیا جائے۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے اردو میں انشائیہ نگاری کی تحریک کو چلایا مگر موجد کے لفظ سے میں الرجک ہوں۔(۷۱)

وزیر آغا کے بیان کے مطابق وزیر آغا نے خود کو انشائیہ کا موجد نہیں قرار دیا۔ وزیر آغا مزید کہتے ہیں کہ:

> اگر انشائیے کو کسی لاہوری ادیب نے اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی ہوتی تو اسے بیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیا جاتا۔ پچھلے دنوں مجھے ایک کرم فرما نے یہ قصہ سنا کر حیران کر دیا کہ جب اس نے ایک بار مخالفین کے سرغنے سے پوچھا کہ وہ انشائیے کے اس قدر خلاف کیوں ہیں تو موصوف نے فرمایا کہ مسئلہ انشائیے کا نہیں، مسئلہ اس شخص کا ہے جس کے نام کے ساتھ انشائیہ منسلک ہو گیا ہے؛ ہم نے اصولی طور پر اس شخص کی ہر بات کی مخالفت کرنی ہے۔(۷۲)

وزیر آغا کے نزدیک انہیں جان بوجھ کر تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کیونکہ ان کا تعلق لاہور شہر سے نہیں بلکہ مضافات سے ہے۔ وزیر آغا نے ایک اور جگہ یوں کہا: ''اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ میں نے کبھی خود کو انشائیے کا بانی نہیں کہا اور کہنا بھی نہیں چاہیے کہ پہلا انشائیہ تو آج سے کئی سو سال پہلے فرانس کے مونتین نے تخلیق کیا تھا اور وہی اس صنف کا بانی ہے۔''(۷۳) اکادمی پنجاب لاہور نے ۱۹۶۱ء میں وزیر آغا کے انشائیہ کا مجموعہ ''خیال پارے'' شائع کیا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> انشائیہ نگاری کی بنیادی شرائط کو وزیر آغا نے خیال پارے میں برتنے کی کوشش کی ہے اور موضوعات اور طرز نگارش دونوں اعتبار سے ان کے یہاں انشائیہ کی روح ملتی ہے، وزیر آغا کے ان مضامین کو جوں جوں پڑھتے جائیں ان جانی بوجھی اور روزانہ کی دیکھی اور آزمائی ہوئی چیزوں کے بارے میں یہ احساس ہوگا کہ ہم انہیں پہلی بار دیکھ

رہے ہیں یا اس سے پہلے ہم نے انہیں اس زاویے سے کیوں نہ دیکھا۔تازگی اور تازہ کاری کا یہ عنصر ان مضامین کا نمایاں وصف ہے۔خیال پارے وزیر آغا کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس میں ان کی انفرادیت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔انشائیہ نگاری کے باب میں ان کی خدمات کا منکر شاید ہی کوئی ہو۔(۷۴)

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کے بارے میں نقطۂ نظر یہ تھا۔مشتاق احمد یوسفی وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:''وزیر آغا کا انشائیہ ان کی رنگا رنگ شخصیت کا عکس جمیل ہے۔ان کی طبیعت میں جو دلآویزی، رچاؤ اور شائستگی ہے، زمین اور اس کے رشتوں کو انہوں نے جس طرح چاہا اور نبھایا وہ ایک اک سطر سے جھلکتا ہے۔''(۷۵)

جدید ناشرین لاہور نے ۱۹۶۶ء میں انشائیوں کا مجموعہ''چوری سے یاری تک'' اور ایک انشائی مجموعہ مکتبہ فکر و خیال لاہور نے''دوسرا کنارہ'' کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔اس کتاب کا پیش لفظ انشائیہ کے خدوخال پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے مغربی اور مشرقی تخلیق کاروں کے حوالے سے انشائیہ کی انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے۔انشائیہ کی ہیئت اور انشائیہ کی وسعت کو زیر بحث لائے ہیں۔یہ کتاب سترہ انشائیوں پر مشتمل ہے۔۱۹۸۹ء میں لاہور ہی سے ایک اور انشائی مجموعہ''سمندر اگر میرے اندر گرے'' شائع ہوا۔آصف ثاقب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:''وزیر آغا انشائیہ کے ایک مخصوص سٹائل کے موجد ہیں۔ان کی تقلید کئی انشائیہ نگار اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ان کی پیروی میں بہت سوں نے اچھے انشائیے رقم کئے ہیں۔(۷۶) آصف ثاقب نے وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کو دوسروں کے لیے قابل تقلید قرار دیا ہے۔عبدالقیوم صاحب لکھتے ہیں کہ:

صنف انشائیہ کا نام سنتے ہی جس شخصیت کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے وہ بلا شبہ وزیر آغا ہیں۔یوں تو اس صنف کے اجزا تقریباً ایک صدی سے اردو کے مضامین میں بکھرے پڑے ہیں لیکن اس صنف کو صحیح خدوخال کے ساتھ اردو میں مروج کرنے کا سہرا وزیر آغا کے سر ہی بندھتا ہے۔صرف انہوں نے ہی انشائیہ کو اردو ادب میں باقاعدہ ایک الگ صنف کے طور پر مقبول عام بنانے میں ستر سے زائد انشائیے لکھے۔(۷۷)

انشائیوں کی کلیات ''پگڈنڈی سے روڈ رولر تک (کل انشائیے ایک جلد میں)''جون ۱۹۹۵ء میں مکتبہ نردبان سرگودھا نے شائع کیا۔اظہار سنز نے ۲۰۱۰ء میں اسے دوبارہ شائع کیا۔۱۹۹۵ء میں اُن کے انشائیوں کا انگریزی ترجمہ Jai Rattan نے کیا۔وزیر آغا کی آخری نثری تخلیق ایک انشائیہ ''دوسرا دن'' کے عنوان سے ہے جسے کاغذی پیرہن کے مارچ اپریل ۲۰۱۱ء کے شمارے میں شامل کیا تھا۔پروفیسر شفیق الرحمان الہ آبادی لکھتے ہیں کہ:''بعض ناقدین کے نزدیک سرسید احمد خاں اردو انشائیے کے بانی ہیں لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول سرسید احمد خاں کے مضامین سے لے کر تقسیم ملک تک لکھے گئے مضامین کے انبار میں کوئی ایسی تحریر موجود نہیں ہے جسے مکمل طور پر انشائیہ کا نام دیا جا سکے۔''(۷۸)

وزیر آغا کی انشائیہ نگاری پر بڑا اعتراض یہی تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار اور بانی قرار دیا اور انشائیہ کی نئی حدود و قیود متعین کر دیں۔بعض ناقدین کا کہنا یہ ہے کہ وزیر آغا خود کو انشائیہ کا بانی کہنا چھوڑیں اور انشائیہ کی حدود خود متعین کرنا بھی چھوڑ دیں اور آج تک جتنے انشائیہ نگار گزر چکے ہیں،ان سب کے مضامین کو انشائیہ کی صف میں شامل کریں چاہے وہ مزاحیہ مضامین ہوں یا طنزیہ ہوں جبکہ وزیر آغا صرف سنجیدہ مضامین کو انشائیہ گردانتے تھے جس سے بعض ناقدین نے اختلاف کیا۔بیشتر ناقدین نے وزیر آغا کے انشائیوں کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ اُن کی انشائیہ نگاری کو سراہا ہے۔

۱۹۹۲ء میں مکتبہ نردبان سرگودھا سے وزیر آغا کا سفر نامہ ''تین سفر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔یہ سفر نامہ چند روز بمبئی میں ۱۹۶۳ء میں،بیس دن انگلستان ۱۹۸۷ء میں اور دو ہفتے سویڈن میں ۱۹۹۴ء پر مشتمل ہے۔کتاب پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ لاہور اور بمبئی کے شعراء و ادباء ایک ہی ہیں۔بمبئی کے گرد و پیش سے واقفیت وہاں کے سینما گھروں کا حال اردو ادب کی ترویج بمبئی کے سفر کے اہم موضوعات ہیں۔انہوں نے بمبئی میں نو دن قیام کیا۔وہاں بہت سے سیمیناروں میں شرکت کی۔وہاں اُن کی ملاقات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ،بلراج کومل،نریندر لوتھر،آل احمد سرور،باقر مہدی،کمار پاشی،قرۃ العین حیدر،محمود ہاشمی،محمد علوی،مجتبیٰ حسین،جوگندر پال ،عصمت چغتائی،راجندر سنگھ بیدی،مظفر حنفی،گوپال متل،فکر تونسوی،فضیل جعفری،وارث علوی،مہدی جعفر اور شمس الرحمٰن فاروقی سے ہوئی۔

اپنے بیٹے سلیم آغا کے بار بار کہنے پر وزیر آغا انگلستان گئے۔''بیس دن انگلستان میں''اسلام آباد سے انگلستان جانے کا سفری حال دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔استنبول میں جہاز کا قیام،ہالینڈ کی فضائی حدود کا تذکرہ،ایمسٹرڈم سے انگلستان تک جہاز کی قلابازیاں دلچسپی کا باعث ہیں۔انگلستان کی ثقافتی ادبی اور علمی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔وہاں اُن کی ملاقاتیں بہت سے ادیبوں سے ہوئیں۔جن ادباء سے اُن کی

ملاقاتیں ہوئیں ان میں قیصر تمکین ،مشیر علوی،محسنہ جیلانی، پرتوروہیلہ،شعور کاظمی،راج کھیتی،آصف جیلانی،جتندر بلو،عباس زیدی،محمود ہاشمی،محسن شمسی،امینہ بیگم وغیرہ شامل ہیں۔اُنہوں نے انگلستان کی اہم تعلیمی وتدریسی درس گاہوں کا بغور مشاہدہ کیا۔وہاں کی لائبریریاں اور میوزیم وغیرہ دیکھے۔ وزیر آغا نے انگریز معاشرے کا بغور مشاہدہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ انگریز جزیرے کا باسی ہے،جس طرح جزیرہ براعظم سے کٹا ہوتا ہے،اسی طرح ہر انگریز بھی دوسروں سے کٹا ہوا ہے۔اس انقطاع نے اس کے ہاں تنہائی کا شدید احساس پیدا کیا ہے۔مشترکہ خاندان کا تصور ناپید ہے اور خاندان اگرچہ چھوٹے ہیں مگر وہ بھی چند سال سے زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہتے۔بچے، بڑے ہوتے ہی الگ ہو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بیشتر لوگوں نے کتے، پرندے، بلیاں اور بعض نے کچھوے اور چوہے تک پال رکھے ہیں جو ان کی تنہائی کے رفیق ہیں۔وزیر آغا لکھتے ہیں کہ میں نے کم از کم ایک درجن انگریز ایسے بھی دیکھے جو پارکوں میں یا سڑک کنارے بہ آواز بلند خود سے گفتگو کرتے اور اپنی چھڑی کو ہوا میں لہرا کر کسی دکھائی نہ دینے والے بھوت کو خود سے پرے رکھنے کی کوشش کر رہے ہوتے حالانکہ غیر ملکیوں کی نظروں میں وہ خود بھی لندن کے ghosts کی حیثیت رکھتے تھے۔

''دو ہفتے سویڈن میں'' اُس سفر کا تذکرہ ہے جس میں وہ سویڈش رائٹرز یونین اور نوبیل کمیٹی کی طرف سے دی گئی دعوت پر سٹاک ہوم گئے۔سویڈش رائٹرز یونین کی دعوت ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ٹیگور کے بعد جنوبی ایشیاء کے یہ دوسرے ادیب تھے جنہیں نصف صدی کے بعد سویڈن آنے کی دعوت دی گئی تھی۔وزیر آغا نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ جب میری نظموں کے انگریزی تراجم سویڈن پہنچے اور وہاں پڑھے گئے تو سویڈش رائٹرز یونین کے پریذیڈنٹ پیٹر کرمین کی طرف سے مجھے ایک دعوت نامہ ملا کہ میں نومبر ۱۹۹۴ء میں یونین کے زیر اہتمام سٹاک ہوم میں منعقد ہونے والی ایک خصوصی تقریب میں جنوبی ایشیا کی نمائندگی کروں۔

۱۹۷۶ء میں مکتبہ عالیہ لاہور نے آپ کی یادنگاری ''شام دوستاں آباد'' کے نام سے شائع کی۔شفیع ہمدم اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> یہ کتاب وزیر آغا کی انوکھی کتاب ہے۔اس کتاب کو سوانح، انشائیہ، خاکہ،تنقید،سیاحت غرضیکہ کسی بھی جانے پہچانے خانے میں قید نہیں کیا جا سکتا گو اس میں ان کی سب پرچھائیاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔کتاب کی اصل اہمیت ایک تو مصنف کے بے مثال اسلوب کے باعث ہے،دوسرے اس لیے کہ اس کتاب میں مصنف

نے شخصیتوں، کتابوں اور تصویروں کا سہارا لے کر اپنی ہی ذات کو
منکشف کیا ہے۔(۷۹)

شفیع ہمدم نے وزیر آغا کی اس تصنیف کو بہت سراہا ہے۔ ہارون الرشید تبسم نے وزیر آغا کی اپنی اس تصنیف کے بارے میں ان کا اپنا بیان لکھا ہے کہ:

> یہ کتاب کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں۔ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ یہ غیر رسمی مضامین جو پچھلے پچیس برس کے دوران میں لمبے لمبے وقفوں سے نازل ہوئے، ایک دن کتابی صورت میں مرتب ہو جائیں گے۔ مگر اب کہ ایسا ہو گیا ہے کہ مجھے لگتا ہے جیسے میرے سامنے تا حد نظر ایک شام دوستاں آباد ہے اور میں جب چاہوں دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اس کے ایوان میں داخل ہو سکتا ہوں اور پھر شام کے باسیوں سے ہم کلام ہونے کی سعادت بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ ان باسیوں میں سے کچھ تو زندہ ہیں ان زندہ لوگوں میں انسانوں کے علاوہ تصویریں اور کتابیں بھی شامل ہیں اور کچھ اس جہان فانی کو چھوڑ کر جا چکے ہیں مگر شام دوستاں میں بڑے التزام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور ہر دم تازہ و شاداب نظر آتے ہیں۔(۸۰)

فکر و فلسفہ پر وزیر آغا کی تصنیف میں ''مسرّت کی تلاش'' جنوری ۱۹۵۴ء کو شائع ہوئی۔ اکادمی پنجاب، لاہور نے یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں پہلی بار شائع کی۔ یہ کتاب وزیر آغا کے تخلیقی عمل کی آئینہ دار ہے۔ اُنہوں نے انسان کے دکھ سکھ، مسرت اور اس کی خواہشات کا تجزیہ نہایت منفرد انداز سے کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسکراہٹ زندگی کا سرمایہ ہے۔ باپ اور بچوں کی مسکراہٹوں سے گھر خوشیوں کا تاج محل بن جاتا ہے۔ متبسم چہرے سے کسی کا استقبال کرنا سنت نبوی ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی لکیریں کسی بھی مریض کے لیے شفا بن جاتی ہیں گویا انسان کسی نہ کسی طور پر مسرت کی تلاش میں رہتا ہے۔ انہوں نے مسرت کی تلاش کو انمول انداز میں پیش کرتے ہوئے بقراط، سقراط، افلاطون، ارسطو، ڈاکٹر محمد اقبال، مارگرٹ پریس کاٹ مانٹیگو، شیلے، ایمرسن، آپٹن سنکلیر، فرائڈ، لن تو ٹانگ، میڈم کوآن، برٹرنڈ رسل، تھامس ہکسلے، ملٹن، جون کیٹس، سور داس، بیتھوون، والٹ وہٹ مین، ہر یکلٹس، بیکن، ڈیکارٹ سپائی نوز، والٹیر لیسنگ، ہابز، بائرن، جون لاک، روسو، کانٹ، جون سٹوارٹ مل، نطشے، شوپنہار، ہیگل، برگساں اور کئی دیگر مفکرین اور فلاسفۂ خصوصی

کا حوالہ دیا ہے۔اُن کی یہ تخلیق جسم، روح، انسانی خواہشات اور انسان کے ذہنی ارتقاء کا ایسا آئینہ ہے جس میں انسان اپنی ریزہ ریزہ خواہشات مجتمع کر کے مسرت کا راستہ تلاش کرتا ہے۔

مکتبہ فکر و خیال لاہور نے جون ۱۹۹۳ء میں ''دستک اس کے دروازے پر'' شائع کی۔اس میں تمثیلی انداز اپنایا گیا ہے۔''تو اور میں'' دو کردار ہیں۔ابواب کی بجائے پہلا دن، دوسرا دن کے عنوانات دیئے گئے ہیں۔کتاب میں کل نو دن کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔وزیر آغا نے اس کتاب میں ہلکی سی ایک دستک عظیم اسرار کے صدر دروازے پر دی ہے۔ان کی یہ کتاب دراصل ایک مکالمہ ہے۔مکالماتی انداز میں بڑے دقیق فکری مسائل کو بڑی آسانی سے بیان کر دیا گیا ہے۔اس کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور باب کے لیے دن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔اپنی اس کتاب کا پیش لفظ بھی وزیر آغا نے خود لکھا ہے۔وہ اپنی ہی تخلیق کے نقاد بھی ہیں۔۱۹۹۰ء میں مکتبہ ہم زبان کراچی نے وزیر آغا کے اوراق کے اداریوں کا مجموعہ شائع کیا۔اس کتاب کے مصنفین حیدر قریشی اور راغب شکیب تھے۔اوراق کے اداریے ''اوراق کے پینتیس سال'' پروفیسر اقبال آفاقی نے اکتوبر ۲۰۰۰ء میں کاغذی پیرہن لاہور سے چھپوائے۔ڈاکٹر سید احسن زیدی نے جنوری ۱۹۹۰ء میں ''وزیر آغا کے دیباچے'' بک پوائنٹ کارنر ہاؤس، بھوانہ بازار، فیصل آباد سے شائع کیے۔

وزیر آغا سے کیے گئے انٹرویوز میں سے اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''مکالمات وزیر آغا سے'' مکتبہ فکر و خیال لاہور سے شائع ہوئی۔شاہد شیدائی اور عابد خورشید نے جولائی ۲۰۱۰ء میں جمہوری پبلیکیشنز لاہور سے ''نئے مکالمات'' کے عنوان سے وزیر آغا کے انٹرویوز شائع کیے۔

انور سدید نے مارچ ۱۹۸۰ء میں ''وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام'' مکتبہ فکر و خیال لاہور سے شائع کی۔اکبر حمیدی نے ''وزیر آغا کے خطوط اکبر حمیدی کے نام'' ۱۹۹۵ء میں بٹر پبلشرز اسلام آباد سے شائع کیے۔رفیق سندیلوی لکھتے ہیں: ''وزیر آغا نے اپنے احباب کو بے بہا خطوط لکھے۔انور سدید کے نام اپنے ایک خط میں انہوں نے خود کو خط لکھنے والی مشین قرار دیا ہے۔''(۸۱)

۱۹۸۲ء میں ''وزیر آغا ایک مطالعہ'' مرتبہ انور سدید مکتبہ اسلوب کراچی سے اُن پر لکھی گئی کتاب شائع ہوئی۔۱۹۸۷ء میں اُن پر لکھی ہوئی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج۔معاصرین کی نظر میں'' مرتبہ سجاد نقوی مکتبہ نردبان سرگودھا سے شائع ہوئی۔۱۹۸۹ء میں مکتبہ فکر و خیال لاہور نے اُن پر لکھی گئی انور سدید کی کتاب ''شام کا سورج'' شائع کی۔۱۹۹۳ء میں مکتبہ نردبان سرگودھا نے ناصر عباس نیر کی اُن پر لکھی گئی کتاب ''دن ڈھل چکا تھا'' شائع کی۔۱۹۹۵ء میں حیدر قریشی نے ''ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت'' کے عنوان سے اُن پر ایک کتاب لکھی۔۱۹۹۶ء میں راولپنڈی سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے وزیر آغا پر کتاب ''وزیر آغا

کی امتزاجی نظریہ سازی'' لکھی۔ ۱۹۹۷ء میں اُن کے کارناموں پر سرگودھا اکیڈمی نے سرگودھا رائٹرز کلب اور سرگودھا آرٹس کونسل کی لکھی ہوئی انگریزی کتاب شائع کی۔ ۱۹۹۷ء میں گل بخشالوی نے وزیر آغا پر ''وزیر آغا اہل قلم کی نظر میں'' کے عنوان سے کتاب لکھی۔ راولپنڈی سے رشید نثار نے ''ڈاکٹر وزیر آغا اور ہمارا عہد'' کے عنوان سے اُن پر ایک کتاب لکھی۔ ارمان نجمی نے ۲۰۰۱ء میں کاغذی پیرہن لاہور سے وزیر آغا پر ایک کتاب ''بیاض شب و روز'' شائع کروائی۔ ۲۰۰۳ء میں اسی مکتبہ نے رفیق سندیلوی کی وزیر آغا پر لکھی گئی کتاب ''امتزاجی تنقید کی شعریات'' شائع کی۔ ۲۰۰۶ء میں رفیق سندیلوی نے اکادمی ادبیات پاکستان سے وزیر آغا پر لکھی گئی کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا فن اور شخصیت'' شائع کروائی۔ عابد خورشید نے ۲۰۰۷ء میں مکتبہ نردبان سرگودھا سے ''وزیر آغا کی بائیس نظمیں'' کے عنوان سے کتاب شائع کروائی۔

وزیر آغا نے نظم کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ رفیق سندیلوی وزیر آغا کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ ان کی غزل یکسانیت کی ماری ہوئی، رائج الوقت غزلوں کے انبار سے مختلف ہے۔ ان کے شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دال اور مدلول کا رشتہ غیر واضح رہتا ہے جس کے سبب مفہوم میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔'' (۸۲) رفیق سندیلوی کے بیان کے مطابق وزیر آغا کی غزل کے موضوعات میں تنوّع پایا جاتا ہے۔ ایک مضمون میں اقتدار جاوید لکھتے ہیں کہ:

> وزیر آغا کی غزلیہ واردات کا ہیرو ایک عام آدمی ہے۔ اس کی عام سی خواہشیں ہیں اور عام سی زندگی ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح روتا ہے، ہنستا ہے، خوش ہوتا ہے اور اپنی اس حالت کو برقرار رکھنے کا متمنی ہے۔ وہ معاشرے کی مرتی ہوئی رگوں میں عزت نفس اور خالص انسانی جوہر انڈیلنے کی خواہش ضرور رکھتا ہے۔ (۸۳)

وزیر آغا نے ہائیکو کو اپنے ادبی مجلّہ ''اوراق'' کے ذریعے کافی فروغ دیا، ہائیکو ایک جاپانی صنف شعر ہے۔ ہائیکو میں کم از کم الفاظ استعمال کر کے اپنا مدّعا بیان کیا جاتا ہے۔ وزیر آغا کے نزدیک ہائیکو نے جدید مغربی شاعری پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں جبکہ اردو نے ابھی تک اس سے کوئی خاص اثرات قبول نہیں کیے حالانکہ اردو میں مختصر نویسی کا رجحان پہلے سے موجود ہے سو ضرورت اس امر کی ہے کہ ہائیکو کے مزاج کو سمجھا جائے اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اسے اردو کی اصنافِ شعر میں شامل کر لیا جائے۔ وزیر آغا ہائیکو کے بارے میں کہتے ہیں:

ہائیکو کا تعلق فطرت سے ہے۔ یہ زمین سے آسمان تک پھیلے ہوئے مظاہر سے منسلک ہو کر اور ایک خاص زاویہ نگاہ کو بروئے کار لا کر، اپنی ایک شعری کائنات تخلیق کرتا ہے۔ اگر اس میں محض نظم، غزل یا دیگر شعری اصناف کے موضوعات پیش کیے جائیں تو یہ اپنی خاص خوشبو اور مزاج سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر یہی کچھ ہوا ہے۔(۸۴)

وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کی معاصرانہ چشمک مشہور ہے۔ معاصرانہ چشمک کی وجہ سے وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے تعلقات اچھے نہ رہے۔ احمد ندیم قاسمی رسالہ ''فنون'' نکالتے تھے جبکہ وزیر آغا رسالہ ''اوراق'' کے مدیر تھے۔ مولانا صلاح الدین کی زندگی میں ان دونوں شخصیات کے تعلقات اچھے تھے۔ خواجہ محمد زکریا کہتے ہیں کہ:

مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے پہلے احمد ندیم قاسمی کے کسی ''مدّاح'' کی طرف سے اس کا آغاز ہوا اور وزیر آغا کے حلقے سے اسی انداز میں اس کا جواب دیا گیا۔ پھر سالہا سال تک ''فنون''، ''اوراق'' اور بعض دوسرے پرچوں میں ایک دوسرے کے خلاف لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ احمد ندیم قاسمی سے بھی میرے خوشگوار تعلقات تھے اور وزیر آغا کی محفلوں میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔ اس دو طرفہ الزامی اور تنقیصی تحریروں سے مجھے تکلیف ہوتی تھی لیکن اس ''جنگ'' سے بعض لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور مشہور ادیب بن بیٹھے۔ مجھے دو تین احباب نے کہا کہ میں صلح کے لیے سلسلۂ جنبانی کروں لیکن میں دونوں بزرگوں کے اندرونی حلقے میں نہیں تھا۔ مجھے اختلافات کی نوعیت بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھی۔ یہ بھی میرے علم میں تھا کہ بعض اہم شخصیات ایسی کوششیں کر چکی ہیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ میں اتنا چھوٹا شخص تھا کہ مجھے اپنی کامیابی کی بالکل امید نہیں تھی، اس لیے میں کڑھتا رہا لیکن عملاً کچھ نہ کر سکا۔(۸۵)

اس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی مخلصانہ کوشش کی گئی ہوتی تو ان دونوں بزرگوں کے اختلافات ختم کیے جا سکتے

تھے۔ڈاکٹر رشید امجد اپنی خودنوشت 'تمنا بے تاب' میں احمد فراز کا قول لکھتے ہیں کہ: ''احمد ندیم قاسمی تو 'اوراق' میں اپنے ادب پارے بھیج دیا کریں گے مگر ''فنون'' وزیر آغا کی چیزیں چھاپ کر اپنا معیار نہیں گرا سکتا۔ یہ بات احمد فراز نے اس موقع پر کہی جب کچھ اہل علم ان دونوں کی آپس میں ناراضی دور کرنا چاہ رہے تھے۔''(۸۶) کچھ اہل علم لوگوں نے اُن کی صلح کرانے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی صلح نہ ہو سکی۔ اگر کوئی دلچسپی سے اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کرتا تو ضرور اس معاملے کو حل کیا جا سکتا تھا۔ آج یہ دونوں ادبی شخصیات اس دنیا میں نہیں رہیں بس ان کا کام باقی رہ گیا ہے کاش ان دونوں میں اختلافات نہ ہوتے تو اردو ادب کو اس سے اور زیادہ فائدہ پہنچتا۔ خواجہ محمد زکریا کے بیان سے یوں لگتا ہے کہ اس ادبی تنازعہ کا آغاز احمد ندیم قاسمی گروہ کی طرف سے ہوا لیکن وزیر آغا گروہ نے اس کا جواب دے کر اس تنازعہ کو آگے بڑھایا۔ پھر بات بڑھتی چلی گئی اور یوں یہ دو ادبی گروہ ایک دوسرے سے دور سے دور تر ہوتے گئے، اگر ان دونوں کے درمیان شروع میں ہی کوئی صلح کروا دیتا تو بہت فائدہ پہنچتا۔

شاہد شیدائی نے کاغذی پیرہن کے مارچ اپریل ۲۰۱۱ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون ''چند حقائق'' میں اس معاملے کے بارے میں لکھا ہے کہ وزیر آغا ایک سادہ اور شریف النفس انسان تھے۔ وہ کسی پر کیچڑ اچھالنے کے قائل نہ تھے۔ وزیر آغا سرگودھا کے ایک دور افتادہ گاؤں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ایک بہترین ادیب کے طور پر ابھرے۔ کچھ لوگ جو کہ مثبت سوچ کے حامل تھے، وزیر آغا سے متاثر ہوئے اور ان کے علم سے فیض یاب ہوتے رہے جبکہ کچھ منفی سوچ کے حامل لوگوں کا ایک ایسی شخصیت کا ابھرنا اچھا نہ لگا اور انہوں نے اُن کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا۔ شاہد شیدائی نے واضح طور پر مجلّہ ''فنون'' کے مدیر کی طرف اپنا اشارہ کیا ہے بلکہ اپنے مضمون میں بار بار اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ مجلّہ ''فنون'' کے مدیر اور بعض مصنفین نے وزیر آغا مخاصمت کا کھلا ثبوت بھی دیا ہے۔ مزید یہ بھی لکھا ہے کہ مخالفین کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے اور انہوں نے یہاں تک مشہور کر رکھا تھا کہ وزیر آغا ایک جاگیردار ہیں اور مغرور انسان ہیں جاگیرداری نے ان کو مغرور بنا دیا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ایک بار وزیر آغا سے مل لیتا وہ ان کا دم بھرتا۔ اس سلسلے میں شاہد شیدائی نے کچھ مثالیں بھی دی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ وزیر آغا کوئی جاگیردار نہ تھے۔ اُن کے پاس اپنے والد کی چھوڑی کچھ زمین تھی جو ان کے والد نے بہت محنت کر کے حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ مزید لکھتے ہیں کہ جب مجلّہ ''فنون'' نے حد سے تجاوز کیا تو وزیر آغا نے بھی اپنے مجلّہ ''اوراق'' میں احمد ندیم قاسمی کے بارے میں کچھ مضامین شائع کیے جس کی اشاعت پر مجلّہ ''فنون'' کے مدیر اور ان کے مریدین میں غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ احمد ندیم قاسمی ہر جگہ ان مضامین کا حوالہ دے کر وزیر آغا کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ شاہد شیدائی نے لکھا ہے کہ قاسمی

صاحب خود ہر جگہ اپنی اچھائیاں گنواتے رہتے ہیں اور وزیر آغا کو ہر جگہ بدنام کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں حالانکہ اب تو ان کے اپنے گروہ کے کئی لوگ ان کے خلاف بیانات دے رہے ہیں جیسا کہ حمید اختر جن کے بقول مدیر ''فنون'' نے اپنے آپ کو فیض کے مقابلے میں نہایت بونا ثابت کر دکھایا ہے (روزنامہ دن، ۲۱ مارچ ۲۰۰۱ء)۔ جبکہ عبداللہ ملک نے مدیر ''فنون'' کے بارے میں کہا کہ وہ نہایت کم علم اور حسد، جلن اور تعصب کا مارا شخص ہے (نوائے وقت، ۳۰ مارچ اور ۱۵ اپریل ۲۰۰۱ء)۔ اس کے علاوہ ترقی پسند شاعر بخش لائل پوری نے کہا کہ فیض صاحب کی شاعری اور ان کے شعری مقام کے بارے میں وقت اپنا فیصلہ دے چکا ہے، اس فیصلے کو بدلنا مدیر ''فنون'' کے بس کی بات نہیں (نوائے وقت، ۱۳ اپریل ۲۰۰۱ء)۔ شاہد شیدائی نے مزید لکھا کہ مدیر ''فنون'' کہتے ہیں کہ ''اوراق'' نے ان پر ایک عرصے سے غلاظت اچھالنا شروع کی ہوئی ہے حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے بقول شاہد شیدائی اوراق کے اجراء سے قبل ہی ''فنون'' میں وزیر آغا کے خلاف تین مضامین شائع ہو چکے تھے۔ ان میں سے دو مضامین عمیق حنفی کے تھے جن کا لہجہ طنز و استہزا کا حامل تھا۔ تیسرا مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ کا تھا جس میں وزیر آغا پر دراوڑیت پھیلانے کا الزام لگایا گیا تھا جبکہ ''اوراق'' کا اجرا ہونے کے بعد فتح ملک محمد کا ایک مضمون وزیر آغا کو موصول ہوا جس میں مدیر ''فنون'' کو فیض سے بڑا شاعر ثابت کرنے کے بارے میں کچھ مواد تھا۔ وزیر آغا نے وہ حصہ حذف کر کے باقی مضمون اوراق میں شائع کیا۔ اس پر فتح محمد ملک نے ناراضی کا اظہار کیا اور اپنا ایک مضمون ''فنون'' سے وزیر آغا کے خلاف شائع کروایا۔ اس کے بعد رشید ملک نے رسالہ ''فنون'' میں وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' کے خلاف ایک سلسلہ وار مضامین کا آغاز کیا جس میں خوب طنز و استہزا کا استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد حامد بیگ کا ایک مضمون شائع کیا گیا جس میں وزیر آغا پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ شاہد شیدائی نے مزید لکھا کہ اور تو اور مدیر ''فنون'' کے دست راست ''معاصر'' نے بھی وزیر آغا کے خلاف دو مضامین شائع کیے۔ ایک مضمون رشید ملک کا تھا جس کا لہجہ انتہائی قابل اعتراض تھا اور دوسرا ساقی فاروقی کا تحریر کردہ تھا جس میں وزیر آغا کو ننگی گالیاں نکالی گئی تھیں (۸۷) ڈاکٹر پرویز پروازی نے اپنے ایک مضمون میں ساقی فاروقی کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

> ساقی فاروقی کا بدنام زمانہ مضمون سامنے آیا جس میں انہوں نے وزیر آغا کی شاعری کو طنز و تعریض کا نشانہ بنایا تھا اور جس کا لب و لہجہ نہایت مبتذل اور غیر شائستہ تھا۔ میں ان دنوں (جب ساقی نے یہ مضمون لکھا تھا) لندن تھا۔ ساقی کو میری لندن میں موجودگی کا علم ہوا تو اس نے مجھے دعوت پر مدعو کیا۔ وہاں اس نے ساری رنجشیں دھو ڈالیں۔ جہاں

تک میں جانتا ہوں اس کے بعد ساقی فاروقی کے وزیر آغا سے
تعلقات اچھے ہو گئے اور ان کی آپس میں خط و کتابت بھی ہوتی
رہی۔(۸۸)

ڈاکٹر پرویز پروازی کے بیان کے مطابق ساقی فاروقی کے وزیر آغا سے تعلقات اچھے ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے دوبارہ کبھی وزیر آغا کے خلاف نہیں لکھا۔ پروفیسر زہیر کنجاہی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

لاہور میں آغا صاحب کے آنے کے بعد ادباء اور شعراء کے دو گروپ
تشکیل پا گئے تھے۔ایک وزیر آغا گروپ اور دوسرا احمد ندیم قاسمی
گروپ۔مگر آج تک احمد ندیم قاسمی تو دور کی بات ہے وزیر آغا نے
ان کے گروپ کے نمائندہ فنکار کو بھی کبھی برا نہیں کہا جس کا نتیجہ یہ ہے
کہ آج سب ہی انہیں اچھے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔(۸۹)

زبیر کنجاہی نے وزیر آغا گروپ کو احمد ندیم گروپ سے بہتر قرار دیا کیونکہ ان کے مطابق وزیر آغا نے کبھی قاسمی صاحب کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا حالانکہ قاسمی صاحب کا رویّہ اس کے برعکس ہے۔رشید امجد احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

قاسمی صاحب نے اپنی گفتگو سے کبھی متاثر نہیں کیا۔ان کے منہ سے
لطیفے ہی اچھے لگتے ہیں علمی بات کم ہی سنی۔اس کے برعکس وزیر آغا سے
جب بھی ملاقات ہوتی ہے لطف آجاتا ہے۔ہر بار جب ملتے تو میں
پوچھتا ''آغا صاحب اس دوران آپ نے کیا پڑھا ہے۔'' آغا
صاحب شروع ہو جاتے اور احساس ہی نہ ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا
ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن جتنا مطالعہ ادیب ہمارے عہد میں
کوئی دوسرا نہیں۔(۹۰)

رشید امجد نے وزیر آغا کو احمد ندیم قاسمی پر برتری دی شاید اس لیے کہ وہ وزیر آغا کے حامیوں اور دوستوں میں سے ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی اپنے ایک خط میں ساقی فاروقی کو وزیر آغا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

میں وزیر آغا کو بہت عمدہ شاعر نہیں سمجھتا۔۔۔عجز نظم، مصرعے/شعر کے
آہنگ میں نقص/حکم، پورے مصرعے کی لفظیات کے لنگڑے پن
وغیرہ پر صَرف کی جائے۔پھر وزیر آغا کے یہاں stereo type

اور رسمی بیانات کی کثرت ہے اور قدم قدم پر تخیل کی ناکامی کا احساس
ہوتا ہے۔(۹۱)

شمس الرحمٰن نے وزیر آغا کو اچھا شاعر ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کے نزدیک وزیر آغا کی شاعری میں بہت سے نقائص موجود ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

تم سالے ناراض تو نہ ہو گے لیکن بدمزہ ضرور ہو گے لیکن یہ بھی سوچو کہ وزیر آغا کتنا بدمزہ ہوا ہوگا۔ اس کی ساختیات والی بکواسیات پر اور راور تُو والی مزخرفات پر سخت تنقید ہونی چاہیے تھی نہ کہ اس کی شاعری پر لیکن بکواسیات اور مزخرفات پر تنقیدات کے لیے فرصت نہ تمھیں ہے نہ مجھے۔(۹۲)

شمس الرحمٰن نے اس خط میں وزیر آغا پر بہت کیچڑ اچھالا ہے۔ ساقی فاروقی کی کتاب ''ہدایت نامہ شاعر'' میں موجود مضمون ''نابالغ شاعری کی ایک مثال۔۔۔وزیر آغا'' میں وزیر آغا کی شاعری پر سخت تنقید بلکہ تنقیص کی گئی ہے۔ اس مضمون میں جتنا مذاق وزیر آغا کی غزلیہ کلیات ''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' کا اڑایا گیا ہے شاید ہی کسی اور نے وزیر آغا پر اتنے سخت الفاظ میں تنقید کی ہو۔ اسی مضمون میں ایک جگہ ساقی فاروقی نے لکھا ہے کہ: ''دوسروں کے اچھے اچھے مصرعے اور شعر دیکھ کر کیا آپ کے دل میں کبھی یہ ہوک نہیں اٹھتی کہ ''کاش میں بھی کسی دن کوئی اچھا مصرعہ یا شعر کہوں'' (۹۳) ساقی فاروقی کا یہ مضمون پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وزیر آغا شاعری سے بالکل نابلد ہیں لیکن وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ساقی فاروقی نے اسی کتاب میں اپنے ایک مضمون ''ایک ندیم کی مدافعت میں'' میں ان دونوں بزرگوں کے درمیان سرد جنگ کو ختم کرنے پر زور دیا ہے اور ساقی نے وزیر آغا کو نصیحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

اپنے دوست ڈاکٹر وزیر آغا سے مزید کہتا ہوں کہ آغا صاحب یہ نہ بھولیے کہ قاسمی صاحب آپ سے طبع عمر میں بھی بڑے ہیں اور ادبی عمر میں بھی۔ پہل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر آخری کوشش ناکام رہے تو بھی یہ قلق تو نہیں ہو گا کہ آپ کی طرف سے کوتاہی ہوئی۔(۹۴)

ساقی کا یہ مضمون پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ ان دونوں بزرگوں کی چشمک سے ناخوش تھا اور اس کی چاہت تھی کہ ان کے درمیان صلح ہو جائے۔ سلیم اختر بھی وزیر آغا پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''وزیر آغا کی طرح نہیں کہ گھر

بیٹھ کر جو خطوط انور سدید کو لکھے ان میں اپنی دانست میں ایک نئی ''غبار خاطر'' تخلیق کرنے کی کوشش کی لیکن پلپلے اسلوب کی بناء پر یہ خطوط ''بار خاطر'' ثابت ہوتے ہیں۔''(۹۵) سلیم اختر وزیر آغا کے سخت حریف کے طور پر نظر آتے ہیں اور وہ وزیر آغا پر تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے۔ وزیر آغا بھی ایک جگہ سلیم اختر کے بارے میں کچھ یوں لکھتے ہیں: ''سلیم اختر بہت ambitious تھے اور جلد از جلد اپنے لیے ادب کے میدان میں کوئی ''مقام'' بنانے کے لیے کوشاں تھے اس مقصد کے لیے انھوں نے اوراق کو بطور زینہ استعمال کیا اور مدیرانِ اوراق نے بھی اس سلسلے میں اُن کی بھرپور معاونت کی۔''(۹۶) اس حوالے سے رشید امجد ایک اور زاویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ادبی صفحوں میں ادبی سیاست اور گروہ بندی کا آغاز ادبی صفحات سے ہوا۔ ادبی صفحوں کے مرتبین دفعتاً زمین سے آسمان پر پہنچ گئے۔ ادبی صفحوں نے نہ صرف شہرت کی ایسی چکا چوند پیدا کی جس نے آنکھیں خیرہ کر دیں بلکہ شخصی ادبی سیاست کی ایسی دلدل پیدا کی جس نے بہت سے اچھے لکھنے والوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیا۔ قاسمی، وزیر آغا چپقلش میں بھی انہی ادبی صفحوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے سنسنی پیدا کرنے کے لیے اختلافات کو ہوا دی۔(۹۷)

پروفیسر جلیل عالی نے بھی اس معاملے پر اپنے ایک مضمون میں دو واقعات کا ذکر کیا ہے۔ پہلے واقعے میں وہ بتاتے ہیں کہ میں نہیں جانتا تھا کہ اِن دو احباب کا کوئی جھگڑا ہے، مَیں نے قاسمی صاحب سے ''فنون'' کے دفتر میں آغا صاحب کی کتاب ''تخلیقی عمل'' کی تعریف کی تو وہاں موجود تمام لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''میں نے محسوس کیا کہ وہاں بیٹھے ہوئے احباب کے چہروں کے رنگ متغیر ہوئے مگر میں نے ندیم صاحب کے چہرے پر ایسی کوئی پرچھائیں نہیں دیکھی۔''(۹۸) دوسرے واقعے میں وہ کہتے ہیں کہ ایک مشاعرے میں غلام جیلانی اصغر نے اُن دونوں بزرگوں کو صلح کرنے کی درخواست کی تو اس پر دونوں احباب کا ردِّعمل کچھ یہ تھا: ''اس پر وزیر آغا صاحب کھڑے ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے کہ احمد ندیم قاسمی میرے بڑے بھائی ہیں، احمد ندیم قاسمی کی طرف بڑھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی بڑی محبت کے ساتھ انہیں گلے لگایا۔''(۹۹) پروفیسر جلیل عالی کے واقعات پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان کوئی خاص ناراضی نہ تھی۔ پروفیسر فتح محمد ملک اپنے ایک مضمون میں اس معاصرانہ چشمک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ڈاکٹر وزیر آغا کے مضمون بعنوان ''اردو نظم میں دھرتی پوجا کی ایک مثال۔۔۔۔۔ میرا جی'' پر ''فنون'' میں

چند تنقیدی مباحث نے ڈاکٹر صاحب کو ندیم صاحب سے ناراض کر دیا تھا۔''(۱۰۰) یہاں رشید امجد کے اس بیان پر بحث ختم کی جا سکتی ہے:

> وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے درمیان جو چپقلش ہوئی، اُس میں اِن دونوں بزرگوں کا تو جو رویّہ تھا سو تھا لیکن اس لڑائی سے فائدہ اٹھا کر کئی چھوٹے لوگوں نے وہ گند اُچھالا کہ لکھنوی دور کی لڑائیاں بھول گئیں۔شاہ سے بھی زیادہ شاہ کی وفاداری کرنے والوں نے گمنام نظموں، پمفلٹوں، جملے بازیوں سے فضا کو ایسا مکدّر کیا کہ اب اس کا ذِکر کرتے ہوئے بھی حجاب دامن گیر ہوتا ہے۔میرے خیال میں اس لڑائی کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ یہ کوئی نظریاتی لڑائی نہ تھی۔یہ سارا کھیل اُن لوگوں کا تھا جو ''فنون'' اور ''اوراق'' میں جگہ بنانا چاہتے تھے۔کئی سنجیدہ لوگوں نے کوشش بھی کی کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے اور یہ دونوں بزرگ اس پر آمادہ بھی ہو گئے لیکن ان کے دوستوں کو یہ صلح پسند نہ آئی۔(۱۰۱)

یوں لگتا ہے کہ دونوں گروہ مراد احمد ندیم قاسمی گروہ اور وزیر آغا گروہ اپنے آپ کو اچھا کہتے ہیں جبکہ مخالف گروہ کو غلط متصوّر کرتے ہیں۔اگر وزیر آغا کے حامیوں کے بیانات پڑھے جائیں تو لگتا ہے کہ وزیر آغا فرشتہ صفت انسان تھے جبکہ وزیر آغا کے مخالفین کے بیانات سے یوں لگتا ہے کہ وزیر آغا ادیب کہلانے کے حقدار ہی نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود وزیر آغا نے اردو ادب کے فروغ کے لیے بے پناہ کام کیا ہے اور ان کے اردو نظم و نثر پر بے پناہ احسانات اور اثرات ہیں۔آج وزیر آغا اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن وہ اپنے ادبی شاہکاروں اور خدمات کے باعث اردو دنیا کے اہم ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔وزیر آغا، شام کی منڈیر سے، اظہار سنز، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴، ۱۵

۲۔طارق حبیب، ''ڈاکٹر وزیر آغا: بنیادی معلومات'' مشمولہ رسالہ سہ ماہی اسالیب، مدیر: ذوالفقار احسن، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۹

۳۔ذوالفقار احسن، ''ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک مکالمہ'' ایضاً، ص ۱۲۴

۴۔ہارون الرشید تبسم، آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا، نقش گر، راولپنڈی، طبع اوّل، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۹

۵۔پرویز پروازی، ''گیاہِ بندش'' مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، مدیر: شاہد شیدائی، مکتبہ کاغذی پیرہن، لاہور، مارچ، اپریل ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۶

۶۔طارق حبیب، ''ڈاکٹر وزیر آغا: بنیادی معلومات، ص ۹

۷۔وزیر آغا، شام کی منڈیر سے، ص ۲۲

۸۔ایضاً، ص ۲۱

۹۔ایضاً، ص ۲۶، ۲۷

۱۰۔انور سدید، ''حرف آغاز'' مشمولہ وزیر آغا کی نظم نگاری، مرتب: محسن عباس، ڈاکٹر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۹

۱۱۔رشید امجد، جمیل آذر، انجم نیازی، ''وزیر آغا سے ایک ملاقات'' مشمولہ نئے مکالمات، مرتبین: شاہد شیدائی، عابد خورشید، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴

۱۲۔وزیر آغا، ''نروان'' مشمولہ سہ ماہی تجدید نو، ڈاکٹر وزیر آغا نمبر، لاہور، مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۷۳

۱۳۔ایضاً، ص ۲۷۵

۱۴۔انور سدید، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر وزیر آغا کی یاد میں'' مشمولہ روزنامہ ایکسپریس، فیصل آباد، ۲۸ مئی ۲۰۱۵ء، ص ۱۳

۱۵۔پرویز پروازی، ''گیاہِ بندش'' مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، مدیر: شاہد شیدائی، ص ۱۰۶

۱۶۔ارمان نجمی، ''ایک ہمہ جہت شخصیت'' مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، مدیر: شاہد شیدائی، ص ۷۰

۱۷۔ شفیع ہمدم، ''وزیر آغا بطورِ خاکہ نگار'' ایضاً، ص ۸۵
۱۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، طبع انتیس، ۲۰۰۹ء، ص ۵۴۷
۱۹۔ محمود احمد اسیر، ڈاکٹر، مولانا صلاح الدین احمد احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۵
۲۰۔ ایوب جوہر، ''وزیر آغا سے چند گزارشات'' مشمولہ نئے مکالمات، مرتبین: شاہد شیدائی، عابد خورشید، ص ۸
۲۱۔ شفیع ہمدم، ''وزیر آغا بطورِ خاکہ نگار'' مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، مدیر: شاہد شیدائی، ص ۸۴۔۸۵
۲۲۔ ایضاً، ص ۸۵
۲۳۔ رشید امجد، جمیل آذر، انجم نیازی، ''وزیر آغا سے ایک ملاقات'' مشمولہ نئے مکالمات، مرتبین: شاہد شیدائی، عابد خورشید، ص ۱۵
۲۴۔ مشکور علی، ''وزیر آغا سے ایک ملاقات'' مشمولہ نئے مکالمات، مرتبین: شاہد شیدائی، عابد خورشید، ص ۱۶۱
۲۵۔ وزیر آغا، شام کی منڈیر سے، ص ۴۷
۲۶۔ ایضاً، ص ۷۵
۲۷۔ ایضاً، ص ۹۶
۲۸۔ خواجہ محمد زکریا، ''وزیر آغا کے ذہنی آفاق'' مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، مدیر: شاہد شیدائی، ص ۵۳
۲۹۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ص ۴۴
۳۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم، مئی ۲۰۰۷، ص ۱۲۸، ۱۲۹
۳۱۔ مشکور علی، ''وزیر آغا سے ایک ملاقات'' مشمولہ نئے مکالمات، مرتبین: شاہد شیدائی، عابد خورشید، ص ۱۵۳
۳۲۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ص ۱۵۷
۳۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص ۱۷۰، ۱۷۱
۳۴۔ ایضاً، ص ۱۲۲
۳۵۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ص ۵۳ تا ۶۴
۳۶۔ شفیع ہمدم، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔ چند یادیں، چند باتیں'' مشمولہ سہ ماہی تجدیدِ نو، لاہور، مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۴۷
۳۷۔ سجاد نقوی، ''آغا صاحب'' ایضاً، ص ۳۷ تا ۴۷
۳۸۔ غلام جیلانی اصغر، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔ ذاتی تعلق کی ایک جہت'' ایضاً، ص ۲۶ تا ۳۳

۳۹۔وزیر آغا سے انٹرویو،''نوائے وقت، لاہور'' مشمولہ نئے مکالمات، ص۱۰۶

۴۰۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص۵۷۸

۴۱۔خواجہ محمد زکریا، ''وزیر آغا کے ذہنی آفاق''، ص۵۵

۴۲۔ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا، ص۱۳۶

۴۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، ص۲۱۵

۴۴۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص۶۴۳

۴۵۔صابر لودھی، ''گھاس میں تتلیاں (خصوصی مطالعہ)'' مشمولہ سہ ماہی رسالہ تجدید نو، لاہور، مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص۱۱۰

۴۶۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص۶۶۰

۴۷۔ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا، ص۱۵۳

۴۸۔وزیر آغا سے انٹرویو،''نوائے وقت، لاہور'' مشمولہ نئے مکالمات، ص۱۱۰

۴۹۔ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا، ص۲۱۰

۵۰۔ایضاً، ص۲۲۳، ۲۲۴

۵۱۔احمد صغیر صدیقی، ''دیکھ دھنک پھیل گئی۔۔۔ایک تاثر'' مشمولہ سہ ماہی رسالہ تجدید نو، مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز، ص۱۴۱

۵۲۔ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا، ص۲۴۲، ۲۴۳

۵۳۔ایضاً، ص۲۴۷

۵۴۔شاہد شیدائی، ''وزیر آغا کی یاد میں'' مشمولہ سہ ماہی رسالہ تجدید نو، مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز، ص۶۷

۵۵۔عمران نقوی، ''آغا صاحب سے ایک انٹرویو'' مشمولہ نئے مکالمات، ص۱۸۴

۵۶۔محمد رفیع ازہر، ''تنقیداتِ وزیر آغا کی اجتہادی جہت'' مشمولہ سہ ماہی رسالہ تجدید نو، مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز، ص۹۹

۵۷۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص۵۵۰

۵۸۔ڈاکٹر جمال اویسی، ''وزیر آغا۔۔۔ایک سربرآوردہ نقاد'' مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، ص۶۵

۵۹۔خالد فتح محمد، ''وزیر آغا کی دو اہم کتابیں'' ایضاً، ص۸۹

۶۰۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص۵۵۰

۶۱۔شاہد شیدائی، ''وزیر آغا کی یاد میں''مشمولہ سہ ماہی رسالہ تجدید نو،ص ۶۹
۶۲۔رشید امجد،جمیل آذر،انجم نیازی،''وزیر آغا سے ملاقات''مشمولہ نئے مکالمات،مرتبین: شاہد شیدائی،عابد خورشید،ص ۱۹
۶۳۔وحید قریشی،ڈاکٹر،''ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔میری نظر میں''مشمولہ سہ ماہی رسالہ تجدید نو،مدیران: عذرا اصغر،شبہ طراز،ص ۳۴
۶۴۔ہارون الرشید تبسم،ڈاکٹر،آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا،ص ۱۶۲
۶۵۔ایضاً،ص ۱۸۲،۱۸۳
۶۶۔ایضاً،ص ۱۸۵
۶۷۔رشید امجد،ڈاکٹر،''وزیر آغا کی انشائیہ نگاری''مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن،ص ۳۵
۶۸۔سلیم اختر،ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،ص ۵۳۱۔۵۳۲
۶۹۔ایضاً،ص ۵۲۷۔۵۲۹
۷۰۔ایضاً،ص ۱۳۶
۷۱۔رشید امجد،جمیل آذر،انجم نیازی،''وزیر آغا سے ایک ملاقات''مشمولہ نئے مکالمات،ص ۲۷
۷۲۔حیدر قریشی،''وزیر آغا سے کچھ باتیں''ایضاً،ص ۶۷
۷۳۔خالد اقبال،عابد خورشید،''انشائیے کے حوالے سے چند سوالات''ایضاً،ص ۱۹۷
۷۴۔خلیل الرحمٰن اعظمی،ڈاکٹر،بحوالہ ہارون الرشید تبسم،آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا،ص ۱۴۹،۱۵۰
۷۵۔مشتاق احمد یوسفی،بحوالہ ہارون الرشید تبسم،آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا،ص ۱۴۹
۷۶۔آصف ثاقب،''دیا مجبور تھا جلتا رہا''مشمولہ سہ ماہی رسالہ تجدید نو،مدیران: عذرا اصغر،شبہ طراز،ص ۹۴
۷۷۔عبدالقیوم،''وزیر آغا کے منفرد انشائیے''ایضاً،ص ۱۷۴
۷۸۔شفیق الرحمٰن الہ آبادی،''ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت انشائیہ نگار''ایضاً،ص ۱۸۴
۷۹۔شفیع ہمدم،''شام دوستاں آباد''مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن،ص ۸۶
۸۰۔ہارون الرشید تبسم،ڈاکٹر،آفتاب ادب: ڈاکٹر وزیر آغا،ص ۱۹۶،۱۹۷
۸۱۔رفیق سندیلوی،ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات،اسلام آباد،طبع اوّل،۲۰۰۶ء،ص ۱۵
۸۲۔ایضاً،ص ۴۵
۸۳۔اقتدار جاوید،''عنبر سارا''سہ ماہی رسالہ تجدید نو،مدیران: عذرا اصغر،شبہ طراز،ص ۱۶۸

۸۴۔مشکور علی، ''وزیر آغا سے ایک ملاقات''مشمولہ نئے مکالمات،ص ۱۵۹

۸۵۔خواجہ محمد زکریا، ''وزیر آغا کے ذہنی آفاق''مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن،ص ۵۴

۸۶۔رشید امجد، ڈاکٹر،تمنا بے تاب، پورب اکادمی، اسلام آباد،طبع دوم،مئی ۲۰۰۷،ص ۱۲۲

۸۷۔شاہد شیدائی، ''چند حقائق''مشمولہ کاغذی پیرہن،ص ۴۸ تا ۵۰

۸۸۔پرویز پروازی، ''گیاہ بندش''ایضاً،ص ۱۰۹

۸۹۔زبیر کنجاہی، ''اردو کا مہاتما''ایضاً،ص ۶۳

۹۰۔رشید امجد، ڈاکٹر،تمنا بے تاب،ص ۱۲۰

۹۱۔شمس الرحمٰن فاروقی بنام ساقی فاروقی مشمولہ کتابی سلسلہ کولاژ 2، مدیران: اقبال نظر، شاہدہ تبسم، کولاژ پبلیکیشنز کراچی، سن ندارد،ص ۱۶۸۔۱۶۹

۹۲۔شمس الرحمٰن فاروقی بنام ساقی فاروقی، ایضاً،ص ۱۶۹

۹۳۔ساقی فاروقی، ہدایت نامہ شاعر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء،ص ۲۸

۹۴۔ایضاً،ص ۱۹۱

۹۵۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،ص ۶۵۹

۹۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے،ص ۱۷۳

۹۷۔رشید امجد، ڈاکٹر،تمنا بے تاب،ص ۱۲۹

۹۸۔پروفیسر جلیل عالی، ''ڈاکٹر وزیر آغا: ہشت پہلو شخصیت''مشمولہ ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۲۷

۹۹۔ایضاً،ص ۲۷

۱۰۰۔فتح محمد ملک، پروفیسر، ''احمد ندیم قاسمی: معاصرانہ چشمک''مشمولہ معیار ۵، سن ندارد، شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد،ص ۲۹۲

۱۰۱۔رشید امجد، ڈاکٹر،تمنا بے تاب،ص ۱۲۱،۱۲۲

باب دوم

جدید اردو نظم اور وزیر آغا کی نظم نگاری

جدید نظم: تصور وارتقا

انگریزی لفظ ''ماڈرن'' کا اُردو معنیٰ ''جدید'' ہے۔ یہ لفظ قدیم کا متضاد ہے۔ جدید کے لُغوی معنیٰ ''نیا''، ''تازہ''، ''حال کا'' وغیرہ ہیں۔ زمانے کے لحاظ سے جدید وہ دور ہے جو موجود ہے۔ جدید شاعری یا نظم نگاری سے مراد وہ شاعری ہے جو اپنے زمانے ،ذہن، مزاج اور شعور کے اعتبار سے نئے خیالات، تصوّرات، زبان، تکنیک اور ہیئت کے مطابق ہو۔ اگر کوئی شاعر احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے تو وہ نیا شاعر کہلاتا ہے۔ جدید شاعری ایسی شاعری ہوتی ہے جو متحرّک ہو اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلے۔ جابر علی سید لکھتے ہیں: ''جدیدیت کوئی دائمی اور قطعی تصوّرِ فن نہیں ہے۔ جدیدیت پیراڈاکس ہے جدید وہ ہے جو کل گزر چکا ہے۔ کل کا جدید آج کا قدیم ہے اور آج کا جدید کل کے لیے قدیم ہو گا۔''(۱)

جدید اردو ادب کا باقاعدہ آغاز اُنیسویں صدی میں ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اردو ادب میں کلاسیکی رنگ ختم ہوا اور جدید رنگ تیزی سے اُبھرنا شروع ہوا۔ شاذیہ ناہید شفاعت لکھتی ہیں کہ: ''انقلابِ ۱۸۵۷ء کے اثرات سے شعرا نے تخیّلاتی اور طلسماتی دنیا سے منہ پھیر لیا اور حبّ الوطنی، حقیقی و واقعاتی اور قوم پرستی کے جذبات سے سرشار شعرا کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ یہیں سے نظم جدید کا آغاز ہوتا ہے۔''(۲) برصغیر کی سرزمین پر جنگِ آزادی ہی وہ واقعہ ہے، جس نے یہ سب کچھ کیا اور اُسی کے نتیجے میں ادبی فضا بھی متاثر ہوئی۔ جہاں غزل کا بول بالا تھا وہاں نظم کو رواج ملا۔ اس سے پہلے اردو شاعری میں تجربے کی روایت فارسی اور عربی جبکہ بعد ازاں انگریزی اور کسی حد تک علاقائی ادب سے لی گئی ہیئتوں پر مشتمل ہے۔ انگریزی ادب کے تحت اردو شاعری میں ہیئتوں کے تجربات کو جدید نظم نگاری کا آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ نئی شاعری اب محض آزاد نظم کے

مترادف نہیں سمجھی جاتی ،اس کی متعیّن اور سکہ بند ہئیت ہے اور نہ اس کا بندھا ٹکا اسلوب، پابند، نیم پابند، معرّی، آزاد ہر طرح کے اسالیب میں نئی جہتیں پیدا ہوئی ہیں اور نئی حسیت نے ان میں تازگی پیدا کی ہے۔صاف ظاہر ہے کہ جدید شاعری کا مقصد اظہار اور اظہار کی آزادی تھا۔وہ ہر اُس پابندی کو خارج کر دینا چاہتے تھے جو اظہار کی آزادی سلب کرنا چاہتی ہو۔جدید نظم میں اُس خاص دور کا کرب موجود ہونا ضروری ہے۔انجم اعظمی نے لکھا ہے:''آج شعرِ جدید کے معنی آزاد اور معرّی نظم ہے جس کی تخلیق میں اس دور کے کرب کا ہاتھ ہو۔''(۳)

بعض ناقدین نے جدید اردو نظم کا آغاز نظیر اکبر آبادی سے کیا ہے۔اُن کی مخمّس و مسدّس وغیرہ جیسی ہئیتوں پر مشتمل گوناگوں موضوعات کی حامل نظم نگاری بدلتے ہوئے ہندوستانی سماج کا پتہ دیتی ہے۔نظیر اکبر آبادی عوام کا شاعر تھا کیونکہ اُس کی ساری شاعری عوام کے مسائل سے متعلق ہے۔اس کے علاوہ وہ فطرت پرست شاعر بھی کہلاتا ہے۔وہ مناظر کی مصوّری کرتا دکھائی دیتا ہے۔اُس کی مثنوی ''سیر دریا'' میں فطرت کی عمدہ منظر نگاری ہے۔نظیر سے قبل فطرتی مناظر کو شاعری کا حصّہ نہ بنایا گیا یا یوں کہہ لیں کہ نہ ہونے کے برابر اسے اردو شاعری میں استعمال کیا گیا یوں نظیر اردو شاعری کا پہلا فطرت نگار شاعر کہلا سکتا ہے۔نظیر نے فارسی کی آمریت اور درباری تصنع کو نہیں مانا۔اُس دور میں اردو شاعری میں غزل کی بادشاہت تھی، یہی وجہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔نظیر کو شاید اس لیے بھی نظر انداز کیا گیا کہ اس نے اس دور کے روایتی موضوعات سے انحراف کرتے ہوئے عوامی موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔نظیر اکبر آبادی کے ہاں ملکی تہواروں بالخصوص ہولی، دیوالی، بسنت وغیرہ کے ہنگاموں سے تحصیل مسرّت کا رُجحان بڑا واضح ہے اور نظیر نے ان مختلف تہواروں میں شرکت کی ہے۔تاہم نظیر کی یہ وابستگی ایک بڑی حد تک سطحی ہے۔نظیر عوام کا شاعر تھا اور اردو نظم کا آغاز بھی۔اس حوالے سے عمران ازفر نے اسی طرف اپنے موضوع کے حوالے سے یوں اشارہ کیا ہے کہ''جدید اردو نظم کے نکتہ آغاز عبدالحلیم شرر، نظیر اکبر آبادی کے ہاں تمثال کاری کا عمل خوب ہے۔''(۴) اُس نے عوام کی زندگی کے جزویات کا مطالعہ کیا۔یہی وجہ تھی کہ اس دور کے خاص طبقہ کے شعراء نے اسے اپنی صف میں جگہ نہ دی۔شین کاف نظام اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> نظم کا آغاز اگر نظیر اکبر آبادی سے نہ بھی مانا جائے تو بھی یہ ماننا ہی پڑے گا کہ غزل کی نام نہاد بلیغ و فصیح زبان سے اسے الگ کرنے اور موضوع کے اعتبار سے ہئیت میں تجربے کا آغاز نظیر ہی سے ہوتا ہے نظیر نظم کے بے نظیر شاعر ہیں۔اپنے عہد کی روایت کے مطابق اگر نظیر

کسی دربار سے متعلق و منسوب نہیں ہوئے تو شاعری میں بھی
انہوں نے اپنے دور کی روش کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا۔(۵)

جو لوگ جدید اردو شاعری کے بانی ہیں، وہ مغربی خیالات سے بے حد متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ جدید شاعری کا ابتدائی دَور سرسید کی تعلیمات پر مشتمل ہے جو عقل کو فوقیت دیتے تھے۔ انہوں نے منطقیت اور استدلال کو شاعری کے لیے لازم قرار دیا۔ عقل کو مغربی فکر میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سرسید نے مذہب میں جدید علم الکلام کے ذریعے قرآنی آیات کو بھی عقل کے سانچے میں ڈھالا۔ مغرب میں سترہویں صدی میں عقلیت پسندی کا آغاز ہوا اور خدا تک پہنچنے کے لیے مذہبی کتاب پر عقل کو فوقیت دی گئی۔ یہ مغربی افکار ہی کا نتیجہ تھا کہ سرسید عقل کو نجاتِ عالم کا ذریعہ سمجھتے تھے جس کے عملی نمونے جدید اردو شاعری میں نمایاں ہیں۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد: ''حالی اور آزاد سرسید کی پیروی مغرب میں مغرب کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔''(۶) ڈاکٹر رشید امجد کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کا جھکاؤ مغربی افکار کی طرف تھا۔ سید محمد ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں کہ: ''سرسید نے مغرب کی عقلیت پسندی کے تحفہ کے ساتھ ساتھ حقائق کے ادراک کی دولت ہمیں دی۔''(۷) سرسید کے ذریعے حالی انگریزی ادب اور فکر کی طرف راغب ہوئے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے حالی کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''انگریزی لٹریچر کے ساتھ مناسبت پیدا ہونے کی وجہ سے یہیں سے ان کے دل میں یہ جذبہ ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ اردو ادب کی نہ صرف اصلاح کی جائے بلکہ اس کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھولی جائیں۔''(۸)

کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کے ذریعے جدید اردو نظم کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ: ''جدید اردو شاعری کی حد بندی آزاد اور حالی کے کلام سے ہوتی ہے۔''(۹) سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک نے اردو شاعری کے مزاج کو بھی کروٹ دی اور شعرا کو قومی تقاضے پورے کرنے کی تربیت دی۔ سرسید نے قدامت کے انجماد کو توڑا اور جدیدیت کی طرف پیش قدمی کی۔ ڈاکٹر محسن عباس نے لکھا ہے کہ: ''بقول سرسید ''اس دور میں شعر و ادب کو زیادہ سے زیادہ حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ پرانی تشبیہیں اور استعارات ختم کر کے فطری جذبات کو شاعری کا حصہ بنانا چاہیے۔''(۱۰) سرسید کی تحریک کے خلاف جو ردِّ عمل ہوا وہ جدیدیت کی ایک اور جہت تھی جس کے تحت اختلافِ رائے کو اہمیت ملی اور ادب میں جمہوری عمل کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر طاہرہ نیر سرسید کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

وہ چاہتے تھے کہ شاعری اس طرح کی جائے کہ دل سے نکلے دل میں
بیٹھے ان کی اس تمنا کو لبیک کہنے والا پہلا شاعر حالی ہے بلاشبہ اس
انقلاب عظیم میں حالی کا حصہ سب سے زیادہ ہے، جس نے شاعری کو

دل کے بجائے عقل سے وابستہ کر کے اس کا تعلق عصری تقاضوں سے
قائم کیا۔(۱۱)

سرسید کے رفقائے خاص مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے اردو میں جدید نظم کی داغ بیل ڈالی۔فکری سطح پر حالی کا مقدمہ شعروشاعری اور آزاد کا انجمن پنجاب کے تحت نیا شعری منشور، اردو شعرو ادب کا نیا شعور اور ان کی نظم نگاری ردیف، قافیہ، ارکان اور موضوع کی پابندیوں کے باوجود جدید اردو نظم کی اہم کڑی ہیں۔انہوں نے ادب میں تبدیلی کا شعور دے کر نئے ادبی تجربات کے لئے میدان صاف کیا۔ڈاکٹر صفیہ بانو انجمن پنجاب کے قیام کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:''۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء میں سکشا سبھا کے مکان میں ایک جلسہ منعقد ہوا اس جلسہ میں لاہور کے علم دوست حضرات اور رؤسا شریک ہوئے اور ''انجمن پنجاب'' کا قیام عمل میں آیا۔''(۱۲) انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظمیں جدید نظمیں تھیں جن کا نقطۂ عروج مولانا الطاف حسین حالی کی نظم ''مدّ و جزر اسلام'' تھی۔حالی اور محمد حسین آزاد کی جدّ و جہد سے قومی اور نیچرل شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔حالی اردو میں نیچرل شاعری میں آزاد کے رفیق تھے۔نیچرل شاعری کے بارے میں حالی مقدمہ شعروشاعری میں لکھتے ہیں:

> نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنی دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جا چکی ہے نیچر یا سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر ان نیچرل سمجھا جائے گا۔معنی نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہییں۔(۱۳)

حالی نے نیچرل شاعری کا تصوّر مقدمہ شعروشاعری میں دیا جس کے تحت اردو شاعری سے روایتی مضامین کو نکال کر با مقصد مضامین لانے پر زور دیا گیا۔پروفیسر حمید اللہ خاں حالی کی ابتدائی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:''اوّل شاعری میں خیالی مضامین سے پہلو بچایا اور حقیقت پسندی اور واقعہ نگاری پر زور دیا۔''(۱۴) ''مسدس مدّ و جزر'' اسلام حالی کا عظیم کارنامہ ہے جو جدید اصلاحی شاعری کی بہترین مثال قرار دی

جاسکتی ہے۔ یہ نظم جہاں اصلاح کا پہلو رکھتی ہے وہیں مقصدیت کے پہلو سے انحراف کر جاتی ہے۔ حالی نے اس نظم میں یاس و نا امیدی کی فضا قائم رکھی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''اگر چہ شاعر کا مقصد خوابیدہ قوم کو کچوکے لگا کر جھنجھوڑنا اور غیرت دلانا تھا لیکن اس طرز بیان نے مقصدیت کو کسی قدر ٹھیس بھی پہنچائی۔'' (۱۵)

حالی قافیہ اور ردیف کے بھی ضرورت سے زیادہ قائل نہ تھے۔ ڈاکٹر محسن عباس لکھتے ہیں: ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں حالی نظم میں قوافی اور بحر کی پابندی کے خلاف نظر آتے ہیں۔ اُن کا یہی منشا جدید اردو شاعری بلکہ جدید اردو نظم کے فروغ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔'' (۱۶) حالی کی شاعری قدیم و جدید کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتی ہے، انہوں نے بعض قدیم روایتوں کو چھوڑ کر شعر کی نئی وادیوں میں قدم رکھا اور نئے ذوقِ شعری کو جنم دیا جس سے ان کے معاصر اور بعد میں آنے والے متاثر ہوئے۔ انہوں نے نظم کے لیے ذوق و ذہن کو آمادہ کیا اور اس کی مقبولیت کے لیے راہیں ہموار کیں، اس طرح شاعری کو ایک طرف سچے جذبات کا ترجمان تو دوسری طرف اس کو مفید اجتماعی مسائل و حقائق کا وسیلۂ اظہار بنایا۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں: ''حالی کو اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ وزن اور قافیے کے قدیم تصورات پر بھی نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے اور اسی لیے انہوں نے شاعری کے لیے وزن اور قافیے کے بجائے تخیل، تاثیر اور جذبات نگاری کو بنیادی اجزاء قرار دیا۔'' (۱۷) حالی نے نظم کو سماجی اور قومی مسائل کے لیے استعمال کیا۔ حالی شاعر سے زیادہ مصلح نظر آتے ہیں۔

حالانکہ آزاد نے انجمن پنجاب کو تشکیل نہیں دیا تھا پھر بھی وہ اِس کے روح رواں کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ بعد میں معتمد بھی بنے۔ پنجاب میں محکمۂ تعلیم کے افسر کرنل ہالرائڈ کے ایماء پر آزاد نے انجمن پنجاب میں ایک خطبہ دیا جس کا عنوان ''خیالات نظم اور کلام موزوں کے باب میں'' تھا۔ اِس کا مقصد اردو شاعری کو مبالغہ آمیز باتوں اور قدامت پرستی سے چھٹکارا دلانا تھا اور انگریزی شاعری کی تتبع کا مجوزہ راستہ تھا۔ آزاد نے انجمن کے مشاعروں میں مصرع طرح پر غزل کی بجائے کسی عنوان پر نظم لکھنے کا سلسلہ شروع کیا لیکن اس کی کافی مخالفت ہوئی کیونکہ نئی نظم کے فروغ کو قدیم غزل کی موت سمجھا جانے لگا۔ اس دور میں اس قسم کی نظم کی شدید مخالفت بھی ہوئی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ '' انجمن پنجاب لاہور'' کے مشاعروں کی شدید مخالفت ہوئی کیونکہ ان میں اس جدید نظم نگاری کو بَرتا جا رہا تھا۔ روایتی نظم کے حامیوں نے اس جدید نظم کو بُری طرح ردّ کر دیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید نظم کا آغاز محمد حسین آزاد سے ہوتا ہے۔ انور سدید لکھتے ہیں: ''مولانا محمد حسین آزاد کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے انجمن پنجاب کے تحت نظم و نثر اردو کے جدید دور کا آغاز کیا اور

ایک ایسی فعّال ادبی تحریک پیدا کی جس کے اثرات دوررس تھے۔''(۱۸) یوں مخالفت کی وجہ سے کچھ عرصے بعد یہ مشاعرے تو ختم ہو گئے لیکن نئے طرز احساس اور طرز اظہار یعنی نئی نظم کی روایت پیدا ہو گئی۔ان مشاعروں میں حالی اور آزاد کی نظموں نے نئے شعرا کی رہنمائی کی۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:''مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کا انجمن پنجاب سے جو گہرا تعلق رہا اور اس نے جس طرح سے انہیں نظم نگاری کی طرف مائل کر کے جدید شاعری کی طرف راغب کیا اس کی بنا پر انجمن پنجاب اردو ادب کی تاریخ میں اہم سنگ میل قرار پاتی ہے۔''(۱۹) اردو شاعری کی تاریخ میں آزاد نے پہلی بار اپنی نظم ''جغرافیہ طبعی کی پہیلی'' میں قافیے کو نظر انداز کیا۔ انجمن پنجاب کا دائرہ کار خاصا وسیع تھا لیکن ادبی اہمیت کے حامل مشاعروں کے باعث انجمن پنجاب کی شہرت عام ہو گئی۔ڈاکٹر ناہید قاسمی نے لکھا ہے:''حالی کہتے ہیں کہ یہ تحریک اچھے زمانے میں شروع ہوئی۔کیونکہ اس وقت تک اردو زبان میں مغربی خیالات کی روح پھونکی جا رہی تھی۔بہت سی کتابیں اور مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو گئے تھے۔''(۲۰) ان مشاعروں کا مقصد یہ تھا کہ عشق و محبت کے موضوعات اور کسی حکمران کے تعریف پر مشتمل شاعری سے ہٹ کر نظمیں کہی جائیں اور دوسری زبانوں سے ایسی نظموں کے ترجمے کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں کہ:

> انجمن پنجاب کے مشاعروں میں مصرعہ طرح کی بجائے نظموں کے لیے عنوانات ہی دیئے جاتے تھے۔پیروی مغرب کے میلان نے بھی ہمت شوق بڑھائی کہ اردو شاعری کو مغربی ادب و تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اسی صنف سخن کو برتا جائے جو خود مغرب کی نمائندہ صنف ہے۔(۲۱)

شاعری میں ''آزاد'' کی بنیادی عطا نظمِ جدید کے مشاعرہ کا اجرا ہے۔آزاد کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے شاعری میں نئی اصناف کا تجربہ کیا۔انہوں نے نظم کو ردیف و قافیہ کی بندش سے آزادی دلائی۔انجمن پنجاب کے کل دس مشاعرے ہوئے جس میں طے یہ پایا تھا کہ ہر مشاعرہ کے لیے مجوزہ عنوان پر نظم لکھنی ہوگی۔انجمن پنجاب نے انگریزی نظموں کے انداز و اسلوب کو اردو شاعری میں متعارف کرانے کی کوشش کی۔شین کاف نظام لکھتے ہیں:

> موضوعی مشاعروں کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن انحراف و اجتہاد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔حاکم وقت کی منشا تھی کہ انگریزی نظموں کا زیادہ سے زیادہ اردو میں ترجمہ ہو۔آزاد اور حالی دونوں انگریزی زبان سے

کما حقہ واقف نہیں تھے اس لیے انہوں نے انگریزی پڑھے لوگوں
سے پہلے نظموں کو سمجھا اور پھر اس خیال کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ حالی
کی ''پیروی مغرب'' بھی اس عہد کی دین ہے۔ (۲۲)

آزاد نے انجمن کے تحت اپنے لیکچروں میں رائے دی کہ نظم موضوع اور مواد کے لحاظ سے انحطاط پذیر ہے۔ قصیدہ گوئی صرف خوشامد کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ آزاد نے ان لیکچروں میں پرانے موضوعات کی جگہ نئے موضوعات متعارف کرائے، نیچرل شاعری کو ترجیح دی یعنی فطرتی مناظر کے تحت نظمیں لکھنے کی ترغیب دی۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ: ''آزاد نے نظم نگاری کی شعوری تحریک کی اور شعرا کو باقاعدہ ترغیب دے کر نظم کہنے پر مائل کیا۔ آزاد اردو شاعری کے عام مواد سے مطمئن نہ تھے۔'' (۲۳) آزاد کے خیالات کی تائید و مخالفت ہوتی رہی۔ ''اودھ پنچ'' نے مخالفت کی تو ''پنجابی اخبار'' نے تائید کی۔ ایک اور اخبار ''آفتاب پنجاب'' اور کئی رسائل کے ذریعے اردو شعراء، آزاد کے خیالات سے متعارف ہو کر اسی طرز کو اختیار کرنے لگے جن میں اسماعیل میرٹھی جیسے شاعر کا نام آتا ہے۔ جب جنوری ۱۸۶۵ء انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا، اس دَور میں برطانیہ میں رومانی شاعری ہو رہی تھی، یہی وجہ ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے عنوانات مکمل طور پر رومانی تو نہیں لیکن ان پر رومانیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ''نظم آزاد'' جو کہ آزاد کا دیوان تھا، ۱۸۹۹ء میں حالی کے دیوان کی اشاعت کے چھ برس بعد شائع ہوا لیکن دیکھا جائے تو حالی کی شاعرانہ صلاحیتیں آزاد کے مقابلے میں زیادہ تھیں۔ اس لیے حالی کے دیوان کا اردو شاعری پر جو اثر ہوا وہ آزاد کے دیوان کا نہ ہوا۔ ڈاکٹر محسن عباس لکھتے ہیں: ''جدید نظم'' پامال راہوں سے انحراف اور نئے راستوں کی جستجو کا عمل انجام دیتی ہے۔ تشبیہ کی فرسودہ حالت سے بلند ہو کر استعارے اور علامت کی کارکردگی کو بروئے کار لا کر نئی تخلیقی رو کے امکان کو جنم دینا اس کی اہم خاصیت ہے۔'' (۲۴) انجمن پنجاب کے مشاعروں نے جدید اردو نظم اور اردو شاعری کی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا۔ عارف ثاقب لکھتے ہیں کہ: ''انجمن پنجاب کے ان مشاعروں سے اصلاح معاشرہ کا کام بھی لیا گیا۔ آزاد اور حالی نے اپنی شاعری میں پیغام اور مقصد کو ضروری سمجھا اور اخلاقی پہلو اجاگر کیے۔ آزاد، حالی اور اکبر الہ آبادی سبھی کی شاعری کے پیچھے اصلاحی مقاصد کارفرما تھے۔'' (۲۵)

شبلی نے بھی حالی اور آزاد کے طرز پر اصلاحی اور قومی نظمیں لکھیں لیکن شبلی سیاست کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ انہوں نے شاعری سے زیادہ نثر پر توجہ دی پھر بھی اُن کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر شمس بدایونی شبلی کی نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''آزاد اور حالی کی موضوعاتی نظمیں بھی ان کو متاثر کرنے لگیں چنانچہ ان کے موضوعات شاعری میں تغیر واقع ہونا شروع ہوا۔'' (۲۶) اُن کی ایک نظم ''صبح

امید'' میں سرسید اور اُن کی تعلیمی پالیسی کی طرف داری کی گئی ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ان کی شاعری کا انداز بالکل بدل گیا۔ اس دور میں انہوں نے سیاسی اور تاریخی نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ پروفیسر ہارون الرشید لکھتے ہیں کہ: ''شبلی کی اردو شاعری جدید سیاسی رجحانات کی حامل ہے۔'' (۲۷) شبلی نے ادب کو زوال سے نکالنے کے لیے اخلاقی و اسلامی نظمیں لکھیں لیکن ان کی نظموں میں شعریت کم پائی جاتی ہے۔ شبلی نے حالی کی طرح قوم کی تنزلی کا مرثیہ پڑھا لیکن شبلی میں شاعرانہ خوبیوں کی کمی تھی۔ شبلی، حالی اور آزاد کے بارے میں کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

> آزاد نے مناظر فطرت سے دل چسپی لی، تو حالی نے قومیت کو اردو شاعری کا اہم ترین جزو قرار دیا اور شبلی نے مسلمانوں کی پستی کا سبب اصول و روایاتِ اسلامی سے انحراف بتایا اور اسلامیت کو داخلِ شعر کیا۔ (۲۸)

حالی، شبلی اور آزاد نے نئی نظم کی بنیاد ڈالی۔ انجمن پنجاب کا پلیٹ فارم جدید اردو نظم کی ترقی و ترویج کے لیے اہم ثابت ہوا۔ گو کہ شبلی نے اخلاقی و مذہبی موضوعات پر نظمیں لکھیں لیکن بقول سعود الحسن ندوی: ''اردو شاعری میں علامہ شبلی کی سیاسی نظمیں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں بلکہ اردو شاعری میں نئے باب کا آغاز کہنا چاہیے۔'' (۲۹)

رسالہ ''مخزن'' نے اکبر کو ''لسان العصر'' کا خطاب دیا۔ اقبال نے بھی اکبر کی تعریف کی۔ اکبر جیسے شاعر کی وفات کے بعد ترقی پسندوں نے اکبر کی شاعری پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں کہ: ''اکبر نے قدیم شاعری کے بارے میں حالی و آزاد کی طرح تند و تلخ رویہ اختیار نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے بھی نئے تقاضوں کی روشنی میں اپنے معاصروں کی طرح جدید اردو شاعری کے لیے راہ ہموار کی اور خود اس کے لیے عملی نمونہ بنے۔'' (۳۰) اکبر کی شاعری کا خاصہ طنز و ظرافت ہے۔ اُنہوں نے مشرقی تہذیب کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے مغربی تہذیب پر سخت چوٹ کی۔ پروفیسر منظر ایوبی لکھتے ہیں کہ:

> اکبر کی شاعری سے ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ مغرب کی اندھی تقلید کم ہو گئی۔ انہوں نے مغرب زدگی اور مغرب پرستی کو ختم کرنے کے لیے اپنی پوری شاعرانہ صلاحیت کو استعمال کیا جس سے اردو شاعری کو نئے نئے موضوعات ملے۔ (۳۱)

اُن کی شاعری کا نچوڑ مغربی تہذیب اور تعلیم سے مسلمانوں کو دور رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر نے جا بجا سرسید احمد

خان کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ڈاکٹر فاطمہ تنویر کے بقول: ''اکبر مشرق و مغرب کے اتصال کے لیے کی جانے والی مضحکہ خیز کوششوں کو جن کا تعلق مغز سے نہیں پوست سے اور باطن سے نہیں ظاہر سے ہے، نشانہ بناتے ہیں۔'' (۳۲) یہ بھی حقیقت ہے کہ تحریک علی گڑھ نے اکبر کو شہرت عطا کی۔ اگر سرسید تحریک علی گڑھ کا آغاز نہ کرتے تو اکبر کا فن بھی سامنے نہ آتا۔ اکبر نے مغربی تہذیب سے بچنے کی تلقین کی اور مشرقی اقدار کو فروغ دیا۔ محمد سرور رجا ''رالف رسل'' کی کتاب کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ: ''اکبر ایسی صورتِ حال دیکھنا نہیں چاہتے تھے جس میں مغربی تعلیم اور مغربی آداب کا ملمع مذہبی احساسات کے آزادانہ اظہار کو محدود و مسدود کر کے رکھ دے۔'' (۳۳) حالی اور آزاد کے بعد اکبر نے اپنے جدید موضوعات سے جدید اردو نظم کے موضوعات کو وسعت عطا کی۔ گو انہوں نے ایک ہی موضوع کو زیادہ اجاگر کیا لیکن با مقصد نظم نگاری کی طرف قدم بڑھایا۔ قوم کو اپنے مطابق جو بہتر سمجھا، اُس کا پیغام پہنچایا۔ اگرچہ وہ مغربیت مخالف تھے، لیکن انہوں نے موضوعاتی حوالے سے اپنی شاعری کو افکارِ نو سے تازگی بخشی۔ اکبر نے مغربی تہذیب کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جو اس کے بعد اقبال اور ظفر علی خاں نے تھام لیا۔ ظفر علی خاں کے بارے میں تو یہاں تک کہا گیا کہ اگر وہ سیاست سے کچھ دور رہتے تو اقبال کی ہمسری کر سکتے تھے۔ ال احمد سرور اکبر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''اکبر جو ایرانی ہندوستانیت یا مشرقیت کے پرستار تھے۔ مغربی تہذیب کے طوفان سے اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' (۳۴)

اقبال نے اردو نظم کو تاریخی اور تہذیبی دونوں سطح پر متاثر کیا ہے۔ اقبال نے ہیئتی اعتبار سے تو زیادہ نہیں لیکن فکری اعتبار سے جدید اردو شاعری میں اپنا کردار ادا کیا اور جدید شاعری کے اہم پہلو اصلاح کو اپنی شاعری کا سب سے اہم حصہ بنایا۔ حالی اور آزاد کی نظم نگاری اصلاحی تحریک میں صرف ایک حربے کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ اقبال کے دَور میں اس حربے کا استعمال زیادہ موثر اور احسن انداز سے کیا گیا۔ اس دَور کے شعراء نے فطرتی مناظر کو اپنی شاعری میں اَپنایا اور قاری کو اس سے لطف اندوز کرنا شروع کر دیا، اس کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کے مسائل کو بھی اپنی شاعری کا حصہ برابر بناتے رہے۔ یوں اقبال نے حالی کی تحریک کو موضوعاتی اور اصلاحی طور پر آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انجمن پنجاب نے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا، اقبال نے اسے آگے بڑھایا۔ مسدس ''مدوجزر اسلام'' میں حالی نے جن خیالات کا اظہار کیا، انہیں اقبال نے مزید نکھار کر اور وضاحت کے ساتھ بعد میں اپنی شاعری میں بیان کیا۔ اقبال کی ذہانت و فطانت کو اعلیٰ تعلیم نے مزید نکھار عطا کیا۔ اقبال نے زیادہ تر شاعری قدیم ہیئت میں ہی کی پھر بھی اقبال کی شاعری نے اردو شاعری کو جذبے سے فکر کی طرف گامزن کیا۔ اقبال نے فکر اور موضوعات کے حوالے سے جدید نظم کو ترقی عطا کی۔ وزیر آغا لکھتے ہیں: ''یہ فطرت سے ہم آہنگی تھی جس نے انہیں (اقبال کو) نور و تاریکی کی آویزش سے آگاہ کیا اور ان کے انمول جواہر، احساس

جمال، احساس وسعت اور نظر عمیق کو صیقل کر کے انہیں ایک نئی روش پر گامزن ہونے کی ترغیب دی۔'' (۳۵)
اقبال نے جدید شاعری کی ترقی وفروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اقبال نے اردو شاعری اور نظم نگاری کو ایسی جدّت عطا کی جس نے آنے والے دَور کے شعراء کو نئی سمت دکھا دی جس پر چلتے ہوئے آنے والے شعراء نے جدید نظم میں نت نئے موضوعات خاص طور پر فطری مناظر کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ڈاکٹر محسن عباس لکھتے ہیں کہ: ''اقبال نے پابند نظم کی ہیئت میں لفظ کی تخلیقی معنویت وضع کر کے نظم جدید کو وسعت دی، ڈاکٹر وزیر آغا اپنی تنقیدی تحریروں میں اقبال کو جدید اردو نظم کا پیش رو تسلیم کرتے ہیں۔'' (۳۶) اقبال نے فکر وخیال کے تجدّد کو اہمیت دی لیکن شاعری کی کلاسیکی ہیئت کو بھی برقرار رکھا۔ انور سدید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں: ''اقبال نے نظم کو خارجی زندگی کے بیان کے علاوہ داخلی زندگی کی عکاسی کے لیے استعمال کیا اور یوں گویا فرد کی داخلی دنیا کو برانگیختہ کر دیا۔ انفرادیت کی طرف اقبال کا یہی رجحان اسے جدید اردو نظم کا اوّلین علمبردار قرار دینے کے لیے کافی ہے۔'' (۳۷) اقبال کی شاعری میں خارجیت پر حیرانی کا اظہار پایا جاتا ہے اور اُس نے داخلی حقائق کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

مخزن اپنے دَور کا مشہور ادبی رسالہ تھا جو اپریل ۱۹۰۱ء میں ''سر عبدالقادر'' نے جاری کیا جس نے جدید نظم کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جدید نظم میں بھی ''آزاد نظم'' کو اس رسالے نے زیادہ ترقی عطا کی۔ اِس رسالے نے کئی شعراء متعارف کرائے جنہوں نے جدید نظم نگاری کو فروغ بخشا۔ اِنہیں شعراء میں نادر کاکوروی اور سرور جہاں آبادی بھی شامل تھے جنہوں نے کئی مغربی نظموں کے اردو میں تراجم کر کے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اقبال اور ابوالکلام آزاد بھی اسی رسالے کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ اس کے پہلے ہی شمارے میں اقبال کی نظم ''ہمالہ'' شائع ہوئی۔ اسی پہلے شمارے میں ظفر علی خاں نے ٹینی سن کی نظم کا منظوم ترجمہ ''ندی کا راگ'' کے عنوان سے کیا۔ مخزن کو دیکھتے ہوئے کئی اور رسالے منظر عام پر آئے اور انہوں نے بھی جدید اردو نظم کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ ان رسائل میں'' اودھ پنچ''، ''ہمایوں''، ''معارف''، ''مشرق''، ''رومان''، ''زمانہ''، ''نقاد''، ''ادیب''، ''صبح بہار''، ''ترجمان'' اور'' العصر'' وغیرہ شامل ہیں۔ رسالہ ''مخزن'' کا ایک اہم مقصد انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں اور انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے شائع کرنا تھا۔ اس کام کا آغاز شرر نے اپنے رسالے ''دلگداز'' سے کر دیا تھا۔

اسماعیل میرٹھی نے الطاف حسین حالی کی طرح اصلاح قوم کے لیے اشعار کہے۔ مسلمان جنگ آزادی میں شکست کے بعد زوال کا شکار تھے اس لیے تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کو جگانے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ اسی کی ایک کڑی شاعری میں بہتری لانا تھی۔ اسی تحریک کے زیر اثر اردو نصاب کے لیے

ترجمے اور طبع زاد نظموں کا کام بھی ہوا۔اس کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت پر بھی نظمیں لکھیں۔انجمن پنجاب نے جو جدید نظم کی تحریک عام کر دی تھی اس کے تحت میرٹھی نے بھی اصلاحی روش کی پیروی میں اصلاحی نظمیں لکھیں۔پروفیسر فاروق فیصل اسماعیل میرٹھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:''انگریزی ادب سے متاثر ہوکر اسماعیل میرٹھی نے پہلی بار اس وقت بے قافیہ نظم لکھنے کا تجربہ بھی کیا۔جسے تاریخی اعتبار سے یقیناً آج بھی اہمیت اور انفرادیت حاصل ہے اور کئی ناقدین ادب انہیں جدید اردو نظم کا بانی قرار دیتے ہیں۔''(۳۸) میرٹھی کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ آزاد سے لے کر اقبال تک بہت سے شعرا نے نظمیں لکھیں لیکن بچوں کے لیے بطورِ خاص نظمیں لکھ کر انہوں نے اس میدان میں اپنا ایک الگ نام پیدا کر لیا۔میرٹھی نے انگریزی نظموں کا اردو میں عمدہ ترجمہ کیا اور بلینک ورس میں بھی نظمیں کہیں۔حالی اور میرٹھی میں یہ فرق ہے کہ حالی نے بلینک ورس میں لکھنے کی ترغیب ضرور دی لیکن خود نہ لکھی جب کہ میرٹھی نے بلینک ورس لکھ کر تخلیقی جرأت دکھائی۔اسی دور کے ایک شاعر منشی درگا سہائے سرور نے انگریزی شاعری کا اردو میں ترجمہ کیا اور انگریزی شاعری کے زیر اثر اردو شاعری میں نیا آہنگ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔شین کاف نظام نے سرور کے بارے میں لکھا ہے:''ان کا ترجمہ ایسا شستہ و برجستہ ہے کہ بعض مقامات پر طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔''(۳۹)

چکبست کی شاعری نے نئی نظم لکھتے ہوئے نظموں میں سیاسی سوچ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ان کی شاعری تاریخی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کو اجاگر کرتی ہے۔جنگ آزادی کے بعد کے دور میں حالی، آزاد اور میرٹھی کی کوششوں سے فطرت کے نظاروں میں شعراء دلچسپی لینے لگے۔اس کی بڑی وجہ مغربی شاعری کے اکثر رجحانات کی پیروی ہے۔اس کے علاوہ وطن کی زمین سے محبت بھی اس کی بڑی وجہ ہے۔چکبست کی شاعری میں پہلی بار ملکی روایات سے گہری محبت ظاہر ہوتی ہے۔

نظم معرّا انگریزی سے اردو میں آئی، انگریزی میں اسے بلینک ورس کہا جاتا ہے۔اسے ''نظم غیر مقفی'' کا نام بھی دیا گیا۔ابتدا میں اس صنف کو ''نثر مرجز'' کہہ کر قبولیت کی سند دینے سے انکار کیا گیا۔انگریزی میں نظم معرّا کے لیے مخصوص پیرامیٹر ہے، جب کہ اردو میں اس کی کوئی مخصوص بحر نہیں۔البتہ قافیہ کے بغیر ایک ہی بحر میں لکھی گئی مسلسل نظم کو ''نظم معرّا'' کا نام دیا گیا۔خاطر غزنوی نظم معرّا کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:''نظم معرا یا غیر مقفی نظم اس نظم کو کہتے ہیں جس کے سب کے سب مصرعے وزن کے لحاظ سے تو برابر ہوں، صرف ان میں قافیہ کی پابندی نہ ہو۔''(۴۰) نظم معرّا صنف کا نام نہیں بلکہ ہئیت کا نام ہے۔اس میں کوئی بھی موضوع آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔جب اردو شعرا کا انگریزی ادب سے تعلق جڑا تو نظم معرّا کو پذیرائی ملی۔آج کل معرّا نظم کی وہ اہمیت نہیں ہے جو اس کے آغاز کے وقت تھی۔بیسویں صدی کے شروع میں مغربی علم

وتحقیق کے زیر اثر جو فکری اور ذہنی رجحان پیدا ہوا اس میں پرانے اوزان اور بحور کو مدنظر رکھ کر اظہار و بیان کے نئے طریقے وضع کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔ الغرضیکہ نظم معرّا قوافی سے نجات دلانے کے لیے ظاہر ہوئی۔ آغاز میں مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے پیروکاروں نے شاعری میں قافیے کے استعمال سے بیزاری دکھائی۔ نظم معرّا کو انجمن پنجاب کے ذریعے ترقی ملی۔ مولانا الطاف حسین حالی بھی قافیہ کی قید سے بیزار رہے، ان کا خیال تھا کہ قافیہ کی قید اظہار خیال کے رستے میں رکاوٹ ہے۔ محمد حسین آزاد، مولوی اسماعیل میرٹھی، مولانا عبدالحلیم شرر اور نادر کاکوروی نے معرّا نظم لکھنی شروع کی۔

''آزاد نظم'' اور ''معرا نظم'' نے روایتی اردو نظم نگاری کی جگہ لی جس کی بنیاد بحر، قافیہ اور ردیف پر قائم تھی۔ آزاد اور معرّا نظم نے روایتی نظم سے ہٹ کر بے قافیہ اور بے بحر نظم نگاری کا آغاز کیا۔ شروع کے معرّا اور آزاد نظم لکھنے والوں میں عبدالحلیم شرر، اسماعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی کا نام آتا ہے۔ عبدالحلیم شرر بنیادی طور پر ناول نگار تھے لیکن سب سے پہلے اردو میں معرّا نظم (Blank Verse) انہوں نے لکھی۔ حنیف کیفی نے اپنی کتاب ''اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم'' میں اردو میں نظم معرّا کے بانی کے بارے میں کئی محققین اور ناقدین کے اقوال نقل کیے ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اردو میں معرّا نظم کا بانی ''شرر'' ہے۔ حنیف کیفی لکھتے ہیں کہ: ''اس طرح اردو میں نظم معرّا کی ابتدا کا اعزاز شرر کو جاتا ہے۔'' (۴۱) حالی کی تحریک کو شکل دینے میں عبدالحلیم شرر کا نام ہر اوّل دستے میں ہے۔ شرر کے ڈرامے ''مظلوم ورجینیا'' نظم معرّا کا اہم نمونہ قرار دیا گیا۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے پرچہ ''دلگداز'' میں اردو میں نظم معرّا کو مشہور کرنے کی کوشش کی، یہی وجہ ہے کہ انہیں اس صنف کو استعمال کرنے والا پہلا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ شرر نے اپنے پرچے ''دلگداز'' میں مولانا نظم طباطبائی سے گرے کی مشہور ایلجی کا ''گور غریباں'' کے عنوان سے منظوم ترجمہ کروا کر شائع کیا۔ شرر نظم معرّا کو ''نظم غیر مقفی'' کہتے تھے۔ اس کا نام ''نظم معرّا'' مولوی عبدالحق نے ۱۹۰۱ء میں تجویز کیا تھا لیکن اکبر الہ آبادی ۱۹۰۹ء میں بھی اسے بلا قافیہ نظم ہی کہتے تھے۔ عظمت اللہ خاں نے اسے ''بے ردیف قافیہ'' کہا اور مولوی نجم الغنی ''بحر الفصاحت'' میں اسے نظم ہی نہیں مانتے اور نظم معرّا کی تردید کرتے ہوئے اسے ''غیر مقفی نظم'' ہی کہتے ہیں۔ شرر، میرٹھی اور طباطبائی نے اس صنف کو بہت پذیرائی دی۔ جدید اردو نظم نگاری میں طباطبائی کا بڑا حصہ ہے۔ نظم طباطبائی نے ''گور غریباں'' کا انگریزی سے ترجمہ کیا اور ایسا ترجمہ کیا کہ نظم ترجمہ ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ طباطبائی کی ایک نظم ''بلینک ورس کی حقیقت'' میں قافیے کی حدود و قیود کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ بہرحال ان سب کی مخالفت بھی بہت ہوئی یہاں تک کہ علامہ اقبال نے بھی ان کی مخالفت کی۔ اقبال نے ڈاکٹر محمد عباس علی خان لمعہ کے نام ایک خط میں لکھا: ''اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی میں بلینک ورس ہے جس کو ''نثر مرجز'' کہنا

چاہیے۔اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آئندہ مقبول نہ ہوگی۔''(''اقبال نامہ''مرتبہ شیخ عطااللہ،جلد دوم،ص ۲۷۹)

تحریک علی گڑھ سے لے کر ترقی پسند تحریک کے دور کے درمیان کا دور نئے خیالات اور تجربات کا دور تھا۔اس درمیانی دور کے ادبا نے نت نئے تجربات کر کے ترقی پسند تحریک کے لیے راستہ استوار کیا۔ اس درمیانی دور کی سیاسی تحریکوں اور سماجی اقدار کے تناظر میں اس دور کی شاعری کو دیکھا جائے تو افکار و اظہار میں جدّت دکھائی دیتی ہے۔شرر کے علاوہ نظم طباطبائی نے انگریزی نظموں اور بالخصوص Long Fellow کے تراجم سے معرا نظم کے نمونے پیش کیے۔مولوی اسماعیل میرٹھی کی پیروی میں عظمت اللہ خان،عبدالرحمٰن بجنوری،حفیظ جالندھری،سیماب،ساغر نظامی اور جوش ملیح آبادی نے اسے نیا رنگ روپ دیا۔ہئیت اور اسلوب کے کئی تجربے کیے جو اردو شاعری کی روایت نہ بن سکے۔انگریزی ادب کے مطالعہ اور انگریزی نظموں کے تراجم کے اثرات کے زیر اثر اردو نظم آہستہ آہستہ ارتقا کے مراحل طے کرتی رہی اور یوں پہلی جنگ عظیم تک اس میں مختلف تجربات ہوئے۔

عظمت اللہ خان نے ہئیت و اسلوب کے سلسلے میں تجربہ کرنے کی کوشش کی اور وہ غزل کے بہت سخت خلاف تھے۔عظمت اللہ خان نے بحروں کو لچک دار بنانے اور نظم کی زبان اور اس کے لہجے و اسلوب میں ہندی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی۔عظمت اللہ نے جو زبان بنائی،اس سے بعد میں میراجی نے تخلیقی فائدہ اٹھایا۔عظمت اللہ خان نے ہندی بحروں کو استعمال کیا جس نے اردو نظم کی ہئیت بدلنے میں بہت مدد دی۔اب نظم میں اجتماع کے بجائے فرد کی آواز بھرنے لگی۔آزاد نظم لکھنے والوں میں میراجی،ن م راشد اور مجید امجد تھے جنہوں نے آزاد نظم میں ہئیت اور اسلوب میں جداگانہ حیثیت کے تجربات کیے۔وزیر آغا لکھتے ہیں:

> آزاد نظم جسے انگریزی میں فری ورس اور فرانسیسی میں Verse libre کا نام ملا تھا،مغربی ادبیات میں ایک عرصہ تک مستعمل رہی ہے۔اس کے اولین نقوش ملٹن کے ہاں ملتے ہیں۔گوئٹے،ہیوگو،بلیک اور آرنلڈ،ان سب نے آزاد نظم کو برتا۔تاہم اسے زیادہ فروغ والٹ وہیٹ مین کی شاعری سے ملا۔کہا گیا ہے کہ بودلیر جو آزاد نظم کے سلسلے میں ایک بڑا نام ہے،والٹ وہیٹ مین سے متاثر تھا۔(۴۲)

غزل،قصیدہ اور مثنوی وغیرہ کی حدود و قیود کو توڑ کر اُس میں وسعت پیدا ہونے سے'' آزاد

نظم'' کا جنم ہوا۔ڈاکٹر ناہید قاسمی نے آزادنظم کی ابتدا کے بارے میں لکھا ہے کہ:'' آزادنظم فرانس کی پیداوار ہے۔''(۴۳) پابندنظم میں قافیہ سے تو جان چھوٹ گئی لیکن ہئیت کی پابندی تھی جو آزادنظم کے آنے سے ختم ہوگئی۔خاطرغزنوی آزادنظم کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:''اس نظم کے تمام مصرعے ہم وزن نہیں ہوتے بلکہ کسی ایک بحر کے ارکان کی کمی بیشی کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔''(۴۴) آزادنظم عام نظموں کی طرح کسی ایک موضوع کے تحت سیدھے سادے انداز میں ایسے نہیں لکھی جاتی کہ آپ اوپر سے نیچے تک پڑھتے ہوئے مسلسل سمجھتے چلے جائیں۔آزادنظم مختلف،اجنبی اور پیچیدہ تکنیکوں میں لکھی جاتی ہے۔ یہ مسلسل بھی ہوسکتی ہے اور اسے مختلف مصرعوں،حصوں،ٹکڑوں یا کانتوز میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ضروری نہیں کہ ان مصرعوں،حصوں،ٹکڑوں اور کانتوز کی شاعر خودنشاندہی یا وضاحت کرے بلکہ اسے خود آزادنظم میں سے دریافت بھی کرنا پڑتا ہے۔ڈاکٹر روش ندیم آزادنظم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:'' آزادنظم دراصل شعرونثر کی دوئی کے خاتمے کا ایک اعلان بھی ہے اور ایک ایسی صنف کی تلاش کا اظہار بھی یہاں شعراورنثر ایک ہوسکیں۔''(۴۵)

اردو میں آزادنظم کے آغاز کرنے والے کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن تصدّق حسین خالد اس کے شروع کے لکھنے والوں میں سے ہیں جنہوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں یورپی شعراء سے متاثر ہوکر جدید انداز اور اسلوب کی نظمیں لکھیں۔ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:''مغربی ادبیات میں تو آزادنظم کی روایت بڑی پرانی ہے۔ڈاکٹر جانسن جیسے اصول پرست نقادوں کی مخالفت کے باوجود آزادنظم انگریزی شاعری ہی نہیں،یورپ کی شاعری میں ایک بلند مرتبہ حاصل کرچکی تھی۔''(۴۶) انگریزی ادب میں آزادنظم کے ابتدائی تجربات ہاپکنس،پٹیس،ٹی ای ہلم نے کیے اور بعد میں ایذرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ نے اسے شہرت عطا کی۔اردو میں اس صنف کا آغاز کرنے والے کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔شین کاف نظام نے لکھا ہے کہ:'' آزادنظم کا آغاز بقول ڈاکٹر حنیف کیفی تصدق حسین خالد سے ہوتا ہے۔کئی دوسرے محققین و ناقدین بھی خالد ہی کو اس کا آغاز کرنے والا قرار دیتے ہیں۔آزادنظم کی تشکیل وتعمیر میں خالد نے کس کس سے استفادہ کیا اس کے لیے ان کا مجموعہ''لامکاں تالامکاں'' ملاحظہ ہو۔''(۴۷) خالد کے دونوں مجموعے''سرودِنو'' اور''لامکاں سے مکاں تک'' میں بہت سی آزادنظمیں موجود ہیں۔تصدّق حسین خالد نے ردیف وقافیہ کے قدیم نظام کی مخالفت کی اور جدید شاعری کے لیے آزاد ہئیت کو استعمال کیا۔ان کا یہ تجربہ کامیاب ہوا اور بعد میں اسے اہم شعری ہئیت کے طور پر قبول کرلیا گیا۔انگریزی شاعری کے مطالعے کی بدولت تصدّق حسین خالد نے آزاد ہئیت کی طرف پیش قدمی کی۔انگریزی نظم کے مطالعے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ بحور کے ارکان،قافیہ اور ردیف کی پابندی آزادشعری اظہار میں رکاوٹ ہے۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے تصدق حسین خالد کے بارے میں

لکھا ہے کہ: ''اردو میں آزاد نظم کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔''(۴۸) مختلف محققین اور ناقدین نے آزاد نظم کے آغاز کرنے والوں کے بارے میں اپنی اپنی رائے دی ہے۔ شاذیہ ناہید شفاعت کے بقول: ''ن۔م راشد اور تصدّق حسین خالد کو اردو نظمِ آزاد کا بانی کہا جاتا ہے، کیونکہ یہی وہ دو شعرا ہیں جنہوں نے آزاد نظم میں مشرق کی روح سموئی۔''(۴۹) شاذیہ ناہید شفاعت کے قول کے مطابق خالد اور راشد دونوں آزاد نظم کے بانی ہیں لیکن حنیف کیفی نے بہت تحقیق کے بعد ان دونوں میں سے خالد کو'' آزاد نظم'' کا بانی مانا ہے۔ حنیف کیفی کے بقول: ''دونوں شاعروں کے دعووں پر ایک نظر ڈالنے سے جو پہلا تاثر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ خالد کے بیان سے قطعیت ظاہر ہوتی ہے جبکہ راشد کے بیان سے بے یقینی جھلکتی ہے۔''(۵۰) عبدالحلیم شرر کے ڈرامے ''نظم غیر مقفی'' کو بھی آزاد نظم کہا گیا جو ۱۹۰۰ء میں دل گداز میں شائع ہوا۔ اس ڈرامے کو کئی محققین اور ناقدین'' آزاد نظم'' مانتے ہیں۔ ڈاکٹر محسن عباس لکھتے ہیں کہ: ''اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو میں پہلی آزاد نظم لکھنے کا سہرا شرر ہی کے سر ہے۔''(۵۱) عبدالحلیم شرر، اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی اور عظمت اللہ نے غیر روایتی ہیئتوں میں تجربات کیے۔

اقبال نے اسی روایت میں نظم کو ہیئتی اور اسلوبی سطح پر استوار کیا۔ اقبال برصغیر میں اسی جدید فکر کے بانی ہیں جس کی کوکھ سے بعد میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ بعدازاں ترقی پسند تحریک نے بھی آزاد نظم کو فکری اور موضوعاتی سطح پر خاصی وسعت دی مگر ان کی شاعری پر ایک خاص معاشی فلسفہ کی چھاپ نمایاں رہی۔ ترقی پسند تحریک کے بین بین اردو شاعری، جدید اردو شاعری کے حوالے سے ایک ایسے رجحان سے ہمکنار ہوئی جس میں روایت سے بغاوت کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد میراجی، ن م راشد اور فیض احمد فیض کے نام آتے ہیں۔ ن۔م راشد اور میراجی نے اردو میں آزاد نظم کو ہیئتی اور معنوی سطح پر بار آور کیا۔ ن۔م راشد کا پہلا مجموعہ ''ماورا'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا جو کہ آزاد نظم کا پہلا مجموعہ تھا۔ راشد اور تصدق حسین خالد نے اپنے بیانات میں آزاد نظم کے بانی ہونے کا دعوی کیا ہے۔ اس رجحان کے علم برداروں میں تصدّق حسین خالد، میراجی اور ن م راشد قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں علامتی انداز اختیار کر کے اشاریت اور ابہام کو معیار بنایا۔ ان شاعروں نے مغرب کے سیاسی، معاشی اور فلسفیانہ افکار کی روشنی میں برصغیر کے بدلتے ہوئے تہذیبی ماحول کا گہرا مطالعہ کیا اور نئے سماجی شعور کی عکاسی کے لیے نظم معرّا اور آزاد نظم کو اپنایا۔ ہیئت اور اسلوب کے نئے اور جاندار تجربے کیے جو بعد میں اردو شاعری کی روایت بن گئے۔ رشید امجد لکھتے ہیں:

> راشد قافیہ کی مخالفت کرتے ہیں لیکن بعض اوقات قافیہ کے لیے فالتو
> مصرع لے آتے ہیں۔ نظم کا نیا آہنگ میراجی کے ہاں ہے چنانچہ

ہماری نظم کی ایک روایت میراجی سے مجید امجد، وزیر آغا سے ہوتی ہوئی
نصیر احمد نصیر تک آتی ہے۔ ستیہ پال آنند نے اسی روایت کو نظم کی جدید
روایت قرار دیا۔ (۵۲)

موجودہ عہد میں ''آزاد نظم''، نظم گو شعرا کی پسندیدہ اور مقبول ہیئت ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج کی اردو نظم کا ایک بڑا اثاثہ اسی ہیئت میں ہے اور اس کی پذیرائی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ الگ سے کوئی صنف نہیں بلکہ شعری ہیئت ہے، جو نظم کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ آزاد نظم فرانس میں ایجاد ہوئی، انگریزی ادب کے ذریعے یہ اردو ادب میں آئی۔ معرّا نظم میں قافیہ کے استعمال کو اردو شعرا نے رد کر دیا تھا لیکن آزاد نظم میں قافیہ کا ہونا یا نہ ہونا شرط نہیں۔ اس کے علاوہ ضرورت کے مطابق ابلاغ کی بہتر ترسیل کے لیے مصرعوں کو چھوٹا بڑا کیا جا سکتا ہے۔ بحر کے حوالے سے آزاد نظم میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے ضرورت کے تحت ارکانِ بحر کی تعداد میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ آزاد نظم عروضی آہنگ کے تابع ہوتی ہے، اس میں ایک ہی وقت میں موسیقی کی لطافت، خطابت کی گھن گرج اور سرگوشی کی صباحت محسوس کی جا سکتی ہے۔ آزاد نظم میں قافیہ کے بجائے ارکان کے نامیاتی آہنگ کا اہتمام کیا جاتا ہے جو لازمی نہیں کہ ایک ہی سائز کے مصرعوں پر مشتمل ہو بلکہ چھوٹی بڑی لائنوں میں ڈھل کر سامنے آتا ہے، کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ بعض لائنیں ہم قافیہ ہو بھی جاتی ہیں لیکن مجموعی طور پر نظم کا رجحان و انداز آزاد ہی رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو میں آزاد نظم کا آغاز تقریباً ۱۹۲۵ء سے تصدّق حسین خالد نے کیا۔ تصدّق حسین خالد، ن م راشد اور میراجی کی آزاد نظم کی صورت میں ارکان کی پابندی کے ساتھ ساتھ ردیف قافیہ کی پابندی سے انحراف کا عمل شروع ہوا جو لفظیات، موضوعات، اسلوبیات، تکنیک اور معنیات وغیرہ تک پھیلتا چلا گیا اور علامتی، معنوی، استعاراتی، موضوعاتی، لسانی اور انفرادی تجربہ کی سطح پر نئی دنیاؤں کی دریافت و تشکیل کو بنیاد بنایا گیا۔

''آزاد نظم'' کی بھرپور ابتدا ن م راشد اور میراجی سے ہوئی۔ اس کے بعد مجید امجد نے اچھی آزاد نظم لکھی۔ یوسف ظفر نے بھی آزاد نظم میں اچھے تجربے کیے۔ مجید امجد نے اپنے موضوعات دیہی، نیم شہری اور قصباتی ماحول سے کشید کیے۔ انہوں نے ''آزاد نظم'' کو اپنے شعری تجربات کے ذریعے فکری، معنوی اور موضوعاتی وسعت عطا کی۔ اسی دور میں وزیر آغا، جیلانی کامران، احمد فراز، مصطفیٰ زیدی، منیر نیازی اور اختر حسین جعفری نے بھی آزاد نظم میں تجربات کیے۔ موجودہ عہد کے آزاد نظم لکھنے والے شعرا میں ضیاء جالندھری، آفتاب اقبال شمیم، احمد ظفر، عرش صدیقی، افتخار جالب، ستیہ پال آنند، بلراج کومل، علی محمد فرشی، جاوید

انور، وزیر آغا، نصیر احمد ناصر، روش ندیم اور رفیق سندیلوی وغیرہ شامل ہیں۔ ایذرا پاؤنڈ نے آزاد نظم لکھنے والوں کو نصیحت کی کہ وہ اپنی نظم میں کوئی غیر ضروری یا فاضل لفظ استعمال نہ کریں اور ایسے توصیفی کلمات کو شامل نہ کریں جو کسی نئی صورت حال کو ظاہر کر رہے ہوں۔ عزیز حامد مدنی لکھتے ہیں کہ: ''فرانسیسی شاعر پال فارگو کے یہاں نظم آزاد کا تصور محض اس لیے تھا کہ وہ خیالات کو بغیر مسخ کیے ان کا اظہار کر سکے۔'' (۵۳)

جدید نظم: بیسویں صدی میں

اقبال جس دور میں شہرت کی بلندیوں پر تھے اور جب اقبال کی فکری شاعری ہونے کی وجہ سے دیگر شعرا اقبال کی پیروی میں فخر محسوس کرتے تھے، اسی عہد میں رومانوی تحریک نے سر اٹھایا۔ رومانوی شعرا نے نظم پر خاص توجہ کی اور ان کے لیے اقبال کی شاعری ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ اس تحریک نے محبت کے جذبے کو رفعت اور عظمت سے مملو کر دیا تھا اور گوشت پوست کے جسم اور اس کے ارضی مقاصد کے مقابلے میں ایک مثالی اور ارفع دنیا کو اپنی منزل قرار دیا تھا۔ ایم نذیر احمد تشنہ کے بقول: ''رومانی تحریک نے سرسید کی اصلاحی تحریک کی پیدا کردہ عقلیت اور جذبات کے فقدان پر ایک کاری ضرب لگائی اور جذبات داخل کر کے آئندہ کے لیے متوازن نکتۂ نظر اختیار کرنے کی راہیں کھول دیں۔'' (۵۴) رسالہ مخزن کے ذریعے ایسے بہت سے ادیب ظاہر ہوئے جنھوں نے رومانی خیالات کو فروغ دیا۔ رومانی شعرا نے شاعری میں طغیانِ جذبات کو زیادہ اہمیت دی۔ اس قسم کی شاعری میں کیف کم اور لذتیت زیادہ تھی اس لیے اس شاعری نے نوجوانوں کو زیادہ متاثر کیا۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے رومانی تحریک کے آغاز کی ایک وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''روسو کے افکار کے نتیجے میں چھا جانے والی رومانویت کے ذریعے نیا تصورِ حیات ابھرا، جس میں مال و دولت پر انسان کو اہمیت اور ترجیح حاصل ہوئی۔'' (۵۵)

ٹیگور کی ''گیتا نجلی'' کا ترجمہ رومانوی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب میں رومانوی شاعری کے اثرات انگریزی ادب سے مرتب ہوئے ہیں۔ ٹیگور کا فلسفہ ہندو تصوف کا عکس ہے لیکن اس میں انفرادیت ہے۔ اُس کی شاعری میں عقلیت پسندی کے بجائے جذبات کی بغاوت اور انسان کی مجبوری کے خلاف احتجاج ہے۔ ٹیگور کی ''گیتا نجلی'' کے اردو تراجم ہوئے۔ بنگال کے نذرالاسلام بھی رومانویت میں مشہور ہوئے۔ وہ ۱۸۹۹ء میں ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ اُن کی شاعری کے اردو تراجم نے اردو شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ نذرالاسلام نے ظلم کے خلاف بغاوت کی اور انقلاب کی حمایت

کی۔

اختر شیرانی کا تعلق رومانوی تحریک سے تھا اور ان پر اس تحریک کی تکمیل بھی ہوئی۔ اختر شیرانی منفرد لب ولہجہ کے مالک تھے اور اپنے اس مخصوص لب ولہجہ کی بنا پر شاعر رومان کہلائے۔ ان کی رومانیت میں ایک بغاوت تھی، آپ نہ صرف حسن وعشق کے شاعر تھے بلکہ آزادی کے بھی شاعر تھے۔ بقول ڈاکٹر یونس حسنی: ''اگر اردو میں رومانی شاعری کی کوئی نمایندگی کرسکتا ہے تو وہ اختر شیرانی ہیں۔''(۵۶) اختر شیرانی نے اقبال سے مکمل انحراف کیا۔ جس زمانے میں اختر شیرانی نے رومانوی شاعری کو اپنایا، اس دور میں اقبال اور جوش کی شہرت عروج پر تھی۔ اختر شیرانی اور دیگر رومانوی شعرا کی مٹھاس بھری شاعری اقبال کی رعب دار زبان کے مقابلہ میں چمک گئی۔ رومانوی شعرا نے نظم کی سپردگی، مٹھاس اور سوز وگداز سے آشنا کیا۔ انہوں نے نظم کو سنجیدگی اور گرانی سے بچایا اور نظم کو وعظ ونصیحت کی آماج گاہ بننے سے روک لیا۔ تشنہ بریلوی روزنامہ ایکسپریس میں اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں کہ: ''شاعر تھے اختر شیرانی جو اردو میں رومانی شاعری کے کیٹس اور شیلے کہے جاسکتے ہیں اور جن سے فیض صاحب، ندیم صاحب، عبد الحمید عدم، ساحر لدھیانوی، مجید ملک، ظہیر کاشمیری وغیرہ نے بھی اثر قبول کیا۔''(۵۷)

اختر نے نسوانی حسن اور عشق کی والہانہ کیفیات کو نظم کی صورت دی۔ اختر حسین عورت کے پرستار تھے اور اس سے باتیں کرنے کا شوق رکھتے تھے۔ اُس کی شاعری میں کائنات عورت کے جمالیاتی روپ میں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اختر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''بلاشبہ اختر شیرانی متنوع جہات کا شاعر نہیں اور اس کی رومانیت کے سب زاویے عورت کی ذات کا عکس ہیں یا پھر لوٹ کر عورت کے وجود میں ضم ہوجاتے ہیں، ان کی شاعری کی سطحی جاذبیت نے انہیں صرف نوجوانوں کا محبوب شاعر بنادیا۔''(۵۸) اُس نے جیتی جاگتی عورت کو نظم میں اہم موضوع بنایا اور نظم کو خارج سے باطن کی طرف موڑ دیا۔ اختر اپنے پیش رو شعرا اقبال، چکبست اور جوش وغیرہ سے تخلیقی انحراف کرتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں عورتوں کے نام لیتا ہے اور اردو نظم کو سلمی، عذرا، ریحانہ وغیرہ کردار دیتا ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی لکھتے ہیں کہ:

> اختر کا ایوانِ زندگی بھی سلماؤں، عذراؤں اور ریحاناؤں کے رومانوں، شراب کی سرمستیوں، سگرٹ کے مرغولوں، احباب کی خوش گپیوں اور حسن وعشق کے دل گداز افسانوں سے مزین نظر آتا ہے۔(۵۹)

اختر کی نظموں کے بعد نوجوانوں کے نزدیک شاعری کا مطلب صرف غزل نہیں رہا بلکہ وہ

اپنے عشقیہ جذبات کی تسکین نظم میں پانے لگے۔ پروفیسر ہارون الرشید لکھتے ہیں کہ: ''ان کی نظموں میں حسن و رومان کی ایک ایسی خواب نما دنیا ملتی ہے جو نوجوانوں پر خود فراموشی کا عالم طاری کر دیتی ہے۔'' (۶۰) اختر نے اپنے بعد کے شعرا کو متاثر کیا جن میں ن م راشد اور فیض احمد فیض کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مغربی ادب اور انگریزی زبان سے لگاؤ کے ذریعے برصغیر کے تخلیقی رویوں میں جو تبدیلیاں سامنے آئیں، اختر شیرانی نے اردو شاعری میں انہیں معرّا نظم اور آزاد نظم کے ذریعے متعارف کرایا۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> اقبال کی فنی اور فکری توانائی کا مقابلہ کرنے کی کسی میں سکت نہ تھی، چنانچہ اقبال کا رنگ ان کا منفرد انداز بن گیا جس کی تقلید ممکن نہ تھی۔ اقبال کے اس فلسفیانہ انداز کے ردّعمل کے طور پر رومانوی رویّے نے جنم لیا۔ اقبال کی شاعری سے عورت غائب تھی۔ رومانوی طرز میں اس کا اس قدر ردعمل ہوا کہ نہ صرف گوشت پوست کی عورت شاعری کا حصہ بنی بلکہ اس کے نام تک متعین ہو گئے۔ اختر شیرانی کی نظموں اور گیتوں نے اقبال کی بھاری بھرکم فکری فضا میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ (۶۱)

اختر شیرانی کے علاوہ رومانی تحریک کے ایک اہم شاعر جوش ملیح آبادی تھے۔ اُن کی رومانویت کا ایک زاویہ ان کی انقلاب پسندی تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ہر شے کو رومانی نظر سے دیکھا۔ وہ اپنی شاعری مین مختلف مناظر و مظاہر کو رومانی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ تشبیہات و استعارات کا استعمال جا بجا کرتے ہیں۔ اقبال کے بعد جوش کی شاعری فطرت کی رنگا رنگیوں سے مزیّن ہے۔ جوش فطرت کا عاشق نظر آتا ہے۔ اُس کی نظموں میں فطرتی مناظر کی بڑی دلکش تصویریں ملتی ہیں۔ جوش کا ایک رومانی شعر ملاحظہ ہو:

عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کا خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز، پتھریلا شباب

جوش نے پابند نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اور ہمیشہ غزل کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی مرثیہ نگاری اور رباعیات میں جذبات کی طغیانی ہے۔ جوش کے انقلابی ذہن کو پا کر ترقی پسند تحریک نے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا لیکن جوش نے ترقی پسند تحریک کے منشور سے ہٹ کر اپنے انداز میں اپنی شاعری جاری رکھی۔ رومانی تحریک کے بارے میں پروفیسر ہارون الرشید لکھتے ہیں: ''نثر میں نیاز فتح پوری اور نظم میں جوش ملیح آبادی اس تحریک کے سرخیل تھے۔'' (۶۲)

حفیظ جالندھری بھی رومانی تحریک سے وابستہ رہے۔ان کا رومانویت کا انداز ارض وطن اور دین اسلام کی محبت سے ظاہر ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی گیت نگاری میں مظاہر اور فطری اشیا سے محبت ظاہر کی صرف عورت سے محبت کا اظہار ان کی شاعری میں نہیں ملتا۔ڈاکٹر محمد دین تاثیر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن بنیادی طور پر وہ ایک رومانوی ادیب تھے۔انہوں نے جلد ترقی پسند تحریک سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ان کی آزاد نظموں میں مغرب کے رومانی شعرا کے اثرات موجود ہیں۔تاثیر کے شعری تجربات سے جدید شاعری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔احسان دانش بھی رومانی تحریک کے شعرا میں شامل ہیں۔ان کی نظموں میں فطرت کے مظاہر بہت دلکشی سے بیان کیے گئے ہیں لیکن ان کی شاعری کا بنیادی موضوع غم ہے۔ان کی خودنوشت جہان دانش اہم ادبی کارنامہ ہے۔

رومانی تحریک نے اس دور کے کئی اور شعرا کو بھی متاثر کیا جن میں روش صدیقی، حامد اللہ افسر میرٹھی، علی اختر حیدر آبادی، اختر انصار دہلوی، ساغر نظامی اور الطاف مشہدی وغیرہ شامل ہیں۔روش صدیقی نے زمینی حقائق کو رومانی انداز سے دیکھا اور ملک سے محبت کو اپنی شاعری میں ظاہر کیا۔حامد کی شاعری میں موسیقیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔علی اختر بھی حب الوطنی اور وطن کے خوبصورت نظاروں کو بیان کر کے رومان پیدا کرتے ہیں۔اختر انصاری کی رومانیت شکستِ خواب کی المیہ حالت سے پیدا ہوتی ہے۔ساغر نظامی نے اپنی ذات کی کائنات سے رومان پیدا کیا۔الطاف مشہدی کی شاعری اختر کی شاعری سے متاثر دکھائی دیتی ہے۔ان کی شاعری میں عورت کا سراپا بیان ہوتا ہے اور اقبال کا رومانوی انداز دور دور تک دکھائی نہیں دیتا بلکہ اس کا ردّ ملتا ہے۔

نظم معرّا اور آزاد نظم کو جدید ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریک نے مقبول بنا دیا۔ترقی پسند تحریک نے اس صنف کو اتنا عام کر دیا کہ اب ہر کوئی اس صنف سے آشنا ہو گیا ہے بلکہ اب تو نثری نظم اور آزاد غزل کے مباحث چھڑ چکے ہیں۔ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا، یہ تحریک بہت تیزی سے پھیلی۔اردو کے اُس دور کے تقریباً تمام بڑے شاعروں نے اس کا خیر مقدم کیا جن میں جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری اور اقبال شامل ہیں۔ترقی پسندوں کے امام جوش ملیح آبادی ہیں۔ترقی پسند شعرا نے بھی جدید شاعری میں بہت سے تجربات کیے۔ترقی پسند تحریک نے اپنے اظہار کے لیے نظم کو زیادہ اہمیت دی۔ظہیر کاشمیری اور مختار صدیقی نے شعری آہنگ میں نئے نئے تجربات کیے۔۱۹۳۶ء میں اردو میں ترقی پسند تحریک کی آمد سے بندشوں اور جکڑ بندیوں کے خلاف ایک لاوا اُبھرا اور یہیں سے قافیانہ قید و بند کے خلاف احتجاج کی آواز بلند ہوئی اور نظم معرّا اور نظم آزاد کی کرنیں تیز ہوئیں۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالنے والے ادیب فکر و فن کے جدید ترین

رجحانات کے علمبردار تھے۔انہیں احساس تھا کہ اب امیری اور غریبی کی تقسیم ہمیشہ رہنے والی نہیں۔(۶۳) ترقی پسند تحریک نے پہلی بار سیاسی نظم نگاری کی۔بقول عتیق اللہ:''ترقی پسند تحریک ایک ادبی تحریک تھی مگر اس کے سلسلے سیاست سے بھی ملتے تھے۔ترقی پسند شعراء نے پہلی بار سیاسی نظم کے تصوّر کو فروغ دیا۔''(۶۴) ترقی پسند تحریک نے غریبوں محتاجوں اور مزدوروں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی۔سرمایہ داروں اور زمینداروں کے خلاف آواز بلند کی ڈاکٹر عتیق اللہ ترقی پسند تحریک کی فکر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ترقی پسند فکر نے تھامس گرین، ایف، بریڈلے، جے، رائس، جے میک ٹیگارٹ اور دیگر رجعت پسند نو ہیگل وادیوں کے ان تصورات کی تنکیر کی جو اپنے اساس میں مذہب و نظری فلسفے کا دفاع کرتے ہیں۔''(۶۵)

ترقی پسند شعراء نے روایت سے انحراف کیا اور سرمایہ داری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔کلیم الدین احمد کے بقول:''وہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ شاعری بھی آفاقی قسم کی چیز ہے، کسی ایک طبقے یا گروہ کی جاگیر نہیں۔وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیز انھیں صرف وراثت میں ملی ہے۔''(۶۶)

فیض، ندیم اور عارف متین نے جوش و خروش سے بچ کر لکھا جبکہ جوش کے ہاں خوب جوش و خروش پایا جاتا ہے۔فیض کی شاعری میں انقلاب کا عملی پہلو کم اور اس کا تصوّر زیادہ ملتا ہے۔فیض نے کم لکھنے کے باوجود خوب لکھا۔فیض کی انفرادیت ان کی بے مثل امیجری میں ہے۔انہوں نے انفرادی طرزِ احساس کو ترقی دی، نئے استعارے اور تراکیب وضع کیں۔فیض کے ہاں ترقی پسندانہ عناصر کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے عناصر موجود تھے اس لیے ہم فیض کو مکمل ترقی پسند شاعر نہیں کہہ سکتے۔محبت کے جذبے کو جس خلوص اور شدّت کے ساتھ فیض نے بیان کیا شاید ہی کسی اور شاعر نے اردو شاعری میں اس طرح بیان کیا ہو۔فیض نے ترقی پسند موضوعات پر بھی خوب لکھا ہے۔فیض نے مادّی اور معاشی امتیاز پر سے پردہ اٹھایا اور اسے معاشرتی عدم استحکام کا سبب قرار دیا۔اُس نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر انقلاب کی طرف دھیان دیا ویسے وہ ایک رومانوی شاعر تھا، اُس نے اپنے اندر کی رومانی آواز کو زندہ رکھا۔انور سدید لکھتے ہیں کہ:''عاشقی فیض کی عبادت ہے اور ترقی پسندی ان کا فرض ہے۔''(۶۷) فیض نے روایتی شاعری میں رومانویت اور اشتراکیت کے عناصر کو متحد کر دیا۔اُن کی نظم ''موضوعِ سخن'' رومانیت، اشتراکی خیالات اور جذبہ حب الوطنی کے جذبات سے بھری ہوئی ہے۔فیض نے عصری تقاضوں، فکری رجحانات، ظلم و استبداد، غیر یقینی ملکی حالات اور قلبی انتشار کے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔

جب راشد اور میراجی جدید نظم کی شعریات وضع کر رہے تھے، اس دور میں ترقی پسند شعرا چند سال کا سفر طے کر کے اس مقام پر تھے جہاں نئے انسانی منشور کی تبلیغ کمال پر تھی۔ عوامی مسائل اور موضوعات کو مخصوص علامتوں اور کہیں غیر ملفوف پیرائے میں نظم کیا جا رہا تھا۔ اسی دور میں فیض منظر عام پر آئے، فیض نے ترقی پسندوں کی نظموں کے نمونے پر نظمیں کہنی شروع کیں۔ فیض کے بارے میں رفیق سندیلوی لکھتے ہیں: ''کچھ اپنے مزاج کے دھیمے پن، کچھ مغربی نظم کے فنی و معنوی رموز سے واقفیت اور کچھ راشد اور میراجی کی، استوار ہوتی ہوئی شعریات سے دانستہ دور رہنے کے سبب ان کی نظم میں ایک ایسی جمالیاتی امیجری پیدا ہوگئی جو ان کے قبیل کے ہم عمر اور سینئر شعرا سے زیادہ جاذب تھی۔'' (۶۸) فیض کی کچھ نظمیں ایسی ہیں جو فیض کو ایک شاعر کے طور پر بھرپور طریقے سے متعارف کراتی ہیں۔ فیض ایک مرکزی نظریے اور احساسات کا شاعر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فیض ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے لیکن اس تحریک میں جو شدّت پائی جاتی ہے، فیض نے اس سے گریز کرتے ہوئے اعتدال کی راہ اختیار کی۔ اپنی شدّت اور ذہنی انتشار کی وجہ سے ترقی پسند ادب پراپیگنڈے اور نعرے بازی میں تبدیل ہو گیا۔

فیض کی پیروی میں احمد ندیم قاسمی نے نظم میں انسان دوستی کا زاویہ ابھارا ہے۔ حسرت موہانی، جوش، مجاز، جواد علی سردار، ن م راشد، احمد ندیم، ساحر اور مخدوم نے اپنی شاعری میں سیاسی عناصر کو گھلایا اور ان میں کامیاب اشعار کہے۔ ندیم کی خوبی تخیّل اور جذبہ کی فنکارانہ ہم آہنگی اور پھر اس کا خوبصورت اظہار ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

> احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسندی کو لیبل کے طور پر استعمال کرنے کے برعکس اسے شعارِ زیست جانا اور ترقی پسندی کے آدرش کو فکری سطح پر اپنی شاعری میں شامل کیا۔ اس لیے ان کے ہاں نعرہ بازی نہیں بلکہ گہری سوچ ملتی ہے۔ (۶۹)

ظہیر کاشمیری نے ترقی پسندانہ سوچ کو کلیشے کے طور پر استعمال نہ کیا بلکہ اسے زندہ نظریہ حیات جانا۔ عارف متین نے خالص ترقی پسندی کا فلسفہ بیان کیا۔ احسان دانش کا شمار بھی ترقی پسند شعراء میں ہوتا رہا ہے جو شاعر مزدور سے مشہور ہیں۔ ان کی نظموں سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نظموں کے موضوعات ان کی زندگی کے تجربات تھے۔ مفلوک الحالی، استحصال، عورتوں کی زبوں حالی، تعلیم کا فقدان، غیر برابری اور سرمایہ داری طور طریقوں کا جبر و تشدد ایسے موضوعات تھے جو ترقی پسند نظم کی پہچان بنے۔ اس لیے جو بھی اس طرح کے موضوع پر نظم کہتا وہ ترقی پسند کہلاتا۔

علی سردار جعفری ترقی پسند شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ان کی شاعری ترقی پسند منشور کی پابند اور اشتراکی مقاصد کے حصول کا وسیلہ نظر آتی ہے۔انہوں نے مزدوروں، کاشتکاروں اور محنت کشوں کے مسائل پر ولولہ انگیز نظمیں لکھیں۔مخدوم محی الدین کی شاعری میں فیض کی تقلید دکھائی دیتی ہے۔ان کی تعلیم وتربیت مارکسی تعلیمات کے زیر اثر ہوئی۔ترقی پسندوں کے خاص موضوعات سے ہٹ کر جو نظم لکھتا، اسے ترقی پسند زمانی تقاضوں سے ہم آہنگ شاعر نہ مانتے تھے۔حالی نے جس جدید نظم کا تصوّر پیش کیا تھا، ترقی پسند تحریک نے اسے موضوعاتی طور پر آگے بڑھایا۔ترقی پسند شعرا نے جو شعری تجربے کیے ہیں وہ اردو ادب کا اہم حصہ بن گئے ہیں۔ترقی پسند تحریک ایک مؤثر اور پُر جوش سماجی تحریک تھی۔اس تحریک نے معاشی ناانصافی کے دور میں انسانیت اور مساوات کو بلند تر درجہ دیا۔عام انسان، محنت کش اور کسان کو ادب کا موضوع بنایا۔ترقی پسند شعرا کی نظموں میں دو عیوب واضح نظر آتے ہیں، ایک تو یہ کہ ان کی اکثر بہترین نظموں میں تکرار ہے اور دوسرا یہ کہ انہوں نے غزل کی زبان میں نظم کہی، نہ جانے کیوں انہیں نظم کے لیے الگ زبان کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ترقی پسند شعرا نے طویل نظم کی طرف توجہ دی جس نے اردو ادب اور جدید اردو نظم کی تاریخ میں اہم اضافہ کیا۔ترقی پسند تحریک شروع سے ہی آزادی، انقلاب اور اشتراکیت کی طرف مڑ گئی یوں ادب کو پراپیگنڈے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند تحریک حکومت، روایت اور مذہب پسند حلقوں نے اس کی بھرپور مخالفت کی۔ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں کہ ''اشتراکی تصورات نے مغربی تہذیب کے مادی خیالات سے مل کر مذہبی اقدار پر بڑے سخت حملے کیے۔''(۷۰) لیکن ترقی پسندوں نے تمام عالمِ اسلام سمیت ہندوستان کو غلام بنانے والے سرمایہ داری نظام کی مخالفت کی، عوام کی آزادی اور معاشرتی ترقی کے لیے آواز بلند کی۔انہوں نے ایسے مذہبی تصوّرات کی مخالفت بھی کی جو انسانی آزادی، عدل اور مساوات کی راہ میں رکاوٹ تھے۔

ترقی پسند تحریک سے نامتفق حضرات نے ایک الگ پلیٹ فارم حلقہ ارباب ذوق کی شکل میں قائم کیا۔جس دور میں ترقی پسند شاعری اپنے کمال پر تھی اسی زمانے میں حلقہ ارباب ذوق بھی شباب پر تھا۔حلقہ کے شعرا نے شاعری میں سیاست سے گریز کیا۔انہوں نے نظم کی ہئیت میں تجربے کیے اور اظہار و ابلاغ کے نئے رستے تلاش کیے۔انہوں نے نظم کی زبان کو غزل کی زبان سے الگ کیا۔اس تحریک کے ادبا نے فرد کے اندر کی گم شدہ آواز کو سننے کی کوشش کی۔اس تحریک نے انسان کو اپنی شخصیت کی پہچان کی طرف متوجہ کیا۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ: ''حلقہ ارباب ذوق کی شاعری میں بنیادی اہمیت اس حقیقت کو حاصل ہے کہ شاعر خارج اور باطن کی دو دنیاؤں میں آہنگ اور توازن کس فنکارانہ طریقے سے پیدا کرتا ہے۔''(۷۱) حلقہ ارباب ذوق نے ادب میں نئی روح پھونک دی۔اِس تحریک نے مغربی جدیدیت سے متاثر ہو کر فردیت، ہئیت پسندی اور

نفسیاتی حوالوں کے تحت نئے تجربے، نئی ہئیت اور نئے سوال کو اہمیت دینی شروع کی۔ حلقہ کے شعرا نے ترقی پسند شعرا کو بھی متاثر کیا۔ ۲۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو حلقہ ارباب ذوق کا پہلا اجلاس حفیظ ہوشیار پوری کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ میرا جی، شیر محمد اختر، قیوم نظر، ن م راشد، حفیظ ہوشیار پوری، امجد حسین، شہرت بخاری، یوسف ظفر وغیرہ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں نظر آتے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق نے بھی نظم کو زیادہ اہمیت دی۔ ایم نذیر احمد تشنہ لکھتے ہیں کہ: ''حلقۂ ارباب ذوق نے اپنی بساط ترقی پسند تحریک کی خارجیت اور مادّیت کے ردعمل کے طور پر بچھائی اور اس نے مادیت سے گریز اور روحانیت و داخلی جذبات کے اظہار کا درس دیا اور اس نے رومانی تحریک کے باقیات کو محفوظ رکھنے کی سعی کی۔'' (۷۲) ترقی پسند اجتماعیت کو مقدّم مانتے تھے جبکہ حلقہ ارباب ذوق کے لیے فرد مقدم تھا۔ کچھ لوگ میرا جی کو ترقی پسند تحریک کا مخالف سمجھتے تھے اور حلقہ ارباب ذوق کو میرا جی کا حلقہ قرار دیتے تھے۔ قیوم نظر کے کہنے پر میرا جی حلقہ میں آنے لگے۔ ایک مضمون میں عمران ازفر نے میرا جی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> میرا جی نے حلقہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انتظامی معاملات سے لے کر تنقیدی معیار تک انہوں نے حلقے کے مسائل میں پوری دلچسپی لی۔ میرا جی تقریباً ہر جلسے میں شریک ہوا کرتے تھے اور قواعد و ضوابط کے سخت پابند تھے۔ وہ حلقہ کے انتظامی معاملات میں کسی طرح اور کسی قسم کی رعائیت کے قائل نہیں تھے۔ یہاں تک کہ وہ حلقہ کے انتخابات میں گرمی اور جوش پیدا کرنے کے لیے خود بھی امیدوار بن جاتے اور ہار جاتے لیکن اس ہار جیت سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ان کا اصل مقصد تو حلقے کی ترقی تھا۔ (۷۳)

۱۹۴۰ء تک حلقہ ارباب ذوق میں تقریباً سبھی قسم کے لوگ آنے لگے تھے۔ سال کی بہترین نظموں کو کتابی صورت میں شائع کرنا حلقہ کی روایت بن چکا تھا اور اس انتخاب میں حلقہ نے کبھی تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا۔ جمیل ملک لکھتے ہیں کہ: ''حلقہ ارباب ذوق کے مکتبِ خیال سے وابستہ جدید تر شعراء بھی اپنے پیش روؤں کے برعکس ذات کی تنگنائے سے نکل کر نئے علوم کی مدد سے کائنات کے نئے افق دریافت کرنے لگے۔'' (۷۴) قیامِ پاکستان کے بعد جنرل ایوب کے مارشل لاء کے دوران پاک امریکا دفاعی معاہدے ہوئے جن کا ہدف عالمی اشتراکیت سے سرمایہ دار دنیا اور مفادات کو محفوظ رکھنا تھا لہٰذا اس کے تحت ترقی پسند تحریک پر پابندی لگا دی گئی اور ترقی پسندوں کی مخالفت اور پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ یوں حلقہ ارباب ذوق میں بھی بہت سے

ترقی پسند شریک ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ تاثیر اور فیض صاحب بھی حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں نظر آنے لگے۔ حلقہ ارباب ذوق ادبی اور سیاسی دھڑوں میں بٹ گیا اور سیاسی پر ترقی پسند غالب آ گئے۔ حلقہ ارباب ذوق کوئی شعوری طور پر تحریک نہ تھی اور نہ ہی اس کی کوئی لیڈر شپ تھی۔ اس میں سالانہ انتخابات ہوتے اور یوں ہر سال بعد ایک نئی قیادت سامنے آتی، یہی وجہ ہے کہ حلقہ ارباب ذوق ساٹھ سال تک قائم رہی ورنہ اکثر ادبی تحریکیں جلد دم توڑ جاتی ہیں۔ یہ جماعت ایک اوپن پلیٹ فارم تھا جہاں ہر طرح کا قلم کار تخلیق پیش کر سکتا تھا، بحث کر سکتا تھا اور جمہوری طریقہ سے اس میں اپنا کردار ادا کر سکتا تھا۔ بہر حال کیونکہ اس جماعت کے نمایاں قلم کار ترقی پسند تحریک کے خلاف تھے اس لیے اسے ترقی پسند تحریک کی مخالف جماعت سمجھا جانے لگا۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> تیس اور چالیس کی دہائیوں میں مغربی نظم اور دیگر تحاریک و رجحانات کے حوالے سے نظم کا ایک نیا مزاج وجود میں آیا۔ میراجی اور راشد نے جدید طرز کی نظم کی بنیاد رکھی، خصوصاً میراجی نے جدید نظم میں مصرع سازی کے تصور کو نہ صرف مضبوط کیا بلکہ ایک حوالے سے مصرع لکھنے کا ڈھنگ سکھایا۔ (۷۵)

ترقی پسند شعرا کے متوازی میراجی اور ن م راشد اپنی ذات میں ایک جداگانہ رجحان کا جہاں آباد کیے نظر آتے ہیں۔ اختر الایمان ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ رہے لیکن اُنہیں زیادہ قدر حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہونے کے بعد حاصل ہوئی۔ میراجی، ن م راشد کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اختر الایمان کو حاصل ہے۔

ترقی پسندوں نے خارجیت اور حقیقت نگاری پر زور دیا جبکہ میراجی کی جنسی محرومی اور راشد کی دروں بین شاعری اس کا ردِّ عمل قرار دی جا سکتی ہے۔ ن م راشد اردو کی روایتی شاعری سے فنی اور معنوی انحراف کی ایک مثال ہے۔ وہ سخت اور کھردرے جذبات کا شاعر تھا۔ وہ ایک ایسے مجتہد کی صورت میں ابھرا جو قدیم سے بغاوت کر کے اپنی نئی شعری روایت قائم کرتا ہے۔ ن۔م راشد کے ہاں گناہ کی خواہش، لذّت اور کشمکش محوری مسئلہ رہی۔ گناہ کا کانٹا راشد کے دل کی پھانس ہے جو اسے خدا کے وجود سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ راشد کے ہاں گریز کے ساتھ ساتھ مایوسی کی جو فضا ملتی ہے، وہ ترقی پسندی کے بنیادی فلسفہ کے خلاف ہے۔ راشد کے استعارے بہت پیچیدگی اور گہرائی کے حامل ہیں۔ راشد کا ''فرد'' معاشرے کے اس ہر لمحے بڑھتے ہوئے ہیُولے طبقے کی ایک حقیقی ہستی ہے جو مغربی تعلیم کے باعث اور مغربی تہذیب کی بغیر سوچے سمجھے

اطاعت میں اپنی ساری روایات سے قطع تعلق کر بیٹھا تھا۔ راشد کی بیشتر نظمیں اسی فرد کے منفی رجحانات کی سے بھرپور ہیں۔ اقبال اور راشد کی شاعری میں یہی بنیادی فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ راشد کی شاعری میں ایک گوشت پوست کی عورت نظر آتی ہے اور اُس نے محبت کو صرف جسمانی لذّت تک محدود کر دیا ہے۔ ایک زاویے سے یہ راشد کا اہم کارنامہ بھی بنتا ہے کہ اس نے محبت کو تخیل سے نکالا اور ہمیں اس کے مادّی پہلوؤں کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی لیکن مسئلہ یہ بنا کہ راشد نے محبت کے مادّی پہلوؤں کو ہی سب کچھ سمجھ لیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں کہ: ''راشد کی شاعری ذہنی فرار اور شکست خوردگی سے عبارت ہے اور پناہ کے لیے وہ ہمیشہ کسی جنسی خواب گاہ کا ہی رخ کرتا ہے۔'' (۷۶)

راشد کی شاعری میں ترقی پسندوں کی سی ایک اہم چیز جو دکھائی دیتی ہے وہ غیر ملکی غلبے اور اجنبی حکومت کے خلاف نفرت، نافرمانی اور بغاوت ہے اور حقیقت میں یہی بغاوت راشد کی شاعری کا اہم حصّہ ہے۔ راشد نے اکبر یا اقبال کی طرح غیر ملکی تہذیب کی مذمت نہیں کی بلکہ ایک باغی سپاہی کی طرح دشمن سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ راشد نے اپنی شاعری کے ذریعے برصغیر پر برطانوی غلبے پر سخت تنقید کی اور اس کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی بلکہ اس غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک سپاہی بن کر کھڑے ہو گئے اور اسے ناجائز قبضہ پر خوب برا بھلا کہا۔ یہی وجہ ہے کہ راشد اردو کا ایک بہت بڑا قوم پرست شاعر ہے۔

میراجی کی شاعری رومانی اور ترقی پسند شاعری کی ضد قرار دی جا سکتی ہے۔ رومانی شاعر اختر شیرانی نے محبت کی ارفع اور مثالی صورت پیش کی تھی جب کہ میراجی نے محبت کے ارضی پہلوؤں کو اہمیت دی۔ اسی طرح ترقی پسند شاعر فیض نے خارجی زندگی میں ایک مثالی معاشرے کی تکمیل کا خواب دیکھا جب کہ میراجی کے ہاں داخلی زندگی کی پیچیدگیاں اور اسرار زیادہ جاذب نظر متصوّر ہوئے۔ میراجی کی شاعری بڑی حد تک فرانس کے شعرا۔۔۔ ملارمے اور بودلیئر وغیرہ سے متاثر لگتی ہے۔ اردو شاعری میں میراجی متنوّع تجربات کے حامل ہیں۔ ان میں زیادہ اہم جنسی نفسیات، علامت اور ہیئت کے تجربات ہیں۔ ان تجربوں سے اردو ادب کو ایک نیا پیرایہ اظہار ملا اور شاعری کی ایک نئی روایت نے جنم لیا۔ جنسی نفسیات کا تجربہ میراجی کی شاعری کا منشور ہے۔ میراجی کا ابہام اور علامت پسندی فرانسیسی اثرات کی مرہون منت تھی جبکہ جنسی کجروی اور مریضانہ لذت پرستی کا چشمہ اس کی اپنی جنسی محرومیوں سے پھوٹا تھا۔ میراجی کی شاعری نظیر اکبر آبادی کے بعد پہلا شاعر ہے جس کی شاعری سے ہندوستان کی مٹی کی مہک آتی ہے۔

میراجی کی نظموں میں روح کی سرشاری کے ساتھ ارضی وابستگی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی ثقافت اور جڑوں کو بھی اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ میراجی نے ایک فقیر اور درویش کی

طرح اپنی مٹی کو چاہا ہے۔ان کی نظم میں جنس ومحبت کے جذبے نے قدیم ہندوستان کی دیومالا، اساطیر اور تصاویر کی فضا سے مل کر وہ اسراریت پیدا کی جوان کے کسی دوسرے ہم عصر شاعر کو نصیب نہ ہوئی۔رفیق سندیلوی میراجی کے بارے میں لکھتے ہیں: ''میراجی بنیادی طور پر تڑپ کا شاعر ہے، اسے خود اپنی صورت کو دیکھنے کی تڑپ ہے۔جذب وجنون کی حالت میں خود کو تحلیل کرنے کی تڑپ ہے۔یہ تڑپ ان کی اکثر نظموں میں پائی جاتی ہے۔''(۷۷) میراجی اور ن۔م راشد کا آزاد نظم کا تجربہ کامیاب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے الگ لہجہ وانداز اختیار کیا تھا۔راشد کا تخلیقی سفر نظم کی مغربی ہیئتوں اور فارسی کی نسبت سے بنے ہوئے لہجے میں تھا جبکہ میراجی نے بھی اسی لہجے سے جڑے رہ کر ہندی اور سنسکرت کو برتری دی۔ان دونوں شعرا کے جنسی معاملات بھی ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھے۔میراجی جسم نا آشنا اور راشد اس کے برعکس جسم آشنا تھے۔ان رویّوں کا عکس دونوں کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے لیکن عورت اور مرد کا جنسی رشتہ دونوں کو مرغوب تھا چاہے وہ مباح ہو یا نہ ہو۔میراجی جدید نظم کا اہم شاعر تھا، اُس نے انسانی سائیکی کی مدھم آواز کو اردو نظم کی بنت میں شامل کرنے کا جو تجربہ کیا، بعد میں اسی پر نئی نظم کا محل تعمیر کیا گیا اور میراجی کو اردو نظم کا بزرگ مانا گیا ہے۔

راشد اور میراجی کے بعد جدید نظم کے تیسرے اہم شاعر مجید امجد ہیں۔ان کی ابتدائی نظموں میں اقبال کے اثرات نمایاں ہیں اور کہیں کہیں اختر شیرانی کا سایہ بھی دکھائی دیتا ہے لیکن بعد کی شاعری میں واضح فرق نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنے کلچر اور تہذیب کو دیہی اور نیم شہری فضا کے عمق سے دریافت کیا اور اس کے علامتی مافیے میں زندگی کے تسلسل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

> مجید امجد کی نظموں کے مطالعے سے پہلا تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ شاعر کے باطن کی دنیا خارج کے مظاہر سے منسلک اور ہم آہنگ ہے۔مجید امجد کے مشاہدے کی یہ خوبی دلکش ہے کہ اشیاء کی طرف اس کے جھکاؤ کا انداز محسوساتی ہے تجزیاتی نہیں۔وہ ''حال'' کا شاعر ہے اور حال کے بھی اس لمحے کا شاعر جو ابھی تھا اور اب نہیں ہے۔جو ابھی مستقبل تھا اور اب ماضی کا حصہ بن گیا ہے۔لیکن مجید امجد کی خوبی یہ ہے کہ وہ حال کے اس لمحے کو اپنی گرفت میں لے کر وقت کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔(۷۸)

مجید امجد کی انفرادیت یہ ہے کہ ان پر کسی بھی تحریک کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ وہ اپنے ہم عصروں کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ تخلیقی شعور کے حامل تھے جس کا اظہار ان کے خیالات یا اسلوب سے نہیں بلکہ

اُن کی نظموں کی فضا سے ہوتا ہے۔ مجید امجد نے ایک ہی وقت میں انسان اور کائنات اکبر سے تخلیقی سطح پر رابطہ قائم رکھا۔ انہوں نے وقت کو کائنات کے تخلیقی استعارے کے طور پر استعمال کیا۔ اختر الایمان، مجید امجد کے ہم عصر شاعر تھے۔ ان کی نظموں کا اہم موضوع ماحول کی یکسانیت میں روزمرّہ کے انسانی معمولات کی تکرار ہے۔ اختر ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے لیکن اس کے پختہ پیروکار نہیں تھے۔ اُس نے موضوعات کے داخل اور خارج کو تلاش کرنے اور اسے اندر کی کائنات سے جوڑنے کی کوشش کی اور نظم میں جذبے کے ربط کو فن کاری سے پیش کرنے کی روایت قائم کی۔

یوسف ظفر نے جوش کے مشورے پر تخلیقی نظم کہی اس لیے انہیں جوش کا پیرو کہا جاتا ہے۔ یوسف ظفر اور میراجی کا رشتہ بھی گہرا ہے حالانکہ یوسف نے جوش، اختر شیرانی اور احسان دانش کی پیروی کی اور ان پر ترقی پسندی کی مہر بھی ثبت ہوئی لیکن یوسف ظفر حلقہ ارباب ذوق کے ساتھ ابھرنے والی تحریک نظم کے اہم شاعر ہیں۔ یوسف ظفر کی ابتدائی شاعری میں غلامی کا شدید احساس اور آخری شاعری میں وطن عزیز سے گہری محبت اہم موضوعات ہیں۔ یوسف کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات کے سارے مناظر ان کی نگاہوں کی زد پر ہیں۔ یوسف ظفر کی شاعری میں حرکت اور حرارت کا نقش نمایاں ہے اور اسی چور دروازے سے گزر کر ہم اس کی نظموں اور ان نظموں کے پس پشت ایک تڑپتی اور دھڑکتی ہوئی شخصیت کا احاطہ کر سکتے ہیں۔

قیوم نظر بھی اس عہد کے اہم شاعر ہیں، ان کی شاعری میں منزل سے دوری کے باعث خوف، تنہائی، ویرانی اور تھکن کے مضامین جا بجا ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک بھٹکا ہوا محروم اور غمگین نوجوان نظر آتا ہے جسے ہر اجڑے ہوئے نظارے میں اپنا آپ دکھائی دیتا ہے۔ قیوم نظر اردو کی معروف ہیئتوں سے منہ موڑنے والا شاعر تھا، اُس کی نظم کی ہیئت اس کے داخل سے پیدا ہوتی ہے۔

شاعر ضیاء جالندھری نے اپنی نظموں میں زندگی کی مردنی کو موضوع بنایا ہے لیکن شاعر کو یقین ہے کہ اس مردنی میں کہیں کہیں ابھی بھی زندگی کے آثار باقی ہیں۔ ضیا جالندھری کی نظموں میں تجربہ بظاہر زمانی الجھن اور معاشرتی تلخی کا زائیدہ ہے لیکن اس پر انہوں نے ردّعمل ایک صحت مند انسان کی طرح ظاہر کیا ہے۔ ضیا جالندھری نے میراجی سے شعری تربیت حاصل کی لیکن استاد کے اثرات اُس کی شاعری میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ اُس کی شاعری میں میراجی کی طرح نہ تو جنسی گھٹن کی پیدا کردہ امیجری ہے اور نہ اظہار کا اشکال۔ انہوں نے اپنے خاص انداز میں انسانی زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کا ذکر کیا ہے۔ مختار صدیقی کی نظم کی اہمیت صرف یہ ہے کہ انہوں نے راگوں کو نظم میں سمویا اور پنجابی سہ حرفی کی طرز میں نظمیں لکھیں۔ اُس کی شاعری گذرے وقتوں اور گم شدہ ساعتوں کی رومانی سطح پر باریابی کا دوسرا نام ہے۔

منیر نیازی نے اپنی ذات اور اپنے عہد کی ہیبت ناکی کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بیان کرتے ہوئے وہ قدیم انسان کے واہموں اور خطروں کو بھی بیان کرتے ہیں اس لیے ان کے ہاں ایک استعجاب، ایک اسرار اور ایک تحیّر کی فضا پیدا ہوتی چلی گئی ہے۔ ساقی فاروقی نے نظمِ جدید میں جنگلی جانوروں کی جبلت و سرشت اور ان کی معروف سرگرمیوں کے ذریعے انسانی باطن کی کمینگی، نارسائی اور محرومی کو بیان کیا ہے۔ منیر نیازی کی نظموں میں شاعرانہ تمثال کاری، علامت نگاری، حقیقت نگاری اور سماجی بدنظمی جیسے موضوعات موجود ہیں۔

جیلانی کامران ایک ایسے جدید نظم نگار ہیں جنھوں نے دنیا کو باغ اور انسانوں کو ایسے معصوم پرندے قرار دیا ہے جو اپنی مرضی سے ہر کام کر سکتے ہیں اور اپنے دل کا حال سنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جیلانی کامران نے متصوفانہ درد کے راستے سے قلبی مسرت اور روحانی آسودگی کو تلاش کیا ہے۔ اُس کی نظموں میں تصوف اور عشق حقیقی کی روایت دیکھی جا سکتی ہے۔ جیلانی کامران نے اپنی نظم کے بیچ بیچ میں ایک آدھ رکن بڑھا کر نظم کی ہیئت کو محکم کیا، اس انداز کی تقلید بہت کم ہوئی۔ اس کے علاوہ انسان کے دکھ اور کرب اور فطرت نگاری بھی اُس کے اہم موضوعات ہیں۔ جیلانی کامران لسانی تشکیلات کی تحریک کے بھی اہم شاعر ہیں۔

اختر حسین جعفری کو جدید نظم کا امام کہا گیا لیکن ان کی شاعری کے راز کو جاننے کی کوشش بہت کم ہوئی ہے۔ رفیق سندیلوی کہتے ہیں کہ:

> اختر حسین جعفری بنیادی طور پر بروکن امیجری کا شاعر ہے۔ عربی و عجمی روایت سے حاصل شدہ علامتوں، تاریخی سانحات سے چُنیدہ کرداروں، تہذیبی و لسانی سیاق و سباق سے اخذ شدہ تمثالوں، شعور و وجدان کی رَو سے کشید کیے طریقوں اور ارتقائے نظم سے وصول کی ہوئی دانائیوں سے وہ اپنی نظم کے قلب و قالب کو وضع کرتا ہے۔ ان کے ہاں نظم کے اجزا میں الگ الگ امیجز کے توسّط سے زیریں معانی کی قاشیں تو پہلے دستیاب ہو جاتی ہیں مگر کبیری خیال بعد میں ذرا وقت سے ہاتھ لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے اختر حسین جعفری کو بروکن امیجری کا شاعر کہا ہے۔ (۷۹)

غرضیکہ اختر حسین جعفری نے جہاں مغرب کی بروکن امیجری کی تکنیک سے فائدہ اٹھایا ہے وہیں کلاسیکی غزل کی تکنیکی روایت سے بھی مکمل فیض یاب ہوئے ہیں۔

افتخار جالب کی شاعری محسوسات کی شاعری ہے۔اُس نے نظم میں اپنی سمجھ بوجھ سے لسانی، جذباتی اور فکری حرمتوں کی پامالی کی تھی اور ایک نیا شعری منشور بنایا تھا۔افتخار جالب کی اس جرأت مندی نے نظم گو شعراء کی نئی نسل کو اسلوبی سطح پر بہت کچھ سکھایا اور یہی نئی نسل کے نظم گو شعراء نئے سانچوں کی تلاش میں نثری نظم کی طرف آئے اور ان میں سے احمد ہمیش نے نثری نظم کو فطری آہنگ بخشا۔افتخار جالب کے مقلدین میں انیس ناگی اور عبدالرشید اہم ہیں جنہوں نے نئی لسانی تشکیلات کے تحت جدید نظم نگاری کو آگے بڑھایا۔یہاں سرمد صہبائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ستیہ پال آنند بھی اہم شاعر ہیں۔اُن کی نظموں میں روحانی کے ساتھ مادّی تربیت بھی ہوتی ہے۔آنند نے اپنی معرّا نظموں میں بعض اوقات یکساں بحر کے مصرعوں کو باعتبارِ متن نامکمل اور منتشر رکھا ہے اور اسے اگلی سطور تک بڑھنے دیا ہے۔یوں ان کے ہاں مصرعے لگاتار ایک دوسرے میں ضم ہو کر جملوں کی سطح پر اپنے متن کو پورا کرتے ہیں۔آنند نے اس تکنیک کو اپنی آزاد نظموں میں بھی برتا ہے۔ستیہ پال آنند سے قبل فیض اور ایک دو اور شعرا نے اس تکنیک کو استعمال کیا ہے۔

ترقی پسند شعراء نے طویل نظم کو اپنے اظہار کے لیے مناسب سمجھا تھا تب ساحر لدھیانوی کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' کافی مقبول ہوئی تھی۔جدید اردو نظموں میں دو طرح کی طویل نظمیں ملتی ہیں: طویل نظمیں اور نسبتاً کم طویل نظمیں۔کم طویل نظموں کی مثالوں میں ن۔م راشد کی ''حسن کوزہ گر''، مجید امجد کی ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیم طرب'' اور وزیر آغا کی ''اک کتھا انوکھی'' وغیرہ شامل ہیں۔طویل نظموں میں عمیق حنفی کی نظم ''سند باد'' ایک اچھی نظم ہے جو ایک خالی وجود انسان کا رزمیہ بیان کرتی ہے۔اقبال نے بھی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصے میں طویل نظمیں لکھیں۔ان نظموں کو سمجھنے کے لیے رفیع الدین ہاشمی کے بقول: ''اس سلسلے میں ہمیں عالم اسلام کی مختصر تاریخ خصوصاً بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے سیاسی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر پر ایک نگاہ ڈالنی ہوگی۔''(۸۰) وزیر آغا کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' بھی ایک طویل نظم کی مثال ہے۔ابن انشا نے طویل نظموں میں مہارت ظاہر کی ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

> وہ اپنی نظموں میں ایک مخصوص قسم کی نفسی فضا کی تشکیل میں بہت کامیاب رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے مناسب استعارات برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔''چینی نظمیں'' میں چینی نظموں کے بڑے کامیاب تراجم ہیں۔(۸۱)

ترقی پسند تحریک کے بعد جو شعرا سامنے آئے انہوں نے فکری اور فنی سطح پر ترقی پسند تحریک

کے کلاسیکی رویے سے انحراف کیا اور اپنے اس رجحان کا نام ماڈرن رئیلزم کہلایا جو مہارتر کی وجودیت اور مارکسیت پر مبنی تھا یہی ترقی پسندی کی توسیع کہلایا۔ گویا ساٹھ کے جدیدیت پسند سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری ترقی پسندیت کے بھی مخالف تھے اور راشد و میراجی کی جدیدیت کے بھی دشمن تھے۔ ان لسانی تشکیل کاروں نے جدید نظم کے مقابلے میں نئی نظم کا نعرہ بلند کیا۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں کہ: ''ساٹھ کی دہائی کی جدیدیت کا آغاز نئی لسانی تشکیلات کے ذکر سے ہوا جس کے سادہ معنی یہ ہیں کہ لفظ ایک ہی طرح اور ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہوتے اپنے معنی اور اثر کھو چکے ہیں۔'' (۸۲) جدید نظم ترقی پسند نظم سے اظہار کی سطح پر بہت الگ ہے ترقی پسند شاعری میں اکہری زبان کا استعمال ہوا جب کہ جدید شاعری کے مطالبے یہ ہیں کہ شاعری میں ابہام ہو، استعارہ ہو اور علامت بھی ہو۔ جدید نظم کی شناخت اس کا ارتکاز، ایجاد، اختصار، تہہ داری اور جامعیت ہے۔ ترقی پسند شعرا اور جدید شعرا میں فرق یہ ہے کہ ترقی پسند شعرا کی پہچان وضاحت و صراحت ہے جبکہ جدید شعرا نے رمزیت و اسراریت کو اظہار کی سطح پر ترجیح دی۔ اس کے علاوہ ترقی پسند شعرا اجتماعیت اور انقلاب کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں جبکہ جدید شعرا انفرادیت اور اقدار کی شکست کو موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ ترقی پسند شعرا صنعتی ترقی کے حق میں ہیں جبکہ جدید شعرا نے اس صنعتی ترقی کو اخلاقی اقدار کی پامالی قرار دیا ہے جو ابھی ہمارے ہاں سامنے ہی نہیں آئی تھی۔

اس دور کے جدید نظم نگاروں میں اختر الایمان اہم شاعر ہیں۔ وزیر آغا لکھتے ہیں کہ: ''اختر الایمان کی نظموں کے مجموعے اس کی روح کی ساری داستان پیش کرتے ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان مجموعوں کے نام شاعر کی روحانی کشمکش کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔'' (۸۳) ان کے علاوہ عمیق حنفی جدیدیت کے مبلغین میں سے تھے۔ ان کی نظم آزاد نظم کی ہیئت کو وقار عطا کرتی ہے۔ انہوں نے طویل نظم کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کی۔ عمیق حنفی کی نظم میں عہد حاضر کی عدم اطمینانی کو ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی نظم نگاری ان کے فکر و نظر کا پرتو تخلیقی انداز میں سامنے لاتی ہے۔ ان کے جمالیاتی پیکر عام زندگی سے مختلف نظر آتے ہیں۔

بلراج کومل اور کمار پاشی بھی اس دور کے اہم شعرا ہیں۔ بلراج کومل ماضی اور مستقبل کی بجائے حال میں رہنا پسند کرتا ہے۔ بلراج کومل سوالیہ نشان کا شاعر ہے۔ کمار پاشی بھی جدید نظم نگار ہیں، انہوں نے شہری سماج میں انسانی وجود کی گم گشتگی، آوارگی، نامرادی، تلخی، بدنمائی اور نوحہ گری کو تاریخ و تہذیب کی مدد سے بیان کیا ہے۔ ''شہر'' ان کی نظم کا ماخذاتی استعارہ اکثر بنتا ہے کیونکہ شہر انسانی وجود کا ایک میدانِ عمل ہے۔ یوں تو بہت سی شعرا نے مخصوص شہروں پر نظمیں لکھیں لیکن کمار پاشی نے ''دلّی'' شہر کے بارے میں جو نظم لکھی ہے، وہ اپنی

فضا بندی کے اعتبار سے ایک بڑا تناظر دیتی ہے۔ کمار پاشی نظریے کے اعتبار سے میراجی کا جاں نشیں لگتا ہے، اس نے طویل نظم میں تجربات کیے۔ کمار پاشی نے مختصر نظمیں بھی خوب کہی ہیں۔ اُس نے کلاسیکی انداز سے نئے دور کے موضوعات اپنانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ مخمور سعیدی، محمد علوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، جیلانی کامران، غلام جیلانی اصغر وغیرہ کا ذکر اس ضمن میں کیا جا سکتا ہے۔ کشور ناہید جدید اردو شاعری کی اہم شاعرہ ہے۔ وہ نسوانی دکھ کے اظہار کی منفرد شاعرہ ہے۔ کشور ناہید کو اردو شاعری کی پہلی باغی عورت شمار کیا جاتا ہے۔ کشور کی بغاوت اس سماجی رویے کے خلاف ہے جس نے عورت کا منفعل کردار مرتب کیا ہے۔

جدید نظم کئی تجربات کے بعد اب غزل کی بالادستی سے آزاد ہو گئی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے نظم نے متعدد رجحانات کو قبول کیا ہے۔ انسان کے بہت سے نفسی و مادّی اعمال کا مشاہدہ نظم میں کیا جا سکتا ہے۔ نظم کے ذریعے ذات، زندگی اور کائنات کا فہم حاصل ہوا ہے۔ نظم میں بے شمار موضوعات نے آ کر انسان کو بہت شعور عطا کیا ہے۔ انسان کو اپنی پہچان کرائی ہے، انسان کو اس کے فائدے اور نقصانات سے آگاہ کیا ہے۔ سائنسی انکشافات سے آگاہی دی ہے کہ انسان پر ان کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ کل تک ترقی پسند ادبی تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی شکست و فتح کی کہانیاں سنائی جاتی تھیں اور اب ماضی قریب کی ''جدیدیت'' کل کا قصہ بن گئی ہے۔ اس کے بعد ''مابعد جدید نظم'' کا آغاز ہوا۔ اس دور کے شعرا نے نثری نظم کو بھی اپنایا، ان کے لیے ہیئت کی کوئی پابندی نہ رہی۔ لیکن انہوں نے خود کو صرف نثری نظم تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ آزاد نظم میں بھی تجربات کرتے رہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جو ایک نئی بحث شروع ہوئی تھی کہ زبان کے مروج سانچے کی جگہ نئے شعری اسلوب کی تخلیق میں لفظ کے نئے تلازموں اور استعاروں میں نئے مفاہیم کی تلاش کی جائے۔ اسے ''نئی تشکیلات'' کا نام دیا گیا تھا۔ یوں اس بحث کے حامی شاعروں نے لسانی تشکیلات کے نام پر ماضی سے منہ موڑا اس لیے ن م راشد اور فیض متروک قرار پائے کیونکہ کلاسیکی شعری روایات کو رد کر دیا گیا تھا۔ اس نئی تشکیلات نے ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول جدید اردو نظم کو کوئی زیادہ فائدہ نہ پہنچایا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> بحروں کو توڑنا، الفاظ کے املا یا تلفظ سے منہ موڑنا اور زبان کے مروج سانچے سے روگردانی کرنا۔۔۔ ان سب کا جواز بے حد اچھی شاعری اور ارفع تخلیقات کی صورت میں ہو سکتا تھا مگر یہ بھی نہ ہوا۔ اسی لیے ان شعراء کی بے حد مخالفت ہوئی اور یہ تجربات محض چائے کی پیالی میں طوفان ثابت ہوئے۔ (۸۴)

نئی لسانی تشکیلات کے منفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ چند مثبت پہلو بھی تھے۔ مثبت پہلوؤں کے بارے میں انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> اس منصوبے کا مثبت پہلو یہ تھا کہ نئی آگہی اور جدید طرزِ احساس نے استعارہ، تمثال اور علامت کو نئے تخلیقی انداز میں استعمال کرنے کی طرح ڈالی، منطقی اور استدلالی انداز کے برعکس استعاراتی اسلوب اختیار کیا گیا اور نظم کا دائرہ مکمل کرنے کے بجائے لطیف ابہام پیدا کیا گیا اور نظم کی قوسوں کے درمیان فاصلہ رکھا گیا تا کہ قاری تخلیق مکرّر کے دوران فاصلے کو ایک جست سے عبور کر سکے اور اس سب سے اردو نظم خوشگوار تبدیلی سے آشنا ہوئی۔ (۸۵)

یورپ کے جدیدیت، ساختیات اور وجودیت جیسے نئے ادبی، لسانی اور فلسفیانہ نظریات کی بنیاد پر جدید نظم میں داخلی و خارجی سطح پر بنیادی تبدیلیوں کے لئے تنقیدی تصوّرات سامنے آئے۔ خارجی سطح پر لسانی حوالے سے جدید نظم پر غزل کی فارسیت زدہ زبان کے ان کلاسیکی اثرات کے خلاف شعور دیا گیا جو لسانی حوالے سے ن م راشد تک موجود تھے اور نئی سماجی صورت حال میں متروک ہوتے جا رہے تھے۔ جبکہ داخلی سطح پر موضوعاتی حوالے سے سرسید، اقبال اور ترقی پسندوں کے خارجیت پسند اور اجتماعیت پسند رجحانات کے مقابلے میں انسانی ذات اور باطن کو اہمیت دی گئی۔ اسی رجحان میں ستر کی دہائی میں خارجیت پسند و اجتماعیت پسند ماڈرن رئیلزم کا اضافہ ہوا۔

آزاد اور معرّا نظم کے تجربات کے بعد اردو میں نثری نظم کا تجربہ کیا گیا۔ نثری نظم کا باقاعدہ آغاز فرانس سے ہوا اور بودلیئر کو اس کا امام سمجھا جاتا ہے جس نے ردیف، قافیہ، وزن اور بحر کے خلاف بغاوت کا علَم بلند کیا۔ ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے اپنی کتاب ''مطالعۂ راشد'' میں ن۔م راشد کی نثری نظم کو بھی اپنا عنوان بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''چنانچہ راشد نے اپنی جدت پسندی کے باعث نہ صرف یہ کہ نثری نظم کو ردّ کرنے سے گریز کیا بلکہ وہ اس ہیئت کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنانے پر بھی مائل ہو گئے اور آخری عمر میں کم از کم دو نثری نظمیں لکھ ڈالیں جو طبع ہوئیں۔'' (۸۶) اردو میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز ۱۹۷۴ء کے لگ بھگ ہوا۔ اب اردو میں ایک بڑا حلقہ نثری نظم کو آزاد نظم کے ساتھ قبول کرتے ہوئے نظم لکھ رہا ہے۔ نثری نظم کی تخلیق اور اس کی تخلیقی شناخت کے مباحث ایک ساتھ تخلیق و تنقید کا حصہ بنتے آ رہے ہیں۔ نظم میں شعری آہنگ ہوتا ہے اور نثر میں نثری آہنگ ہوتا ہے چونکہ نثری نظم میں نثری آہنگ ہوتا ہے اس لیے اسے شاعری قرار نہیں دیا جاتا۔ اہم نثری نظم نگاروں میں تبسم کاشمیری، نصیر احمد ناصر، ستیہ پال آنند، علی محمد فرشی، سلیم آغا قزلباش، ابرار احمد، نجمہ منصور، سعید

الدین، یسین آفاقی مجتبیٰ فہیم، شبہ طراز، مبارک احمد، سارہ شگفتہ، احمد ہمیش، گلزار، روش ندیم، ذیشان ساحل، انوار فطرت، ساحر شفیق، زاہد امروز اور سیّد کاشف رضا کے نام بیان کیے جا سکتے ہیں۔ نثری نظم میں چونکہ کافی آزادی مل گئی، اس لیے نئے لکھنے والوں نے اسے زیادہ قبول کیا اور نثری نظموں کے انبار لگ گئے۔ وزیر آغا نثری نظم کو شروع شروع میں نثر ہی سمجھتے تھے لیکن جب انہوں نے اس کا بغور مطالعہ کیا تو آپ نے اسے نظم قرار دیا اور خود بھی بہت سی نثری نظمیں لکھیں۔ وزیر آغا نثری نظم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> نثری نظم کے بارے میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ میں اسے شاعری نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اوراق میں نثری نظمیں ''نثر لطیف'' کے عنوان سے شائع کی ہیں۔ مگر میں اس صنف کے امکانات کا منکر ہرگز نہیں ہوں۔ نثری نظم اصلاً شعری مواد پر مشتمل ہوتی ہے یا اسے ایسا ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ کاروباری نثر کی سطح پر اتر کر، ادب سے خارج ہو جائے گی۔ (۸۷)

نثری نظم کو آغاز میں اردو شعرا نے خاصی حقارت کی نظر سے دیکھا۔ کچھ نے اسے نظم منثور کہا تو کچھ نے نثر لطیف کہا اور کسی نے اسے ''نمکین مٹھائی'' کی پھبتی بھی دی۔ اس نظم کی بنیاد مغرب کی Prose Poem پر رکھی گئی۔ یہ نظم عروضی پابندیوں سے آزاد ہوتی ہے اور شعری آہنگ سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ اس کی ہیئت کی بنیاد آزاد نظم کی طرز پر رکھی گئی۔ نثری نظم مجموعی طور پر ایک ناکام تحریک تھی، یہ نثر اور نظم کے ادغام کی داعی تھی، اچھی شاعری کے لیے جس محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے نثری نظم کے عمومی شاعروں نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا اس کے بجائے نثری سطریں لکھ کر خود کو شاعر کہلوانے کی کوشش کی لیکن وہ شعرا جنہوں نے آزاد و جدید نظم میں نام کمایا، انہوں نے نثری نظمیں بھی بہت اچھی لکھیں۔

مغرب میں جدید نظم کی روایت یہ بھی ہے کہ نثری نظم کے مختلف مصرعے، مختلف قسم کی بحروں پر مشتمل ہوتے ہیں لہذا کچھ شعرا نے ایسی نثری نظمیں بھی لکھی ہیں جو مختلف بحروں کو لے کر آگے بڑھتی ہیں۔ دراصل نثری نظم کا داخلی آہنگ ہوتا ہے جبکہ ظاہری ڈھانچہ نثری انداز میں ہی ہونا چاہیے۔ نثری نظم کو ساٹھ کی دہائی میں فروغ ملا، جب لسانی تشکیلات کے نام پر اردو شاعری کی شناخت کو خطرے میں ڈالا گیا۔ پروفیسر فرخ درانی نے مجید امجد کو نثری نظم کا پہلا شاعر کہا جسے اکثر ناقدین اور خود مجید امجد نے اختلاف کیا۔ مختلف ادبی بحثوں میں کئی رویّے سامنے آئے۔ پہلے رویے کے مطابق اس قسم کی نظم میں تخلیقی تجربہ غیر مسخ صورت میں سامنے آتا ہے۔ دوسرے رویے کے مطابق نثری نظم کو اظہار کے عجز سے تعبیر کیا گیا۔ تیسرے رویے

کے مطابق اس تجربے کو ردّ تو نہیں کیا گیا لیکن نظم کے شعری آہنگ کو برقرار رکھنے کی تائید کی گئی۔

خلاصہ یہ کہ تمام شعراء چاہے وہ کسی بھی تحریک کا حصہ رہے، ان کا انفرادی تشخص کسی طور کم نہیں۔ پابند نظم ہو یا آزاد نظم چاہے نثری نظم ہو یا معرا۔۔۔۔ ہر طرح کے تخلیقی سانچے تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کامیابی سے آزمائے گئے۔ اس حوالے سے علامت، استعارہ، تمثیل کے ذریعے شاعری میں تاثیر پیدا کی گئی۔

وزیر آغا کی نظم نگاری

انجمن پنجاب کی ابتدائی اور مخزن و دلگداز کی بعد کی کاوشوں کے بعد اردو ادب میں ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق نے نظم نگاری میں نیا پن پیدا کیا۔ انہوں نے نظم کی تشکیل کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی ہئیت میں نت نئے تجربات کیے۔ ان تحاریک نے نظم معرّا پر بھی طبع آزمائی کی لیکن ان کا اصل میدان آزاد نظم تھا۔ یوں انہوں نے نظم معرّا کی اہمیت قدرے کم کر دی اور آزاد نظم کی ایک مضبوط بنیاد رکھی۔ اسی سے جدید نظم کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ جدید نظم میں سب سے اہم نام میراجی کا آتا ہے۔ انہوں نے ایک کتاب ''مشرق و مغرب کے نغمے'' میں جدید نظم کے بارے میں جو معلومات فراہم کیں، وہ آج بھی اس میدان میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ن م راشد اور مجید امجد نے میراجی کے قافلے کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے جدید نظم نگاری کی خوب نشو و نما کی۔

اگر جدید نظم کے قافلے کے مزید لوگوں کی طرف نظر دوڑائیں تو ہمیں وزیر آغا بھی نظر آتے ہیں۔ جدید اردو نظم نے ہئیتی اور قافیانہ حصار کو توڑا ہے۔ ہئیت اور قافیہ وہ زنجیریں ہیں جو خیالات کے آزادانہ اظہار کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اُن کی نظمیں اپنے معاصرین ترقی پسندوں سے بھی منفرد ہیں کیونکہ وہ کسی نظریے کی ترویج نہیں کرتے، نہ ہی انگریزی تتبع میں لکھتے ہیں اور نہ ہی فارسی تراکیب کو زیادہ استعمال کرتے ہیں بلکہ اِن سب سے الگ ہو کر اُن کی نظموں میں اپنی دھرتی سے انسلاک پایا جاتا ہے۔ اُن کی شاعری میں نہ اختر شیرانی جیسی رومانویت ہے اور نہ ترقی پسندانہ تحریک کا اثر، وہ کسی بھی تحریک کی تقلید نہیں کرتے بلکہ ایک نئے اور متوازن انداز سے اردو ادب پر گہری نظر و بصیرت رکھتے ہوئے اُس میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔

وزیر آغا نے پابند، معرّا اور آزاد تینوں طرح کی نظموں پر طبع آزمائی کی ہے۔ ''نظم معرّا'' سے جلد ہی وہ ''آزاد نظم'' کی طرف آ گئے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں کفایت لفظی استعمال کی اور جدید علوم کے

مطالعہ اور اس کے انضمام سے اپنی نظموں کو عالمی تناظر میں ایک خاص مرتبے سے ہم کنار کیا۔ اُن کی نظموں کے تراجم بہت سی زبانوں میں ہوئے جن میں انگریزی، جاپانی، ہسپانوی، اطالوی، یوگوسلاوی، یونانی، سویڈش، ہندی، بنگالی، پنجابی اور سرائیکی زبانیں شامل ہیں۔ وزیر آغا کی نظموں میں تصنّع کی بجائے جذبات وخیالات کی بے ساختہ ترجمانی ہے۔ انہوں نے مشرقی فکر کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔ رشید نثار لکھتے ہیں کہ: ''وزیر آغا نے ہمیں مغربی ادبی کلچر سے محفوظ کر کے مشرق کی طرف ہمارا فکری رخ موڑ کر دیا نتدارانہ طور پر یہ بتایا ہے کہ مشرق میں صدیوں سے کلچر کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔''(۸۸) وزیر آغا کی نظموں میں استعارے اور تمثال سازی کا استعمال بہت ہوا ہے۔ اُن کی ابتدائی شاعری میں خطابیہ انداز کلام اس بات کا ثبوت ہے کہ ابھی آپ اپنا لہجہ دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن کچھ ہی عرصے بعد اُن کے تخلیقی جوہر نظر آنا شروع ہو گئے۔ ابتدائی شاعری سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی غزل کے آہنگ اور اس کی لسانیات سے آزاد نہیں ہو سکے۔ وزیر آغا اپنی شاعری کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں، انہیں تمام اصناف میں شاعری سے زیادہ لگاؤ تھا اور وہ شاعری میں اپنی نظم نگاری کو فوقیت دیتے ہیں اور یہ وہ واحد صنفِ ادب ہے جسے وہ اپنے ادبی کیریئر کے آغاز سے لے کر اختتام تک کہتے اور لکھتے رہے ہیں۔ وزیر آغا کہتے ہیں کہ:

> شاعری نے مجھے اظہارِ ذات کے زیادہ مواقع فراہم کیے ہیں۔ بالخصوص نظم لکھتے ہوئے مجھے جمالیاتی کیف نسبتاً زیادہ حاصل ہوا ہے۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نظم نگاری سے کیا اور آج کہ کئی دہائیوں پر پھیلی ہوئی ایک طویل اننگز کھیل چکا ہوں، نظم کی مدد ہی سے موجود اور ماورا کے درمیان رشتہ جوڑے ہوئے ہوں اور مجھے تناظر کے وسیع ہو جانے کے باعث، زندگی اور کائنات کے آفاق پھیلتے ہوئے محسوس ہونے لگے ہیں۔(۸۹)

شاعری وزیر آغا کی تخلیقی شخصیت کا روشن ترین پہلو ہے۔ وزیر آغا کا قول ارمان نجمی نے کچھ یوں رقم کیا ہے: ''شاعری نے میرے اندر روشنی پھیلائی ہے اور اگر مجھے شعر کہنے کی سعادت نصیب نہ ہوتی تو میں کسی بھی صنف ادب میں کچھ نہ کر سکتا۔ شاعری میرے لیے روح کی غذا ہے اور میں نے اس کی فراہم کردہ قوت سے خود کو زندہ رکھا ہے۔''(۹۰) ادب کے میدان میں وزیر آغا کی پہلی پہچان شاعری بنی جسے انہوں نے مرتے دم تک قائم رکھا۔ اُن کے لیے شاعری زندہ رہنے اور حرکت میں رہنے کا ذریعہ ہے۔ ان کے نزدیک شاعری ایک ایسی قوت ہے جو فرد کو داخلی موت سے بچاتی ہے اور اندر کے انسان کو زندہ رہنے پر تیار کرتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے

ہیں: ''جدید نظم کے ایک معتبر شاعر مجید امجد نے جب وزیر آغا کو بطور موضوع مَس کیا تو انہوں نے وزیر آغا کی جدیدیت کے زاویوں کو نسبتاً زیادہ وضاحت سے پیش کیا۔''(۹۱) وزیر آغا نے جدید اردو شاعری میں نت نئے تجربات کر کے اردو ادب میں اہم اضافہ کیا۔ ذوالفقار احسن وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''گھاس میں تتلیاں'' کی نظموں کو رومانی قرار دیا۔ وہ وزیر آغا کی نظم نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> وزیر آغا کی نظموں کو سمجھنے کے لیے ان کی نظموں کے اندر اترنا پڑتا ہے۔ ان کی نظموں کا ظاہری مفہوم اور ہوتا ہے جبکہ پس پردہ علامتوں تشبیہات میں نظم کا باطنی مفہوم چھپا ہوتا ہے۔ اس لیے وزیر آغا کی نظم کو سمجھنے کے لیے نظموں کے اندر چھپی ہوئی Key کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جب تک Key آپ کے ہاتھ نہیں لگتی آپ وزیر آغا کی نظموں کی پراسراریت کو نہیں کھول سکتے۔(۹۲)

نئی علامتوں کا استعمال جدید نظم میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی واقعہ، کردار یا چیز مجاز کے طور پر اپنے سے ماورا ہو کر کسی چیز کی عکاسی کرے، علامت کہلاتی ہے۔ علامت کے بارے میں وزیر آغا لکھتے ہیں کہ: ''علامت کیا ہے؟ علامت سے مراد یہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر آئے تو یہ شے اس تصور کی طرف ذہن کو منتقل کرے جو اس کا بنیادی وصف ہے۔''(۹۳) جدید اردو نظم مکمل علامتی اظہار ہے۔ اردو شاعری میں علامت نگاری کی تحریک میراجی سے شروع ہوئی۔ ان کے ساتھ ساتھ تصدق حسین خالد، ن۔م راشد، فیض، مجید امجد، قیوم نظر، یوسف ظفر، ضیا جالندھری، مختار صدیقی، افتخار جالب، منیر نیازی، جیلانی کامران، آفتاب اقبال شمیم، تبسم کاشمیری، نصیر احمد ناصر، سہیل احمد خان، رفیق سندیلوی، علی محمد فرشی، سعادت سعید اور دیگر کئی شعراء کے ہاں ملتی ہے۔ میراجی کی نظم ''سمندر کے بلاوا'' میں سمندر کی علامت استعمال کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ علامت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''علامت مخفی تصورات کے وسیع نظام کی مجمل ترین شکل ہے، یہ بھی دراصل تشبیہ کے خاندان سے ہے اور کسی نہ کسی جہت سے مشابہت کا رابطہ اس میں کارفرما ہوتا ہے۔''(۹۴)

وزیر آغا کی نظموں میں علامتوں کا استعمال بہت زیادہ ہے، ان کی علامتوں میں معنی کی کثرت ہے جو قاری کو تجسس، وقوف اور اسراریت سے آشنا کرتی ہے۔ وزیر آغا کی شاعری میں مفرد علامتوں کا استعمال بہت کم ہوا ہے اور مرکب استعاروں کی کثرت ہے۔ ڈاکٹر محسن عباس لکھتے ہیں: ''وزیر آغا کی نظم ''ماں'' میں برگد، پیڑ، چھاؤں، مخمل، دودھیا شاخ، پتوں اور شاخوں کی علامات بھی اپنا انفرادی رنگ رکھتی ہیں۔''(۹۵) وزیر آغا کو قدرتی و فطرتی مناظر سے بہت دلچسپی تھی، یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں زیادہ تر علامتیں قدرتی مظاہر سے منتخب

کی گئی ہیں۔قدرتی وفطرتی مناظر سے علامتیں اخذ کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کا تعلق مضافات سے تھا اور وہ زراعت اور کاشتکاری سے وابستہ رہے۔وزیر آغا ایک انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ:

> میری نظم ایک بڑی حد تک فطرت سے جڑی ہوئی ہے۔فطرت کے بھی دو روپ ہیں۔ایک روپ وہ ہے جو پہاڑوں، وادیوں، دریاؤں، درختوں، پرندوں، ہواؤں اور کھیتوں پر مشتمل ہے۔دوسرا روپ وہ ہے جو آسمان کے مظاہر پر مشتمل ہے۔مجھے افق کے اسرار نے بھی ہمیشہ مسحور کیا ہے۔(۹۶)

اُن کی نظموں میں استعمال کی گئی علامتوں میں پیڑ اور جنگل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔شاعر نے جنگل کے بارے میں بتایا ہے کہ جنگل کا اگر کوئی قانون ہوتا ہے تو صرف اور صرف جبلّت ہے۔جنگل کے باسی اپنی جبلی قوتوں کے بل پر زندہ رہتے ہیں اور جبلّت فطرت کی حقیقی شکل ہے۔سماجی قوانین اور ضابطے انسان سے اس کی جبلی صفات کو چھین لیتے ہیں اور انسان ایک سماجی نظام کی مرضی کے مطابق کرتب کرتا دکھائی دیتا ہے۔شاعر کے مطابق جنگل کی فضا انسان کو اس کے بنیادی قدرتی اوصاف سے ہم رشتہ کر دیتی ہے اور انسان اپنی انفرادیت کو محسوس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔وزیر آغا کی نظموں میں جنگل کی علامت انسان کی تخلیقی مساعی کو سمجھنے کے عمل سے سروکار رکھتی ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں فطرت کی ہم آہنگی کی کامیاب عکاسی کی ہے جس میں انسان، ماحول اور پرندے سب ایک ڈور میں بندھ جاتے ہیں اور اپنے سارے تضادات ایک دوسرے میں شامل کر کے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔رفیق سندیلوی لکھتے ہیں کہ:

> قاری کے لیے لازم نہیں کہ وہ لامحالہ شاعر کی ارادی تمثال یا اس کے معنی تک پہنچے۔اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شاعر طرز و تعمل کے جن دھاگوں سے نظم بُنتا ہے، قاری اس کو ایک دوسرے ڈھب پر ادھیڑ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔وزیر آغا کی نظم نگاری قاری اور مصنف کے اسی رشتے کی وجہ سے توجہ کی طالب ہے۔(۹۷)

وزیر آغا نے نظم کے تسلسل میں سانس کے توقف کے لیے ایک آدھ رکن کم کیا ،اس طریقہ کار کو متعدد شعرا نے اپنایا۔انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> وزیر آغا کی نظموں میں استعارے کے پھیلاؤ کے ہمراہ موضوع کا دائرہ بھی وسعت اختیار کرتا ہے اور شعر کہتے وقت ان کی بصیرت اور

بصارت دونوں بیدار اور بیک وقت مصروفِ کار ہو جاتی ہیں۔ وزیر
آغا نے میراجی کے بعد جدید نظم کو فکری اور معنوی طور پر شاید سب سے
زیادہ متاثر کیا ہے اور ان کا فن نئے آفاق کی طرف سفر کر رہا
ہے۔(۹۸)

وزیر آغا نے زندگی کی سچائیوں کو عملی جامہ پہنایا۔ اُن کی اکثر علامتیں عام اور جانی پہچانی ہیں۔ ارمان نجمی لکھتے ہیں کہ: ''ان کی علامتیں ان کے تھیم کو مرکوز کرتی ہیں۔ خیالات کتنے ہی تجریدی کیوں نہ ہوں وہ ٹھوس تمثالوں کے ذریعہ قاری کے ذہن تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی علامتیں جذبات اور متخیلہ دونوں کو برانگیختہ کرتی ہیں۔''(۹۹)

''نردبان'' میں خود انکشافی کی واردات اور مابعد الطبیعاتی کیفیات کے اسرار کی جانب پیش قدمی ہے لیکن آپ ہمیشہ فطرت، قدرت اور زمین سے بہت قریب رہے۔ وزیر آغا اپنی ابتدائی زندگی سے ہی فطرت کے بہت قریب رہے ہیں اور فطرت سے انہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے یا فطرت نے انہیں بہت کچھ سکھایا ہے اور ان کی شعری حسیت کی تشکیل میں بھی حصہ لیا ہے۔ اُن کی شاعری میں سرسبز کھیتوں اور شاداب باغوں کا ذکر بہت ملتا ہے۔ اُن کے لفظی پیکروں میں موسموں کے رنگ، پرندوں کی چہکار، بادلوں کی گرج اور زرخیز زمین کی سوندھی خوشبو پائی جاتی ہے۔ تلمیحات اور استعارات کے ساتھ ساتھ وزیر آغا نے تازہ، دلنشین تراکیب کو بھی استعمال میں لایا ہے۔ ان کی ابتدائی نظموں کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں مجازی استعارے، تمثیل کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہو گئے ہیں کہ مکمل ہم آہنگی کی تصویر پیش ہونے لگی ہے اور تاثیر کی گرفت ہمیں پوری طرح جکڑ لیتی ہے۔

اُن کی شاعری میں اپنی زندگی کے سفر کی واردات، حادثات اور تجربات ہیں، اس کے علاوہ اپنے گردوپیش زمین و آسمان سے اپنے رشتہ کی دریافت بھی موجود ہے۔ اکثر نظموں میں زندگی کے راز کھولے گئے ہیں اور ایسی نظمیں پڑھنے والے کو باضمیر بناتی ہیں۔ وزیر آغا نے زندگی کا مشاہدہ جس انداز سے کیا، اپنے اس مشاہدہ کو بہت دلکشی اور مکمل احساس کے ساتھ اپنی شاعری میں بیان کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا کی شاعری انسان کے جذبات اور تخیلات پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ انہوں نے علامتوں کی زبان استعمال کی ہے۔ علامت نگاری کہیں کہیں وزیر آغا کی نظم کی تفہیم میں مشکل پیدا کرتی ہے لیکن تھوڑا بہت ذہن لڑانے سے قاری بات کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انور سدید لکھتے ہیں:

وزیر آغا کے ہاں بہت سی جگہوں پر علامت تمثیل سے دستبردار ہونا پسند

نہیں کرتی اور ہم جولی بن کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتی ہے۔ مجرد چیزوں کو مجسّم فرض کر لینا اور پھر ان سے منسلک محسوسات و تلازمات کو علامتی پیرائے میں بیان کرنے کا رویّہ ان کی نظمیہ شاعری کا طرّۂ امتیاز ہے۔(۱۰۰)

وزیر آغا کی تمثیل نگاری اُن کی علامت نگاری کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری میں تمثیل کی کثرت کی ایک وجہ ان کی ہندو دیومالا سے دلچسپی بھی ہے۔ اُن کی نظموں میں کائنات کے زندہ نظارے اپنے چہرے سے بوجھل نقاب اتار دیتے ہیں۔ وزیر آغا کے لہجے کا دھیما پن اور سرگوشی کی حالت قاری کو اپنے طلسم میں گرفتار کر دیتی ہے۔ وزیر آغا نے اپنی شاعری میں وجودیت کے مثبت پہلو بیان کیے اور منفی پہلوؤں سے احتراز کیا۔ اُن کا وجودی فلسفہ ''کامیو'' کے فلسفے کے قریب ہے کیونکہ وہ بھی صرف وجودیت کے مثبت پہلوؤں کو بیان کرتا ہے۔ اُن کی شاعری میں انسانی صورتحال کے وجود کا سراغ ملتا ہے لیکن خوف، تنہائی، انتشار، احساس جرم کی موجودگی ایک مستقل فلسفہ کی صورت اختیار نہیں کرتی۔ وزیر آغا کے ہاں وجودی صورت حال کا ایک پہلو سامنے آتا ہے اور وہ ہے دھرتی سے وابستگی جس سے وہ کسی حال میں دستبردار نہیں ہونا چاہتے۔ اُن کی نظموں میں خوشبو کا لفظ روح کی پاکیزگی کے لیے استعمال ہوا ہے اور آلودگی کے لیے جسم کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں رات کو سکون اور راحت کی علامت جبکہ دن کو بے سکونی اور مشین کی طرح قرار دیا ہے۔ وہ اپنی نظموں کو ذاتی اظہار کی بجائے آفاقی روابط سے جوڑ دیتے ہیں۔ آسمان، زمین، درخت، جنگل، پرندہ، چڑیا، دریا، کرن، پانی، بادل، سمندر، پتھر، پہاڑ، سفر، شبنم، ستارہ، آنسو، شام، رات، اندھیرا، شہر، گھاس، ریل گاڑی، خاموشی، آواز، پھول، سورج اور ہوا جیسی علامتیں وزیر آغا نے اپنی شاعری میں استعمال کی ہیں۔ اُن کی نظموں میں ہوا کی علامت کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ تخلیقی عمل بنیادی طور پر اپنی ذات کی دریافت، سیاحت اور کھوج کا سفر ہے۔ انسانی ذات کا مشاہدہ علامتوں کے ذریعے ہی ممکن ہے اور بہتر انداز سے کیا جا سکتا ہے اور فطرت سے لی گئی علامتیں سیاحت ذات کے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں متعلقات جنگل اور جنگل کی علامت بھی بہت استعمال ہوئی ہے۔ عابد خورشید لکھتے ہیں: ''وزیر آغا کی نظموں میں جہاں علامات تازہ اور بے ساختہ ہیں وہاں ان کے بطون میں حیرت اور معصومیت کا میلان بھی نظر آتا ہے۔''(۱۰۱) وزیر آغا نے اپنی نظموں میں بہت سی علامتیں استعمال کی ہیں یہی وجہ ہے کہ مفتی عزیز اللہ جلالی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

ڈاکٹر وزیر آغا ایک علامت پسند شاعر واقع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کی

شاعری میں اشارات واستعارات کی فراوانی پائی جاتی ہے اس کے
باوجود غلو کا شکار نہیں ہوتے۔یعنی اشارات واستعارات کے استعمال
میں حد سے تجاوز کرنے کا رجحان نہیں ملتا۔علامت پسند ہونے کے
باوجود علامت پسندوں کی طرح انتہا پسند نہیں ہیں۔(۱۰۲)

وزیر آغا کی نظمیں بین الاقوامی مسائل کو اجاگر کرتی ہیں۔اُن کی نظموں میں موجودہ تہذیب کے خلاف شدید ردّعمل ہے۔اُن کی شاعری میں محرومی کا اظہار واضح تو نہیں لیکن محزونی کی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے۔اُنہوں نے آزاد نظم لکھتے ہوئے نظم کی ڈکشن، تراکیب اور تشبیہات واستعارات کا منفرد استعمال کیا ہے۔اُن کا کہنا تھا کہ کوئی واقعہ فوری طور پر شعری صورت میں ڈھالنے کے بجائے دس بیس سال بعد بیان کیا جائے تو زیادہ موثر ہوتا ہے،انہوں نے اپنی شاعری میں یہی انداز اپنایا۔اپنی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' میں انہوں نے اپنی زندگی کے سفر میں اپنے تجربات ومشاہدات کو نظم کی صورت بیان کیا ہے۔یہ سفر دائرے کی صورت ہو یا خط مستقیم کی صورت، یہ اندر کی طرف ہو یا باہر کی طرف، سفر تو سفر ہی ہوتا ہے۔اندر کا سفر انسان کو سوچنے اور سمجھنے کی دعوت ضرور دیتا ہے۔

وزیر آغا کی نظموں کے موضوعات اور ان کا مزاج جدیدیت کا عکاس ہے۔صابر لودھی لکھتے ہیں:''بحیثیت مجموعی وزیر آغا کی نظموں میں ان کا شعری ڈکشن جمالیاتی اقدار کو بہتر صورت میں پیش کرتا ہے۔''(۱۰۳) وزیر آغا کی نظموں میں بھاری بھرکم الفاظ اور فارسی وعربی تراکیب کا استعمال نہیں کیا گیا،اس لیے اُن کی نظموں میں سادگی اور سلاست ملتی ہے جو کہ نظم کے حسن میں اضافہ کا باعث ہے۔ہارون الرشید اپنی کتاب میں شاہد شیدائی کا وزیر آغا کی نظم نگاری پر اظہار خیال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

انہوں نے اضافت کے استعمال سے اس حد تک احتراز کیا کہ ان کا
کلام بوجھل ہونے کے بجائے نہایت کومل انداز میں قاری کے دل
میں اتر جاتا ہے۔کلیشے نام کی کسی شے کو انہوں نے نظم میں داخل
ہونے کی اجازت نہیں دی۔سوم وہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال اس
انداز سے کرتے ہیں کہ تلازمہ،قوس بھرتے نظر آتا ہے۔چہارم وہ
علامت کو ذاتی بنانے کے بجائے اسے نئے سے نئے امیج کی صورت
میں یونیورسل سطح پر لے آتے ہیں اور وہ کہ جسے سہل ممتنع کہا جاتا ہے
ان کی نظم میں چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتا ہے(جدید اردو نظم میں

وزیر آغا کی یہ سب سے بڑی دین ہے)۔(۱۰۴)

صابر لودھی نے وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''گھاس میں تتلیاں'' کا تجزیہ اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔اس مجموعے کا خلاصہ کرتے ہوئے صابر لودھی نے لکھا ہے کہ:''ڈاکٹر وزیر آغا نے واقعی اپنی شاعری کے روشن دائرے میں قلعہ بند ہو کر اپنے اندر کی سیاحت کی ہے اور اس سیاحت کے اثمار شعری ڈکشن کے ذریعے دوسروں تک بھی پہنچائے ہیں۔''(۱۰۵) وزیر آغا نے اپنے معاشرے کی عکاسی اپنی شاعری میں کی ہے۔انہوں نے فرد کی اندرونی کیفیت کو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے دکھایا ہے، جوں جوں حالات کروٹ بدلتے گئے فرد کی ذہنی،نفسیاتی اور ماحولیاتی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو وہ اپنی شاعری کا حصہ بناتے گئے۔اُن کی نظم میں قاری کے باہر سے اندر جانے کے راستے موجود ہیں۔ڈاکٹر افتخار بیگ لکھتے ہیں:

> وزیر آغا نے عہد جدید کے انسان کی جذباتی کیفیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور ان کی شاعری میں جدید دور کی رعنائیوں میں پھنسے فرد کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔یہ بالکل ویسی ہی صورت حال اور کیفیت ہے جیسے سارتر، کامیو اور کرکیگار جیسے وجودی فلاسفہ نے اپنے فلسفے کا مرکزی گردانا تھا۔اس لحاظ سے وزیر آغا کی شاعری وجودی تصورات سے مملو بھی ہے اور فکر و نظر کے کئی نئے زاویے بھی عیاں کرتی ہے۔(۱۰۶)

وہ انسانی تخلیق کے اسرار کو جاننا چاہتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انسانی شعور کے ارتقا کو بیان کر کے انسان کی موجودہ صورتحال اور انسانی ارتقا کے انسان کے رویے پر پڑنے والے اثرات کو بیان کیا ہے۔رشید امجد لکھتے ہیں:

> تخلیق آدم کے اسرار اور اظہار کے پیچیدہ عمل کو سمجھنے اور جاننے کے لیے وہ دو بنیادی مقامات کا تعین کرتے ہیں۔ایک انسان کا باطن اور اس میں چھپی ہوئی دوسری ہستی کی پہچان اور دوسرے انسان کا خارج یعنی اس کا سماجی عمل جسے وہ ثقافتی اقدار کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ان دونوں مقامات کے امتزاج میں اعتدال اور توازن وزیر آغا کی انفرادی پہچان ہے۔(۱۰۷)

اُن کے نزدیک بھی اچھی شاعری وہی ہے جس کے موضوعات میں تکرار نہ ہو۔وزیر آغا لکھتے

ہیں کہ: ''شاعری کلیشوں کے بوجھ تلے دبی رہے اور علامتوں اور استعاروں کی تازگی سے محروم ہو تو وہ شاعری نہیں، محض منظوم نثر ہے۔''(۱۰۸) اُن کی نظموں میں انسان، کائنات اور وقت کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ وزیر آغا کی نظمیں انسان، کائنات اور وقت کی تثلیث سے عبارت ہیں۔ وہ انسانی دکھوں کا مطالعہ کائنات کی وسیع تر معنویت کے پس منظر میں وقت کی رفتار کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں چنانچہ لمحہ ان کے یہاں بنیادی کنجی ہے۔ موت، زندگی، وقت، فطرت، زمین اور دکھ وزیر آغا کی نظموں کے اہم موضوعات ہیں۔ انہوں نے سنجیدگی کو اپنایا اور شوخی سے خود کو دور رکھا۔ وزیر آغا نے طویل نظمیں بھی بہت کامیابی سے لکھیں۔ انور سدید لکھتے ہیں کہ: ''جدید اردو شاعری میں طویل نظموں کا رجحان دراصل بڑی شے کو بڑے گھیرے میں متحرک کرنے کا رجحان ہے۔ وزیر آغا نے ''آدھی صدی کے بعد'' جیسی طویل نظم لکھ کر اپنے باطن کی ایک بڑی شے کو ایک بڑے گھیرے میں متحرک کر کے دیکھا ہے۔''(۱۰۹)

وہ اپنی نظموں میں کفایت لفظی سے کام لیتے ہیں۔ جدید علوم کے مطالعہ اور اس کے انضمام نے اُن کی نظم کو عالمی تناظر میں خاص مرتبہ عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری کی ایک خوبی کے بارے میں ارمان نجمی لکھتے ہیں: ''ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ان میں کائنات کے زندہ و متحرک مظاہر اپنے چہروں سے بوجھل نقاب اتار کر، میٹھے مترنم لفظوں کی بساط پر اتر کر جیتے جاگتے دھیمی دھیمی سانس لیتے خیالوں کا جادو جگا گئے ہیں۔''(۱۱۰) مشکل لفظوں اور ثقیل تراکیب سے گریز اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔ وزیر آغا کی نظموں میں مکالمہ کی تکنیک ملتی ہے، اس تکنیک کے ذریعے وزیر آغا اشیاء، مظاہر اور کیفیات کی موضوعی حقیقوں، مبہم پہلوؤں کو معروضی سطح عطا کرتے ہیں۔ وہ مکالمہ صرف وہاں لاتے ہیں جہاں کسی چیز یا نظارے سے اُن کے داخلی رابطے گہرے ہو چکے ہوں۔ اُنہوں نے انفرادیت، تنوع اور فکری گہرائی کے ساتھ نئے نئے موضوعات سے جدید اردو نظم کی دنیا آباد کی ہے۔ ان کے موضوعات کا دائرہ فکری، عمرانی اور تاریخی ہے۔ اُن کی شاعری کو اُن کی سوانح کا مطالعہ کیے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنی زندگی کے بہت سے واقعات اور حالات سموئے ہیں۔ اسی طرح وزیر آغا کی شاعری سے ان کی زندگی کے حالات کو بھی جانا جا سکتا ہے اور ان کے ذہن و نفسیات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے یعنی ان کی زندگی کے حالات اور اُن کی شاعری ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

وزیر آغا اور مجید امجد دونوں میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں کا تعلق مضافات سے تھا اور دونوں استعاراتی طرز اظہار کے علمبردار ہیں۔ اختر الایمان اور وزیر آغا میں بھی کئی قدریں مشترک ہیں۔ دونوں کا تعلق دیہات سے ہے، دونوں نے بچپن کی یادوں کو اپنی اپنی شاعری میں موضوع بنایا۔ دونوں نے شاعری میں

سلاست سے کام لیا اور غزل کی زبان سے گریز کیا اور استعاراتی طرز کلام دونوں کی شاعری کا خاصہ ہے۔

''عورت'' بھی اُن کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ اُن کے لیے عورت صرف جنسی علامت نہیں بلکہ ایک اسرار ہے۔ جسے وہ مختلف انداز سے اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ انہوں نے عورت کے کئی روپ اپنی شاعری میں دکھائے ہیں۔ اُن کی کئی ابتدائی نظمیں عورت سے محبت کے جذبے میں لکھی گئی ہیں لیکن وزیر آغا نے عورت کے جسمانی جمال کو کم بیان کیا ہے۔ انہوں نے عورت سے محبت کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں کوئی خاص نین نقش والی عورت ان کی شاعری کا مرکز نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی محبوبہ کے جسمانی خدوخال کو اپنی شاعری میں کوئی خاص بیان نہیں کرتے۔ وزیر آغا کی نظموں میں عورت کی سراپا نگاری نہیں ملتی۔ ۱۹۶۰ء سے قبل اُن کی نظموں میں عورت ایک آئیڈیل ہے، ایک خواب ہے جو یادوں، آہٹوں اور دھندلکوں میں لپٹا ہوا ہے۔ وہ عورت کے اسی آئیڈیل روپ کے عاشق نظر آتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی نظموں میں وزیر آغا نے عورت کے سراپا کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس دَور کی نظموں میں عورت شاعر کے احساسات اور جذبات کو ابھارتی ہے۔ شاعر جنسی خوشبو کی ڈور سے بندھا کندن بدن کو چھوتا ہے۔ محبوبہ کی جسمانی لذّتوں سے فیض یاب ہوتا ہے۔ وزیر آغا کی نظموں میں عورت کا حسین و جمیل امیج ابھرتا ہے اس امیج کو عورت کا دلہن کا روپ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں عورت کے تخریبی اور منفی روپ کو کالی کا نام دیا جاتا ہے، وزیر آغا نے اپنی چند نظموں میں عورت کے اس روپ کو علامت کے طور پر بیان کیا ہے۔ یہ عورت حسن و جمال اور نرم و نازکی سے عاری ہے، اس میں نہ معصومیت ہے اور نہ ہی شرافت اور محبت ہے۔ اس عورت کا روپ نہایت بدنما اور خوفناک دکھایا گیا ہے جو تباہی و بربادی پھیلاتی ہے۔ اُنہوں نے محبوبہ کے روپ میں عورت کو اتنے واضح انداز سے بیان نہیں کیا جتنا کہ کالی کے روپ میں واضح انداز سے بیان کیا ہے۔ عورت کا مثبت رویہ تو ہر کوئی بیان کرتا ہے، وزیر آغا نے ذرا ہٹ کر عورت کا منفی رویہ اور روپ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ کالی کی خصوصیات رکھنے والی عورت اپنے فریق کو مکمل طور پر بے بس کر دیتی ہے، اس کی طاقت کو مٹی میں ملا کر رکھ دیتی ہے۔ وزیر آغا نے عورت کے اس خوفناک اور منفی روپ میں بھی اس کی نسوانیت کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں کالی ایسی تخریبی علامت ہے جو پرانے نظام کو تہس نہس کر کے نئے نظام کی بنیاد رکھتی ہے۔

۱۹۶۶ء میں وزیر آغا کی والدہ کی وفات کے بعد اُنہوں نے عورت کی مادرانہ حیثیت کو پہچانا ہے۔ ماں بے انتہا محبت، ملائمت اور تحفظ کی علامت ہے لہٰذا وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ ماں کی ذات، اس کا طرز احساس ہمیشہ زندہ و باقی رہتا ہے۔ انہوں نے ماں کی ذات کے خلوص کو وقت کی ہیبت کو زیر کرنے والی قوت کے روپ میں دیکھا ہے۔ مامتا نہ صرف شاعر کو زندگی اور وقت کے دکھوں اور غموں سے بچانے کی صلاحیت سے

سرفراز ہے بلکہ وہ شاعر کو عرفان ذات کے فروزاں لمحوں سے بھی نوازتی ہے۔اس طرح مامتا شاعر کی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر اپنا اثبات کرتی ہے۔ مامتا ہی دکھوں کی سخت دھوپ کو خوشگوار دھند میں بدلتی ہے۔ دکھ انسان کی زندگی کو اجیرن بنا رکھتے ہیں اس لیے شاعر ماں کے حصار کو اپنے گرد مستقل اور مستحکم کر لینا چاہتا ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں کہ زندگی کے میدان جنگ میں کھیلے جانے والے آگ اور خون کے کھیل کو روکنے سے ماں قاصر ہے مگر اس جنگ میں زندگی کے سپوتوں کو جو زخم لگتے ہیں، ان کا حل ماں کے پاس ضرور ہے۔ تاہم ماں محض مسیحا ہی نہیں، جو ہمیشہ زخم ملنے،، بیماری سے لاچار ہونے کے بعد پہنچتا اور اپنی مسیحائی کا اثبات کرواتا ہے۔ ماں زندگی کی فلسفیانہ جہتوں اور متصوفانہ پہلوؤں کا شاید شعور نہیں رکھتی، مگر وہ اپنے بچوں سے اپنی روح کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہونے کی بنا پر زندگی کے بارے میں ایک خاص تصور ضرور رکھتی ہے اور اپنے بچوں کو رہنما نظر عطا کرتی ہے اور اپنے اس عمل میں وہ بے حد گداز لہجہ اختیار کرتی ہے۔ ماں کی حیثیت میں عورت کو موضوع بناتے ہوئے وزیر آغا نے عورت کی حقیقت کو پہچانا ہے۔ کائنات میں عورت کے مقامِ امتیاز کو مشخص کیا ہے۔ ماں سے جدائی وزیر آغا کے لیے ایک سانحہ تھا، جو ان کی ذات کے پاتال تک اتر گیا تھا۔ وزیر آغا صرف ماں کی مفارقت میں اشک فشانی نہیں کرتے رہے بلکہ جب بھی انہیں زندگی کے دکھوں میں یاد آتی رہی تو وہ عورت کے وجود حقیقت کی مختلف پرتیں اتارتے اور اپنی شاعری میں انوکھے اضافے کرتے گئے۔

عورت کے مزید روپ بھی وزیر آغا نے اپنی شاعری میں دکھائے ہیں۔ عورت بحیثیت بیٹی کو انہوں نے بیان کیا ہے کہ وہ والدین کے لیے کتنی خوشیاں لے کر آتی ہے۔ کیسے بڑی ہو کر والدین کو خوشیاں عطا کرتی ہے۔ ان کا سہارا بنتی ہے، بچپن میں بھی والدین کی ہنسی بنتی ہے، والدین کے دکھوں کا مداوا کرتی ہے۔ اس کی ہنسی والدین کی خوشی اور دل کی راحت بنتی ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے اپنی شاعری میں مشرقی عورت کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ مشرقی عورت ابھی تک پردے اور حجاب کی پابند ہے۔ مغربی تہذیب نے آزادیٔ نسواں کے نام پر مشرقی خواتین کو بھی قدیم پابندیوں سے آزادی پانے کی ترغیب دی ہے لیکن ابھی تک مشرقی عورت اس آزادیٔ نسواں کی تحریک کی وجہ سے اپنے وجود پر لپٹے ہوئے بھاری کپڑوں میں سے صرف آنکھوں پر سے کپڑا ہٹانے میں آزاد ہوئی ہے۔

اُنہوں نے طویل نظمیں بھی لکھیں۔ طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' میں اپنی سوانحی زندگی کے واقعات قلمبند کیے ہیں۔ اُن کے سوانحی واقعات میں ایک رخ سماجی حقیقت اور اس کے اتار چڑھاؤ پر مبنی ہے اور دوسرا رخ حقیقت کے مدّ و جزر سے پیدا ہونے والے محسوسات کا بسیرا ہے۔ پہلا رُخ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو سرے سے ہی بے رنگ ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا رخ پر سدا بہار رہتی ہے۔ طویل

نظم ''آدھی صدی کے بعد'' وزیر آغا نے تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی اور اس نظم میں انہوں نے اپنی زندگی کے پچاس سالوں کا احاطہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کی آدھی صدی کس انداز سے گزاری اور انہوں نے زندگی کو کیسا محسوس کیا۔ انسان کے طرز زندگی کو انسان کے ماحول سے جوڑا ہے کہ انسان کا ماحول ہی اس کے رہن سہن کا انتخاب کرتا ہے۔ اس طویل نظم کے ذریعے شاعر نے ذات کی گہرائی اور کائنات کی کشادگی اور تنوع کو سامنے رکھا ہے۔

اُن کے ہاں فلسفیانہ نظریات بھی ملتے ہیں لیکن انہوں نے معاشرتی حقائق بھی کھل کر بیان کیے ہیں۔ اُن کی شاعری میں اور خاص کر نظموں میں انسانی المیوں کا ذکر بہت زیادہ ہے۔ اُن کے موضوعات متنوع ہیں اس لیے اُن کی شاعری میں بوریت پن موجود نہیں ہے۔ اُن کے ہاں موضوعات کی تکرار نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری کے موضوعات میں تنوّع ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں:

> باہر کو بھی میں نے اندر کی کھڑکی ہی سے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تخلیق کاری میں بھی یہی ایک زاویہ معتبر ہے۔ جو لوگ اندر سے متعارف ہوئے بغیر محض باہر کی اشیا، مسائل، نظریوں اور واقعات کو نظم کرتے ہیں، شعر کے نام پر دراصل وہ منظوم نثر کہتے ہیں۔ (۱۱۱)

اس کے علاوہ وزیر آغا کی شاعری میں رومانیت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ نجمہ منصور نے اس موضوع پر اپنا اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ یوں کہا ہے: ''رومانوی طرز احساس میں درد، اداسی اور کرب کا احساس بہت گہرا ہوتا ہے۔ وزیر آغا کی نظموں میں اس طرز احساس کو شناخت کیا جا سکتا ہے۔'' (۱۱۲) نجمہ منصور نے اسی مضمون میں آگے جا کر وزیر آغا کی کچھ رومانوی نظموں کا ذکر کیا ہے جن میں ''میں اور تو''، ''عجب، جادو بھری آنکھیں تھیں اس کی'' اور نظم ''تم جو آتے ہو'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی نظمیں ''یہاں''، ''اب سنا ہے'' اور ''ناموجود کے بھاری در تک'' میں بھی رومانویت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

اسطوری نظام اور حرکی جہت کی جھلک بھی اُن کی شاعری میں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ اُن کی نظموں میں دیوی، دیوتاؤں کی کہانیاں، کالی اور وشنو کا ذکر، بھوتوں، جنوں اور ڈائنوں کا ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی لکھتے ہیں کہ: '' آغا کی نظموں میں جس کائنات سے واسطہ پڑتا ہے وہ بے جہت ہولنا کی اور حساس بے چارگی کے احساسات ابھارتی ہے۔ یہاں فرد روحانی دیوالیہ پن اور اکتاہٹ کا شکار ہے۔'' (۱۱۳) اُن کی نظم ''اک کتھا انوکھی'' اور ''اشومیدھ یگیہ'' اور کئی اور نظموں میں اساطیری نظام کی جھلک نمایاں ہے۔ یہ انداز اُنہیں دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اپنے

نظریات، تصورات، خیالات کو ہم آہنگ کیا۔ وہ ایک جگہ رکے نہیں بلکہ اُن کی شاعری میں حرکی جہت نمایاں ہے۔ اُن کی نظموں میں تحرک پایا جاتا ہے یعنی متحرک مظاہر اور کردار دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی نظمیں جمود کو توڑتی ہیں اور تحریک پیدا کرتی ہیں۔

جدید اردو نظم نگاری کے آغاز وارتقاء پر نظر ڈالنے کے بعد وزیر آغا کی شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے اور جدید اردو نظم میں اُن کے کردار اور مقام کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُنہوں نے موضوعاتی اور ہیئتی دونوں میدانوں میں جدید اردو نظم میں اضافہ کیا۔ انہوں نے کئی پرانے اور کچھ نئے موضوعات، خاص طور پر فطرت سے بے حد لگاؤ کو موضوع بنا کر جدید اردو نظم میں خوش گوار اضافے کیے۔ انہوں نے اصلاحی مضامین کو بکثرت بیان کیا ہے اور ان کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے حالی و اقبال کی طرح قومی شاعری بھی کی ہے لیکن معرّا، آزاد اور نثری نظم کے ذریعے اپنے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ ہیئتی اعتبار سے وہ مجید امجد اور میراجی کے بھی پیروکار دکھائی دیتے ہیں کیونکہ یہ دونوں شعرا اردو ادب میں جدید نظم کے اہم شعراء میں شامل ہوتے ہیں اور اِنہوں نے ہی آزاد نظم کو عروج بخشا جسے بعد میں وزیر آغا نے اَپنا کر شاعری کی۔

حوالہ جات

۱۔ جابر علی سید، جدید شعری تنقید، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۲ء، ص ۸۱

۲۔ شاذیہ ناہید شفاعت، نظم جدید اور فضا اعظمی کی طویل نظم نگاری، نقش پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۸۲

۳۔ انجم اعظمی، ''جدید نظم سے کیا مراد ہے'' مشمولہ اردو شاعری کا فنی ارتقاء، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۶

۴۔ عمران ازفر، ''جدید نظم میں تمثال کاری کے تاریخی و نظریاتی مباحث'' مشمولہ رسالہ نقاط ۹، فیصل آباد، جون ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۳

۵۔ شین کاف نظام، ''بیسویں صدی میں اردو نظم'' مشمولہ بیسویں صدی میں اردو ادب، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۹۱

۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، دستاویز مطبوعات، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء، ص ۵۴

۷۔ سید محمد ابوالخیر کشفی، اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پسِ منظر، نشریات، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷۹

۸۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳

۹۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۳۲۱

۱۰۔ محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ص ۴۵

۱۱۔ طاہرہ نیر، ڈاکٹر، اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۹۹ء، ص ۶۷

۱۲۔ صفیہ بانو، ڈاکٹر، انجمن پنجاب: تاریخ و خدمات، کفایت اکیڈمی، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۴

۱۳۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۸۲، ۸۳

۱۴۔ حمید احمد خاں، پروفیسر، ارمغان حالی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۲۴

۱۵۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۵

۱۶۔محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، ص ۲۶
۱۷۔محمد حسن، ڈاکٹر، ''معرّی اور آزاد نظم کا ارتقاء'' مشمولہ اردو شاعری کا فنی ارتقاء، مرتبہ: فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴۰
۱۸۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، طبع پنجم، ۲۰۰۶ء، ص ۳۱۵
۱۹۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع انتیس، ۲۰۰۹ء، ص ۳۴۸
۲۰۔ناہید قاسمی، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۸
۲۱۔ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۵
۲۲۔شین کاف نظام، ''بیسویں صدی میں اردو نظم'' مشمولہ بیسویں صدی میں اردو ادب، ص ۹۲، ۹۳
۲۳۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع چہارم، ۱۹۹۹ء، ۳۵۸
۲۴۔محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ص ۳۸
۲۵۔عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۹
۲۶۔شمس بدایونی، ڈاکٹر، ''شبلی بحیثیت اردو شاعر'' مشمولہ شبلی کی علمی و ادبی خدمات، مرتبہ: خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۷
۲۷۔ہارون الرشید، ڈاکٹر، پروفیسر، جدید اردو شاعری: تاریخ و تنقید، میڈیا گرافکس، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳
۲۸۔کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء، ص ۶۳
۲۹۔سعود الحسن ندوی، ''شبلی کی اردو شاعری اور ملی دردمندی'' مشمولہ ماہنامہ اردو دنیا، دہلی، اکتوبر ۲۰۱۴ء، ص ۲۶
۳۰۔غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، ص ۳۰۷
۳۱۔منظر ایوبی، پروفیسر، اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع اوّل، ۲۰۱۰ء، ص ۶۳
۳۲۔فاطمہ تنویر، ڈاکٹر، اردو شاعری میں انسان دوستی، مطبع بھارت آفسٹ، دہلی ۶، نومبر ۱۹۹۴ء، ص ۱۸۵
۳۳۔رالف رسل، اردو ادب کی جستجو، مترجم: محمد سرور رجا، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۷۴
۳۴۔آل احمد سرور، ''نظم کی دنیا'' مشمولہ اردو شاعری کا فنی ارتقاء، مرتبہ: فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۴
۳۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۳۶

۳۶۔محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ص ۲۶
۳۷۔انور سدید، ''ڈاکٹر وزیر آغا کی اقبال شناسی''، مشمولہ سرگودھا میں وزیر آغا شناسی، مرتبہ: ہارون الرشید تبسم، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۴ء، ص ۳۹
۳۸۔فاروق فیصل، پروفیسر، ''حالی سے اقبال تک اردو شاعری کی فکری روایت''، مشمولہ ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد، مارچ اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۳۔۴
۳۹۔شین کاف نظام، ''بیسویں صدی میں اردو نظم''، مشمولہ بیسویں صدی میں اردو ادب، ص ۹۵
۴۰۔خاطر غزنوی، جدید اردو ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء، ص ۱۶۹
۴۱۔حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظم معرا اور نظم آزاد، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۴۳
۴۲۔وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، ص ۲۱۵، ۲۱۶
۴۳۔ناہید قاسمی، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۷
۴۴۔خاطر غزنوی، جدید اردو ادب، ص ۱۷۰
۴۵۔روش ندیم، ڈاکٹر، ''آزاد نظم: تعارف، تاریخ اور صورتحال''، مشمولہ دریافت، شمارہ: ۱۰، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۱ء، ص ۳۷۷
۴۶۔محمد حسن، ڈاکٹر، ''معری اور آزاد نظم کا ارتقاء''، مشمولہ اردو شاعری کا فنی ارتقاء، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۱۴۲
۴۷۔شین کاف نظام، ''بیسویں صدی میں اردو نظم''، مشمولہ بیسویں صدی میں اردو ادب، ص ۱۰۲
۴۸۔خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، انتخاب زریں اردو نظم، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۲
۴۹۔شاذیہ ناہید شفاعت، نظم جدید اور فضا اعظمی کی طویل نظم نگاری، ص ۸۶
۵۰۔حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظم معرا اور نظم آزاد، ص ۴۲۷
۵۱۔محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، ص ۵۴
۵۲۔رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم، مئی ۲۰۰۷ء، ص ۲۳۳
۵۳۔عزیز حامد مدنی، جدید اردو شاعری (حصہ دوم)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۹
۵۴۔ایم نذیر احمد تشنہ، اردو ادب کا ارتقاء، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۸۳
۵۵۔ناہید قاسمی، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، ص ۱۸۴
۵۶۔یونس حسنی، ڈاکٹر، اختر شیرانی اور جدید اردو ادب، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع دوم، ۲۰۰۹ء،

۵۷۔تشنہ بریلوی، ''حسینہ سامنے آئی تو پھر''مشمولہ روزنامہ ایکسپریس، فیصل آباد، منگل ۲۶ مئی ۲۰۱۵ء، ص ۱۵
۵۸۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۴۵۰
۵۹۔یونس حسنی، ڈاکٹر، اختر شیرانی اور جدید اردو ادب، ص ۱۶۹
۶۰۔ہارون الرشید، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری، ص ۶۳
۶۱۔رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، ص ۱۳۱
۶۲۔ہارون الرشید، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری۔تاریخ وتنقید، ص ۴۵
۶۳۔گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، ص ۳۹۷
۶۴۔عتیق اللہ، ڈاکٹر، اردو نظم، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷
۶۵۔عتیق اللہ، ڈاکٹر، ''ترقی پسند نظم نظریاتی کردار کی توسیع''مشمولہ ترقی پسند ادب، مرتبین: ڈاکٹر قمر رئیس۔سید عاشور کاظمی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۳۳
۶۶۔کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم)، ص ۳۱۳
۶۷۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۴۳۹
۶۸۔رفیق سندیلوی، ''اردو نظم کے پچاس سال''مشمولہ ماہنامہ اوراق، لاہور، جولائی، اگست ۱۹۹۷ء، ص ۶۲
۶۹۔سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۵۵۸
۷۰۔ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۳۴۰
۷۱۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۵۶۹
۷۲۔ایم نذیر احمد تشنہ، اردو ادب کا ارتقاء، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۹۹
۷۳۔عمران ازفر، ''میراجی کی الجھن اور الجھاوے میں بُنی شعری کرافٹ''مشمولہ رسالہ نقاط ۹، مدیر: قاسم یعقوب، فیصل آباد، جون ۲۰۱۰ء، ص ۳۵۱
۷۴۔جمیل ملک، ادبی منظر نامے، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳
۷۵۔رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، ص ۱۳۱
۷۶۔ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۳۷۸
۷۷۔رفیق سندیلوی، ''اردو نظم کے پچاس سال''مشمولہ ماہنامہ اوراق، ص ۶۰
۷۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۹۵، ۹۶

۷۹۔ رفیق سندیلوی، ''اردو نظم کے پچاس سال'' مشمولہ ماہنامہ اوراق، ص ۱۷

۸۰۔ رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱

۸۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع انتیس، ۲۰۰۹ء، ص ۵۶۴

۸۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، جدید ادبی تناظر، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع اوّل، ۲۰۱۲ء، ص ۸۲

۸۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، ص ۱۷۰

۸۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۴۷۵

۸۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۵۲۶

۸۶۔ محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر، مطالعۂ راشد (چند نئے زاویے)، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ستمبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۵

۸۷۔ رشید امجد، جمیل آذر، انجم نیازی، ''وزیر آغا سے ملاقات'' مشمولہ نئے مکالمات، مرتبین: شاہد شیدائی، عابد خورشید، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۱۰ء، ص ۳۰

۸۸۔ رشید نثار، ڈاکٹر وزیر آغا اور ہمارا عہد، پنڈی اسلام آباد ادبی سوسائٹی، راولپنڈی، ۱۹۹۸ء، ص ۶۰

۸۹۔ عذرا اصغر، ''وزیر آغا سے مکالمہ'' مشمولہ نئے مکالمات، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۸۷

۹۰۔ ارمان نجمی، بیاض شب و روز، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اول، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵

۹۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵

۹۲۔ ذوالفقار احسن، تنقیدی افق، نقش گر، راولپنڈی، طبع اول، ۲۰۱۴ء، ص ۶۷

۹۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''اردو نظم میں علامت نگاری'' مشمولہ علامت نگاری (انتخاب مقالات)، مرتبہ: اشتیاق حسین، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۷

۹۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''اردو نظم (وضاحت سے علامت تک)'' مشمولہ علامت نگاری (انتخاب مقالات)، مرتبہ: اشتیاق حسین، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۳

۹۵۔ محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، ص ۳۴

۹۶۔ عذرا اصغر، ''وزیر آغا سے مکالمہ'' مشمولہ نئے مکالمات، مرتبین: شاہد شیدائی، عابد خورشید، ص ۱۹۱

۹۷۔ رفیق سندیلوی، ''اردو نظم کے پچاس سال'' مشمولہ ماہنامہ اوراق، ص ۷۰

۹۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۵۱۷، ۵۱۸

۹۹۔ ارمان نجمی، بیاض شب و روز، ص ۱۱۴

۱۰۰۔ انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا۔ شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱

۱۰۱۔عابد خورشید، وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: شاہد شیدائی، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۷
۱۰۲۔عزیز اللہ، ''ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کا ایک مطالعہ'' مشمولہ سہ ماہی اسالیب، مدیر: ذوالفقار احسن، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۸
۱۰۳۔صابر لودھی، ''گھاس میں تتلیاں خصوصی مطالعہ'' مشمولہ سہ ماہی تجدید نو، مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۳
۱۰۴۔ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ڈاکٹر وزیر آغا نقش گر، راولپنڈی، طبع اوّل، ۲۰۱۱ء، ص ۲۴۸
۱۰۵۔صابر لودھی، ''گھاس میں تتلیاں خصوصی مطالعہ'' مشمولہ سہ ماہی تجدید نو، ص ۱۱۵
۱۰۶۔افتخار بیگ، ''وزیر آغا کی نظم۔۔۔فرد کی کہانی'' مشمولہ سہ ماہی تجدید نو، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۶
۱۰۷۔رشید امجد، ڈاکٹر، ''وزیر آغا کی نظموں کا فکری پس منظر'' مشمولہ سہ ماہی اسالیب، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۵۱
۱۰۸۔حیدر قریشی، ''وزیر آغا سے کچھ باتیں'' مشمولہ نئے مکالمات، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۶۳
۱۰۹۔انور سدید، ڈاکٹر، ڈاکٹر وزیر آغا۔شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۰۶ء، ص ۴۰
۱۱۰۔ارمان نجمی، بیاض شب و روز، ص ۲۷
۱۱۱۔رشید امجد، جمیل آذر، انجم نیازی، ''وزیر آغا سے ایک ملاقات'' مشمولہ نئے مکالمات، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵
۱۱۲۔نجمہ منصور، ''وزیر آغا کی رومانوی نظمیں'' مشمولہ سرگودھا میں وزیر آغا شناسی، مرتبہ: ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۴ء، ص ۲۷۰
۱۱۳۔شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۰۶

باب سوم

وزیر آغا کی اردو نظم: موضوعات کی داخلی جہات کا تجزیہ

ہر شاعر نے انسان کی اندرونی کیفیات، جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ ان سے نمو پانے والے موضوعاتی تصوّرات کو اپنی شاعری کا حصہ ضرور بنایا ہے اور یہ ایک فطری چیز ہے کیونکہ شاعر جو کچھ محسوس کرتا ہے، اس کا اظہار ضرور کرتا ہے اور اس کے پاس تخلیقی اظہار کا بہترین ذریعہ اس کی شاعری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا نے اپنی شاعری میں وسیع سطح پر ان موضوعات کو بیان کیا ہے جو اُن کے جذبات، احساسات اور کیفیات کی داخلی عکاسی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ان موضوعات سے اظہار کے لیے ایسا انداز اپنایا ہے کہ یہ موضوعات آپ کی ذات سے نکل کر ایک وسیع تناظر میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ جذبات، احساسات اور کیفیات فقط کسی ایک شخص کے نہیں لگتے بلکہ ہر انسان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا قاری انہیں اپنا داخلی تجربہ سمجھتا ہے۔

وزیر آغا کی نظموں کے اہم موضوعات میں سے ایک دکھ ہے گو اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں خوشی کا موضوع بھی آتا ہے لیکن دکھ ہمیشہ خوشی پر غالب رہتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید وزیر آغا کی اس عنوان پر موجود شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''وزیر آغا نے دکھ کے جو ہزار روپ دیکھے ہیں ان میں سے بیشتر انسان کی داخلی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دکھ روحانی نوعیت کا ہے۔''(۱) دکھ کو انسانی زندگی کا لازمہ قرار دیا گیا ہے یعنی دکھ کے بغیر انسانی زندگی کا تصوّر ممکن نہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں دکھ سے مراد تکلیف، رنج، عذاب، مرض، مصیبت لیا گیا ہے۔(۲) اقبال کے ہاں بھی دکھ کے عنوان پر کئی اشعار مل جاتے ہیں۔ بانگ درا کی نظم ''فلسفۂ غم'' میں اقبال کچھ یوں کہتے ہیں:

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ شوق ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے (۳)
(فلسفۂ غم)

وزیر آغا کی کتاب ''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر لکھی گئی نظموں میں ''دکھ''، ''اجڑتا شہر''، ''ملاقات''، ''پیار''، ''سفر''، ''رات''، ''واپسی''، ''پیپل''، ''یاد'' اور ''حیات نو'' شامل ہیں۔ ان تمام نظموں میں شاعر نے مختلف انداز سے یہ بیان کیا ہے کہ انسان طرح طرح کے دکھوں میں مبتلا ہے اور یہ دکھ اس کے اپنے پیدا کردہ بھی ہیں اور کچھ اس کی قسمت میں لکھ دیے گئے ہیں۔ انسانی زندگی دکھوں سے پاک نہیں۔ ان نظموں میں شاعر مزید کہتا ہے کہ اگر انسان فطرت کو سمجھ جائے تو سکھی ہو سکتا ہے یعنی انسان کے بہت سے دکھوں کی وجہ اس کے غیر فطری اقدامات ہیں۔

''شام اور سائے'' کی نظم ''دکھ'' میں انہوں نے کہا ہے کہ جب انسان کی زندگی سے ہر چیز چھن جائے تو اس کی زندگی دکھوں سے بھر جاتی ہے، اس نظم کے اشعار پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب انسان کی زندگی میں سے تمام خوشیاں دھیرے دھیرے رخصت ہو جاتی ہیں تو انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے لیکن اس حالت میں اس کی زندگی میں دکھوں کی آمد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی شعری مجموعہ کی ایک اور نظم ''اجڑتا شہر'' میں ایک اجڑے ہوئے شہر کے مناظر دکھائے گئے ہیں جہاں ہر طرف خستہ حالی ہے اور زندگی مُرجھائی ہوئی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے چہرے دیکھ کر ان کے حالات پتہ چل جاتے ہیں۔ شاعر کا اشارہ یہاں دل کے شہر کی طرف بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بُرے حالات کا سامنا کرتے کرتے اُجڑ گیا ہے، اِس میں اب رنگینی نہیں رہی، مایوسی اور پریشانی ہے۔ غرضیکہ ساری نظم دکھوں کے باعث انسان کی حالتِ زار کے بارے میں ہے۔ نظم کے آخر میں شاعر کے اندازِ بیاں سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دکھوں کی وجہ سے اس کی ذات ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ شاعر کچھ یوں کہتا ہے:

کبھی تم جو دیکھو تو ان پتلیوں کے سمندر میں
اس ٹوٹے پھوٹے ہوئے آئینے میں
تمھیں اپنی بکھری ہوئی
ریزہ ریزہ ہوئی ذات کا اک ہیولے
ابھر کر بلائے
اجڑتے ہوئے شہر کا اک منظر دکھائے (۴)

(اجڑ تا شہر)

اسی مجموعہ کی ایک اور نظم ''ملاقات'' میں شاعر کہتا ہے کہ جب خوشی کی ہوا چلتی ہے تو آنسو رک جاتے ہیں اور جب یہ خوشی کی ہوا رک جاتی ہے تو پھر آنسو بہنے شروع ہو جاتے ہیں۔ شاعر حالت غم میں بیٹھا تھا، جب خوشی آئی تو اس کی حالت سنبھل گئی اور جب خوشی پھر سے چلی گئی تو شاعر پھر سے پریشان اور اداس ہو گیا۔ خوشی کے بعد غم کی آمد کو شاعر نے بیان کیا ہے۔ نظم ''پیار'' میں پیار و محبت کو ایک عارضی شے قرار دیا گیا ہے۔ پیار و محبت کو ایک کچا رشتہ قرار دیا ہے۔ شاعر پیار کو کچا اور نازک رشتہ قرار دے کر دکھ کو مضبوط رشتہ اور ہمیشہ کا ساتھی قرار دیتا ہے۔ شاعر نے اس بات کو حقیقت تسلیم کیا ہے کہ دکھ انسان کا اصل ساتھی اور دوست ہے۔ پیار چونکہ بہت کم ملتا ہے، اس لیے یہ کچا اور عارضی ساتھی ہے۔ شاعر نے مختلف قدرتی اشیاء کے بارے میں کہا ہے کہ وہ آنسو بہاتی ہیں کیونکہ ان کا حقیقی ساتھی دکھ ہے۔ اسی طرح انسان کا اصل اور پکا ساتھی دکھ ہے نہ کہ پیار، شاعر کچھ یوں بیان کرتا ہے:

دکھ کی ڈور سے بندھا ہوا ہے یہ سارا سنسار
روتی شبنم، روتا بادل، نینوں کی پھوہار
دکھ جیون کا ساتھی سنگی، دکھ سے ہم کو پیار (۵)

(پیار)

نظم ''سفر'' میں شاعر کہتا ہے کہ وقت جو کہ ازل سے چلا آ رہا ہے۔ مسلسل سفر میں ہے، تھک چکا ہے۔ زمانے کے مسائل اور مصائب دیکھ دیکھ کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ایک اور مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ شاعر نے انسانی زندگی کے سفر کو موضوع بنایا ہو کہ وہ زندگی کی تلخیاں اور دکھ برداشت کر کر کے اب تھک چکا ہے۔ اب وہ مزید زندگی کا سفر کرنے سے اکتا چکا ہے۔ وہ مزید دکھ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اس کی طاقت و ہمت جواب دے چکی ہے اور اب وہ تیزی سے موت کی طرف جا رہا ہے۔ نظم ''رات'' میں شاعر کہتا ہے کہ رات کسی کے لیے راحت بن کر آتی ہے تو کسی کے لیے دکھ اور اذیّت بن کر آتی ہے۔ اذیّت کا باعث بننے کی وجہ دکھ ہے۔ جس انسان کی زندگی میں کوئی دکھ یا تکلیف ہو، اس کے لیے رات کا کاٹنا کسی بہت بڑے عذاب سے کم نہیں ہے۔ نظم ''واپسی'' میں شاعر نے خوشی کے بعد اچانک غم کے آ جانے کا ذکر کیا ہے۔ شاعر ماضی کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے۔ جب اچھے وقت کے بعد برا وقت آتا ہے تو انسان اچھے وقت کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے۔ رفیق سندیلوی اس نظم کو کچھ اس انداز سے دیکھتے ہیں:

نظم ''واپسی'' میں پیڑ کے حوالے سے تشکیلیں وضع کی ہیں مثلاً پہلی

تثلیث روشن پیڑ، دوپہر اور دو پریمیوں کی ملاقات سے اور دوسری تاریک پیڑ، شام اور دو پریمیوں کی جدائی سے مرتّب ہوتی ہے۔ نظم کی ترکیبیت میں یہ تثلیثیں بنیادی اشارات کا کام دیتی ہیں اور پیڑ کو مرکزے کے طور پر اجاگر کرتی ہیں، کیونکہ اس مرکزے ک چھت تلے دو پیار کرنے والوں کی ملاقات ہوئی اور جدائی بھی، اور دوپہر کے کجلا کر شام میں منقلب ہونے کا لابُدی وقوعہ بھی یہیں ظہور پذیر ہوا۔(۶)

نظم ''پیپل'' میں شاعر کہتا ہے کہ زندگی مصائب وآلام کا مجموعہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی پر میں بہت غور کر چکا ہوں، اس کا گہرا مشاہدہ کر چکا ہوں اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں کبھی خوشی آتی ہے اور کبھی غم لیکن غم خوشی پر غالب ہیں۔ پیپل کو شاعر نے انسانی زندگی کا استعارہ بنایا ہے۔ رفیق سندیلوی اس نظم کو کچھ اس انداز سے دیکھتے ہیں:

پیڑ کے حوالے سے نظم ''پیپل'' بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے جس میں پیپل کو تہذیب کے مُرادی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں تہذیب کے صوری خدوخال، اس کی کہنگی، تاریخیت، سریّت اور روایاتی خم و پیچ پر غور وخوض بھی ملتا ہے اور تہذیب کے پُرسکون، متحرک اور متلاطم رویّوں کو جاننے کا تجسس بھی۔ پیپل وہ پیڑ ہے جس کے نیچے شاکیہ منی نے ریاضت کی تھی اور نروان پایا تھا، سو اس نظم میں فردِ واحد کے طور پر تہذیب سے وابستہ روحانی اضطراری اور گیان پانے کی آرزو کی طرف بھی اشارہ دیا گیا ہے۔(۷)

رفیق سندیلوی کا اس نظم کے بارے میں نقطۂ نظر اہم اشارے کرتا ہے مگر ناصر عباس نیّر اس نظم کا کچھ یوں تجزیہ کرتے ہیں:

نظم ''پیپل'' میں داخلی شخصیت کے بنیادی عناصر کو دریافت کیا گیا ہے۔ جس طرح انسان کسی جلوس، بلوے، اجتماع یا گینگ کا حصہ بن کر اپنی انفرادی شخصیت سے محروم ہو جاتا ہے اور جلوس یا گینگ کی اجتماعی نفسیات کا تابع فرمان ہو جاتا ہے اسی طرح درخت جب تک جنگل

کے جال کی گرہ ہے خوف پیدا کرتا ہے مگر جنگل کا طوق اتارتے ہی
درخت کی ملائم، نرم، سایہ دار شخصیت ابھر آتی ہے۔(۸)

نظم ''یاد'' میں شاعر کہتا ہے کہ کوئی اچھی یاد انسانی طبیعت پر خوش گوار اثرات ڈالتی ہے۔ وہ کتنا پریشان، اداس اور غمگین کیوں نہ ہو کچھ وقت کے لیے خوش ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ سہانی یاد اس کے ذہن سے اترتی ہے، دوبارہ انسان اپنے مسائل میں گھر جاتا ہے۔ اس کی وہی حالت دوبارہ ہو جاتی ہے، ہر طرف دکھ اور غم دکھائی دینے لگتا ہے۔ شاعر آخر میں کچھ یوں کہتا ہے:

گزر چکا ہے ہوا کا جھونکا
روش روش پر ہیں غم کے مارے
خزاں کے ٹوٹے ہوئے سہارے(۹)

(یاد)

شاعر نے سہانی یاد کو یہاں ہوا کا جھونکا قرار دیا جو ہوا کے جھونکے کی طرح کچھ دیر کے لیے آتی ہے اور پھر فوراً رخصت ہو جاتی ہے۔ اس سے مراد خوشی بھی لیا جا سکتا ہے جو انسانی زندگی میں غم کی نسبت برائے نام ہے۔ نظم ''حیات نو'' میں شاعر کہتا ہے کہ میری زندگی دکھوں اور غموں سے لبریز تھی کہ اک ننھی سی آواز نے میری زندگی میں خوشی لائی۔ یہ نظم غالباً وزیر آغا نے اپنی بیٹی کی پیدائش پر لکھی تھی کہ اس کی پیدائش اُن کی زندگی میں خوشیاں لائی۔ شاعر کا اس نظم میں مرکزی خیال یہی ہے کہ انسانی زندگی دکھوں کا گھر ہے۔ کبھی کبھار انسانی زندگی میں چھوٹی موٹی خوشی آتی ہے اور پھر وہی دکھ بھری زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ شاعر کچھ یوں کہتا ہے:

دو ستارے میری آنکھوں میں بھی
لہراتے تھے(۱۰)

(حیات نو)

یہاں دو ستارے سے مراد شاعر نے دونوں آنکھوں میں آنے والے آنسو مراد لیے ہیں۔ ناصر عباس نیّر اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''۱۹۵۴ء میں لکھی گئی نظم ''حیاتِ نو'' میں عورت ایک ننھی معصوم گڑیا کے روپ میں سامنے آئی ہے اور زندگی سے لبریز ایک قہقہے سے شاعر کے ''بے نوا اداسی کی گپھا'' میں گزرتے شب و روز میں مسرتوں کے پھول کھلا گئی ہے۔''(۱۱) اس سے معلوم ہوا کہ یہ نظم وزیر آغا نے اپنی بیٹی کی پیدائش پر لکھی تھی جس کی پیدائش نے اُن کی زندگی میں خوشی لائی۔ ارمان نجمی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں: ''گھر کے آنگن میں ننھی گڑیا کے قہقہے نے انہیں زندگی کی تخلیق اور مسرت کے مفہوم سے جو آشنائی بخشی ہے اس میں ہم پوری طرح شریک ہو

جاتے ہیں۔لیکن ہنوز وہ فطرت کے اسرار سے دامن کش نہیں ہونا چاہتے۔''(۱۲)

''دن کا زرد پہاڑ'' کی نظم ''مراجعت'' میں شاعر دن بھر دنیا کے دکھ دیکھ دیکھ کر ساری رات ان دکھوں کی آگ میں جلتا اور کڑھتا رہتا ہے۔یوں دوبارہ صبح ہو جاتی ہے تو شاعر پھر سے دنیا کے دکھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور خود بھی دنیا کی رونق میں دن کے وقت مصروف ہو جاتا ہے لیکن دوبارہ رات ہوتے ہی شاعر کی کیفیت ویسی ہی ہو جاتی ہے، وہ دنیا کے دکھوں سے جلنے اور کڑھنے لگتا ہے۔نظم ''درماندہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کی زندگی غموں سے لبریز ہے اور خوشی بہت کم وقت کے لیے اس کی زندگی میں آتی ہے اور فوراً لوٹ جاتی ہے۔نظم ''یلغار'' میں شاعر نے خود پہ ہونے والی دکھوں کی یلغار کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے شاعر بددل اور مایوس ہو چکا ہے، اس کی روح تک مردہ ہو چکی ہے۔

''نردبان'' میں اس موضوع پر موجود نظموں میں ''سمندر اگر میرے اندر آ گرے''، ''اک تنہا بے برگ شجر''، ''آمد''، ''دکھ میلے آکاش کا'' اور ''برف'' شامل ہیں۔''سمندر اگر میرے اندر آ گرے'' میں شاعر کہتا ہے کہ اگر میرے اندر سمندر بھی آ گرے تو بھی میری پیاس نہیں بجھا سکتا۔وہ تو خود میری اندر کی تپش سے پیاسا ہو جائے گا۔وہ مجھ میں ہو کے بھی نہیں ہوگا۔یہ ہو کے بھی نہ ہونے کا احساس کتنا عجیب ہے۔انسان دکھوں میں گھر کر ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتا کیونکہ دکھ اسے بے حس کر دیتا ہے۔دوسرا مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے کہ انسان کی اوقات کچھ بھی نہیں ہے۔وہ اس کائنات میں ایک ذرہ کی سی حیثیت رکھتا ہے جو ہو نہ ہو ایک برابر ہے۔''اک تنہا بے برگ شجر'' میں شاعر نے انسان کے اندر کے دکھ کو ایک تنہا بے برگ شجر سے تشبیہ دی ہے جو موسم آنے پر سارے جسم تک پہنچ جاتا ہے اور سارے بدن کو تڑپاتا ہے۔ناصر عباس نیّر اس نظم کا تجزیہ کچھ یوں کرتے ہیں:

> ۱۹۷۸ء میں وزیر آغا ''اک تنہا بے برگ شجر'' تخلیق کرتے ہیں۔یہ نظم انسانی دکھوں کے دائمی اور پائیدار ہونے کو موضوع بناتی ہے۔شاعر دکھ کو اک تنہا بے برگ شجر کی صورت میں محسوس کرتا ہے جو روشنی، ہوا وغیرہ سے سرسبز ہو جاتا ہے۔شاعر نے درخت اور انسانی بدن میں غیر معمولی مشابہت بھی دریافت کی ہے۔(۱۳)

ناصر عباس نیر کے مطابق اس نظم میں وزیر آغا نے انسانی دکھوں کا ذکر کیا ہے جبکہ رفیق سندیلوی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں: ''نظم ''اک تنہا بے برگ شجر'' ہے جس میں وزیر آغا نے دکھ کو اپنے اندر کی کشتِ ویراں کا اک تنہا بے برگ شجر قرار دیا ہے۔''(۱۴) نظم ''آمد'' میں شاعر ماضی کی تلخ یادوں پر آہ و بکا کرتا دکھائی دیتا ہے۔نظم ''دکھ

میلے آکاش کا'' میں شاعر نے انسانی زندگی کے اہم حصہ دکھ کو موضوع بناتے ہوئے کہا ہے کہ دکھ زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ آسمان کو بھی دکھی قرار دیا ہے اور آسمان سے بارش کے قطروں کے برسنے کو آسماں کا دکھ میں رونا قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید مختلف طریقوں سے شاعر نے دکھ کو بیان کیا ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس نظم میں شاعر نے آلودگی کو آسمان کا دکھ قرار دیا ہے۔ آلودگی جو کہ فضا کو گندہ کر رہی ہے۔ شاعر کا اشارہ اس طرف دکھائی دے رہا ہے۔ شاعر نے اس دکھ کو ایسا دکھ قرار دیا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ:

دکھ کے روپ ہزاروں ہیں
ہوا بھی دکھ اور آگ بھی دکھ ہے
میں تیرا تو میرا دکھ ہے
پر یہ میلے اور گہرے آکاش کا دکھ
جو قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے
اس دکھ کا کوئی انت نہیں ہے (۱۵)

(دکھ میلے آکاش کا)

ایک اور نظم ''برف'' میں شاعر کہتا ہے کہ غم کی گھڑی گزرتی نہیں جبکہ خوشی کے لمحات تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر کو کسی کی بے وفائی کا دکھ بھی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ جو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا، میں کیوں اس کے بارے میں سوچوں؟ کیوں اسے یاد کروں؟ اس نے میری محبت کو ٹھکرایا ہے، مجھ سے بے وفائی کی ہے۔ شعری مجموعہ ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں دکھ کے موضوع پر لکھی گئی نظموں میں ''آنسو بھری مسکان''، ''کسی کسی دن''، ''دکھن خیمے میں رہتی ہے'' اور ''شام سے کہہ دو'' شامل ہیں۔ ''آنسو بھری مسکان'' میں شاعر کہتا ہے کہ میری زندگی مصائب و آلام میں گھر چکی ہے۔ ہر طرف دکھ اور مصائب ہیں۔ خوشی بہت کم انسان کے مقدر میں ہوتی ہے۔ صبح اخبار میں سوائے غمناک خبروں کے کچھ نہیں پڑھنے کو ملتا۔ دکھ اور غم ہمیں ہر جگہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ نہ جانے ہم کہاں آ گئے ہیں جہاں ہر طرف دکھ ہی دکھ ہیں۔ ''کسی کسی دن'' میں شاعر نے کہا ہے کہ خوشی انسان کے نصیب میں بہت کم ہے اور جب کبھی بھولے سے آ بھی جائے تو غم کو عجب بے چینی سی شروع ہو جاتی ہے اور پھر یہ بے چینی خوشی کو ہماری زندگی سے دور کر کے ہی چھوڑتی ہے۔ اصل میں شاعر کہنا یہ چاہ رہا ہے کہ غم ہماری زندگی میں خوشی کی نسبت بہت زیادہ شامل ہے۔ ''دکھن خیمے میں رہتی ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ دکھ میری آنکھ میں آنسو بن کر بیٹھے ہیں۔ شاعر کی آنکھ نئی نسل کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر بہتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری شریانوں میں جو خون بہہ رہا ہے، وہ دکھ کو پورے بدن تک پہنچا رہا ہے۔ اس نظم میں شاعر کا دکھ نسل نو کی تباہ کاری

ہے۔شاعر نظم میں کچھ یوں بیان کرتا ہے:

دکھن
آنکھوں کے خیمے میں
نہ جانے کب سے رہتی ہے(۱۶)
(دکھن خیمے میں رہتی ہے)

نظم ''شام سے کہہ دو'' میں شاعر کہتا ہے کہ اب حالات بہتر ہو گئے ہیں۔اس لیے غموں اور دکھوں کو بھول کر خوش ہو جاؤ جیسے میں خوش ہو گیا ہوں۔اس نظم میں شاعر کو حالات میں بہتری نظر آ رہی ہے۔اس لیے وہ سب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ماضی کے دکھوں اور غموں کو بھلا کر حال کی خوشی میں خوش ہو جاؤ۔شعری مجموعہ ''یہ آواز کیا ہے'' میں دکھ کے عنوان پر مشتمل نظموں میں ''پہلی رنجش کے بعد'' اور ''دیکھو کیسے دکھ لایا ہوں'' شامل ہیں۔''پہلی رنجش کے بعد'' میں شاعر نے کہا ہے کہ کسی کے ساتھ ہونے والی رنجش کے بعد صلح ہو جانے سے عجب لطف اور سکون ملتا ہے۔ایسے لگتا ہے جیسے تاریکی کے بعد ابھی اجالا ہوا ہو۔شاعر کہتا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ایسی جگہ جا کر بیٹھوں جہاں کبھی لڑائی ہے تو کبھی صلح ، کیونکہ اس عمل میں بہت لطف و سرور پایا جاتا ہے، یہ عمل خوشی دیتا ہے۔شاعر اس عمل کے ذریعے خوشی اور سکون حاصل کرنا چاہتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ رنجش کے بعد صلح کا مزہ لو، یہ ایک دلچسپ تجربہ ہے۔اس دکھ اور چبھن میں عجیب لطف ہے۔دکھ اور تلخی کا بھی ایک اپنا الگ سا مزہ ہے۔دکھ کے ساتھ رہنا سیکھو۔شاعر کہتا ہے کہ میری طرح دکھ سے لطف اندوز ہونا سیکھو۔پروفیسر جمیل آذر اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> آخری مصرعہ بالکل واضح کر دیتا ہے کہ یہ دونوں کردار جیون ساتھی ہیں اور کسی وجہ سے رنجش کی زد پر ہیں اور یہ پہلی رنجش ہے جسے نہایت رومانی انداز سے خوبصورت ریستوران کے پُرسکون ماحول میں دور کیا گیا ہے۔رنجش کے بعد صلح کا بھی بڑا نشہ ہوتا ہے اور اسی کیفیت کا اپنا ہی مزہ ہے۔اس پوری نظم میں مرکزی کردار ہی گفتگو کرتا ہے جب کہ دوسرا کردار بالکل خاموش رہتا ہے۔سماجی پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو ہماری مشرقی خواتین کا یہ وصفِ خاص ہے کہ وہ خاوند کے سامنے سرِ تسلیم خم ہی کرتی ہیں۔لہذا خاموش رہنے کے باوصف وہ اس تمام ڈرامے میں بھرپور شرکت کرتی ہے۔(۱۷)

وزیر آغا کی نظم ''دیکھو کیسے دکھ لایا ہوں'' میں وہ گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب انسان پر مسلسل غموں اور دکھوں کی بارش ہوتی ہے تو دکھ اس کے لیے نشہ بن جاتے ہیں۔ پھر ایسے شخص کو سکھ اور خوشی میں مزہ نہیں آتا اور دکھ اسے مزہ دینے لگتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ آجکل سورج نکلتے ہی نئے نئے دکھوں کی خبریں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ دکھ کے نشے میں سرشار لوگوں سے دکھ بیچنے والا کہتا ہے کہ دیکھو کہ میں کیسے بہترین دکھ لایا ہوں۔ شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

وہ چیخ چیخ کر کہتا ہے
دنیا بھر کے دکھ لے لو جی
نشہ باز و
دیکھو کیسے بالکل تازہ دکھ
لایا ہوں
گرم، کرارے دکھ لایا ہوں (۱۸)
(دیکھو کیسے دکھ لایا ہوں)

یوں معلوم ہوا کہ اس نظم میں شاعر نے دکھ کو دکھ نہیں بلکہ خوشی قرار دیا ہے کیونکہ دکھ اسے اب مزہ دینے لگے ہیں۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں: ''دیکھو کیسے دکھ لایا ہوں'' معاشرے کے دکھوں کو آئینہ دکھاتی ہے جس دکھ سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے کہ اس نے ایک فرد ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ یہ دکھ کچھ لوگوں کے لیے ایک نشہ بن گیا ہے۔''(۱۹)

شعری مجموعہ'' چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''ہم لاکھوں بھیگی پلکوں پر'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ ہر طرف دکھ ہی دکھ دکھائی دے رہے ہیں۔ انسان کی قسمت میں دُکھ بھری زندگی جینا لکھ دیا گیا ہے تو اسے جینا ہی ہوگی۔ اس کے علاوہ اور اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ شاعر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انسان اپنی قسمت کا لکھا بدل نہیں سکتا اور انسان کی قسمت میں دکھ اور غم بھری زندگی گزارنا لکھ دیا گیا ہے۔ ''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''دیوار گریہ''، ''کہاں گئی ہو''، ''عجب وہ شخص تھا'' اور ''یہی اپنا ٹھکانہ ہے'' شامل ہیں۔ ''دیوار گریہ'' میں غم کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہر طرف دکھ پھیلا ہوا ہے، آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اس جہاں میں کوئی بھی غم سے نہیں بچ سکتا۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ میری کیا مجال ہے کہ میں غم سے بچ سکوں، آج تک کوئی بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ ''کہاں گئی ہو'' میں شاعر کہتا ہے کہ اچھے دن کچھ عرصے کے لیے آتے ہیں اور پھر ہر طرف دکھ ہی دکھ چھا جاتے ہیں۔ شاعر

نے یہ نظم کسی اپنے سے جدا ہونے کے بعد لکھی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تمھارے ہوتے سب اچھا تھا، ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی۔ تم سے جدا ہونے کے بعد خوشیوں کی جگہ غموں نے لے لی ہے۔ اب ہر موسم غمگین ہے، ہر طرف دکھ ہی دکھ ہے۔ ''عجب وہ شخص تھا'' میں کسی ایسے شخص کا ذکر کیا گیا ہے جو دکھوں کی وجہ سے ساری رات جلتا کڑھتا رہتا ہے۔ اس شخص کے سینے میں ایسی آگ لگی ہ جوالاؤ بن کر جل رہی ہے۔ ''یہی اپنا ٹھکانہ ہے'' میں شاعر نے انسان کا اندر کا دکھ بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر انسان غموں میں ڈوبا ہوا ہے۔ غم کو انسان کی قسمت قرار دیا گیا ہے۔

اس موضوع پر وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''گھاس میں تتلیاں'' میں موجود نظموں میں ''ساون کا آخری دن''، ''ایک آبی پرندہ''، ''سنجوگ''، ''اندر کے رونے کی آواز'' اور ''مجھے خزاں نے بہت ڈرایا'' شامل ہیں۔ ''ساون کا آخری دن'' میں شاعر نے کہا ہے کہ انسان دکھوں میں گھرا ہوا ہے۔ ساون کے موسم میں ہونے والی بارشوں سے انسان کا دکھ میں آنسو بہانا مراد لیا گیا ہے۔ ساون کو غم کا مہینہ قرار دیا ہے۔ ''ایک آبی پرندہ'' میں شاعر نے خوشی کو ایک آبی پرندہ کہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان جس طرح آبی پرندہ کو اس کے حسن کی وجہ سے دیکھنے کا خواہاں ہوتا ہے، ویسے ہی اس دکھ بھری زندگی میں خوشی کو پانے کی طلب رکھتا ہے۔ ''سنجوگ'' میں شاعر کسی ایسے شخص کے بارے میں بیان کرتا ہے جو بظاہر مسکرا رہا ہے لیکن اس کی ہنسی کڑوی کڑوی ہے جیسے دکھ کی آمیزش ہو۔ ''اندر کے رونے کی آواز'' میں شاعر نے انسان کا داخلی کرب کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کی کوئی عزیز چیز اس سے جدا ہوگئی ہے جو اس کے وجود کا حصہ تھی، اس لیے انسان اَب خود کو ادھورا اور نامکمل محسوس کرتا ہے۔ اپنی اس پیاری چیز کی جدائی میں تڑپتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس دکھ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جدائی کی خلیج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ دراصل یہ انسانی داخلی کرب خدا سے الگ ہونے کا ہے جو انسان کو ہمیشہ تڑپاتا رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ:

میں اندر کے رونے کی اس بھیگی آواز کو جانتا ہوں
ازل سے میں اس بھیگی آواز کو سن رہا ہوں (۲۰)
(اندر کے رونے کی آواز)

غرضیکہ اس نظم میں شاعر نے انسانی اندرونی کرب کو موضوع بنایا ہے۔ ناصر عباس نیّر اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اس نظم میں انسان کے اس داخلی کرب کو موضوع بنایا گیا ہے جو پتھر پر
لکیر کی طرح پائیدار ہے۔ پوری کائنات میں یہ کرب انسان کا ہی

مقدر ہے۔عناصر قدرت انسان کے اندر کے اس گہرے دکھ کو محسوس نہیں کر سکتے۔شاید اس لیے انسان نے اپنے اور فطرت کے مابین فاصلہ پیدا کر لیا ہے۔اب وہ اپنی ذات کی تنہائی سے لرزاں و ترساں ہے۔اصل یہ ہے کہ فطرت ''اندر'' اور ''باہر'' کی تفریق کے کرب سے محفوظ ہے۔وہ پورے طور پر خود اپنے آپ سے وابستہ ہے جب کہ انسان ''اندر'' اور ''باہر'' میں بٹ گیا ہے اور یہ دونوں سطحیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔یوں اس پوری کائنات میں صرف انسان ہی خود اپنا دشمن بنا ہے۔(۲۱)

نظم ''مجھے خزاں نے بہت ڈرایا'' میں شاعر خزاں سے مراد دکھوں کا موسم لے رہا ہے۔شاعر نے خود کو خزاں کے موسم میں درخت سے جھڑے ہوئے پتے سے تشبیہ دی ہے جس کی قسمت میں ٹھوکریں کھانا لکھا ہوتا ہے۔خزاں میں پتے درختوں سے جھڑ کر نیچے گرتے ہیں۔لوگ انہیں پاؤں تلے روندتے ہیں، ان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔شاعر کہتا ہے کہ میں بھی ایک خزاں رسیدہ پتہ ہوں، مجھے بھی ایسے ہی زمین پر پھینک دیا جائے گا، پاؤں تلے روندا جائے گا۔مجھے خزاں مراد دکھ ڈرا رہے ہیں لیکن میں ان سے نہیں ڈرتا۔ناصر عباس نیّر اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مگر ''مجھے خزاں نے بہت ڈرایا'' میں اسی درخت کو خزاں ڈراتی دھمکاتی ہے کہ وہ خزاں زدہ پیڑ پر سے گرنے والے ہزاروں بدرنگ چیتھڑوں میں سے ایک پھٹا پرانا چیتھڑا ہے جسے ہوا کے جاروب لمحہ بھر میں غلیظ سڑکوں پر پھینک دیں گے اور کڑکتے بھاری بوٹ اسے بھی روند ڈالیں گے مگر شاعر نہیں ڈرتا کیونکہ وہ خشک پتہ نہیں۔وقت کی تخلیقی قوت کو جذب کر کے وہ بیج میں ڈھل گیا ہے اور امکانات کے ایک وسیع دائرے کو تشکیل دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔(۲۲)

مجموعہ نظم ''عجب اک مسکراہٹ'' میں دکھ کے موضوع پر مشتمل نظموں میں ''کینوس''، ''ژالہ باری''، ''بے خوابی''، ''چلو جھولی پسارین''، ''کہو ستارو'' اور ''کہاں گئی وہ بات'' شامل ہیں۔اس مجموعہ کی نظم ''کینوس'' میں دنیا کے دکھوں کا ذکر ہے۔شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں ہر طرف گمراہی اور ظلم ہے، عام آدمی کے ساتھ برا سلوک اور رویہ برتا جا رہا ہے، ہر طرف ظلم کا بازار گرم ہے۔''ژالہ باری'' میں زمین کے دکھ کا ذکر کیا گیا

ہے جس میں آسمان برابر کا شریک ہے۔شاعر کہتا ہے کہ زمین و آسمان دونوں دکھوں سے لبریز ہیں۔آسمان کا بادل زمینی دکھ میں شریک ہوا،اس نے اپنا دکھ زمین کے دکھ میں شامل کر دیا ہے۔بادل نے خوب برس کر اپنا دکھ بیان کیا ہے۔''بے خوابی'' میں شاعر نے بیان کیا ہے کہ کبھی کبھی جب رات کے وقت نیند نہیں آتی، بے خوابی طبیعت پر طاری ہو جاتی ہے، نیند آنکھوں سے رخصت ہو جاتی ہے تو ایسی رات کی صبح کرنا کتنا کٹھن اور مشکل ہو جاتا ہے۔بے خوابی کی وجہ بھی کوئی دکھ یا تکلیف بنتی ہے اور ایسی کیفیت میں وقت کاٹنا بھی کسی بڑے دکھ سے کم نہیں۔''چلو جھولی پساریں'' میں شاعر کہتا ہے کہ اس کی زندگی غموں اور دکھوں میں گھری ہوئی ہے۔اس کے خواب پورے نہیں ہوئے جس کا اسے دکھ ہے۔غموں نے اسے منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔''کہو ستارو'' میں شاعر نے اپنے دکھوں اور غموں کا اظہار کیا ہے۔پہلے زمین کی خوب صورتی اور رنگینی کو بیان کیا ہے لیکن اس خوب صورت دنیا میں شاعر کا دل غمگین ہے۔شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں ہر طرف کھیل تماشہ ہو رہا ہے۔انسان اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر دنیا کی رنگینیوں میں مست ہو گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ:

کہو ستارو، تم نے دیکھے
میری جیب کے تار
جھولی کے سوراخ
اور سینے کے چاک (۲۳)
(کہو ستارو)

نظم ''کہاں گئی وہ بات'' میں شاعر نے انسان کی تنہائی اور جدائی کے دکھ کو موضوع بنایا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ جب سے میری اس ذات سے جدائی ہوئی ہے، میری زندگی دکھوں میں گھر گئی ہے۔ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

> کہاں گئی وہ بات'' جدائی کا ایک ایسا المیہ پیش کرتی ہے جو بے التباسی کا زائیدہ ہے۔شکست پیمانی کے نتیجے میں شکستگی سے پیدا صورت حال انسان کو خون کے آنسو ہی نہیں رلاتی ہے بلکہ اس کی انا کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ایسی اذیت ناک صورت حال میں گرفتار ہو کر زندہ رہنا لمحہ لمحہ احساس پر کچوکے لگاتا رہتا ہے۔(۲۴)

شعری مجموعہ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر لکھی گئی نظموں میں ''RENOVATION''، ''کوئی اندر ہی اندر جل بجھا ہے''، ''دن چڑھتے ہی''، ''سات پردوں کے

پار''، ''یہ ریکھائیں'' اور ''کیتھارسس'' شامل ہیں۔اس مجموعہ کی نظم ''RENOVATION'' میں شاعر نے انسان کے اندرونی کرب و ابتلا کو موضوع بنایا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ زندگی دکھوں اور مسائل کا مجموعہ ہے۔''اندر ہی اندر جل بجھا ہے'' میں شاعر نے ایسے شخص کو موضوع بنایا ہے جو بڑے دل کا مالک ہے۔بڑی سی بڑی پریشانی اور مصیبت کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ ایسا شخص بھی مصائب برداشت کرتا کرتا پگھل جاتا ہے، اندر ہی اندر جلتا کڑھتا رہتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ زندگی دکھوں کا گھر ہے۔دکھ سے کوئی انسان بچ نہیں پاتا۔''دن چڑھتے ہی'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان دن چڑھتے ہی طرح طرح کے دکھوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، صبح کا اخبار پڑھ کر انسان پریشان ہو جاتا ہے اور وہی پریشانی سارا دن اسے ستاتی رہتی ہے۔صبح کے اخبار سے لے کر شام ہونے تک انسانی زندگی مسائل میں گھری رہتی ہے۔''سات پردوں کے پار'' میں شاعر کہتا ہے کہ دکھوں کی وجہ سے انسانی زبان خاموش ہے اور دکھوں کا مداوا سات پردوں کے پار موجود ہے۔شاعر کہتا ہے کہ انسان مختلف طرح کی پابندیوں اور مجبوریوں میں جکڑا ہوا ہے۔''یہ ریکھائیں'' میں شاعر نے قسمت میں لکھی تکالیف اور مصائب کو موضوع بنایا ہے۔شاعر نے لکھا ہے کہ اس کی ساری زندگی دکھوں میں کٹی ہے، اب بڑھاپے میں حالات کچھ بہتر ہوئے ہیں لیکن زندگی کے قیمتی ایام گزر گئے۔اب قسمت بدلنے کا کیا فائدہ؟ نظم ''کیتھارسس'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان سارا دن طرح طرح کے دکھ سہتے گزار دیتا ہے۔جونہی سورج نکلتا ہے، انسان کی ایک دوڑ سی لگ جاتی ہے۔شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

اور وہ اک اک کر کے
سارے دکھڑے پڑھتا جاتا ہے
شام تلک دکھڑوں کی جیسے
اک کتاب سی بن جاتی ہے(۲۵)
(کیتھارسس)

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''آنسو کی چلمن کے پیچھے''، ''سانتا کلاز''، ''دھوپ کے ڈھیر لگاؤ نہ یہاں''، ''ڈراوا''، ''ایش ٹرے''، ''جلی حروف مٹا کر دیکھو''، ''لفظوں کی اک ڈار''، ''اک برکھا بھیگے خوابوں کی''، ''ریزہ ریزہ کر جاتا ہے'' اور ''بندھن'' شامل ہیں۔''آنسو کی چلمن کے پیچھے'' میں شاعر نے خوشی کی رخصتی اور دکھ کی آمد کو بیان کیا ہے۔دکھ کی وجہ سے آنکھیں اشک بار ہیں۔دکھ ہمیشہ کے لیے آ گیا ہے اور آنسوؤں کا سبب بن رہا ہے۔''سانتا کلاز'' میں شاعر نے دکھوں کے تحفے کا ذکر کیا ہے۔سانتا کلاز کے ساتھ مسرتوں اور تحفوں کا تصور وابستہ ہے لیکن شاعر نے اس نظم میں مسرتوں

کی بجائے دکھوں کے تحفوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

''سانتا کلاز'' گرچہ ایک مغربی تہذیبی تصور ہے مگر اب ہمارے
معاشرے میں بھی ایک حقیقت بن چکا ہے۔ سانتا کلاز کی آمد سے
مسرتوں اور تحفوں کا تصور وابستہ ہے مگر اس نظم میں دکھوں اور آنسوؤں
کے تحفے سے سبز تھیلے کو بھرنے کے خیال سے سانتا کلاز جو شفقت
پدری کی علامت بن گیا ہے ایک المیہ کردار کی صورت اختیار کرتا ہے
کہ وہ اس بار خالی ہاتھ ہی آسکا ہے۔ پوری نظم حکایت کے پیرائے
میں اتری ہے اور تاثر سے بھرپور ہے۔(۲۶)

نظم ''دھوپ کے ڈھیر لگاؤ نہ یہاں'' میں شاعر کہتا ہے کہ دکھوں کے ڈھیر نہ لگاؤ۔ اگر کوئی خوشی آتی ہے تو اسے آنے دو۔ دکھ بھی آئے، یہ بھی زندگی کا حصہ ہے لیکن اتنے دکھ نہ ہوں کہ زندگی خوشیوں سے بالکل خالی ہو جائے اور صرف دکھ ہی دکھ ہر طرف دکھائی دیں۔ شاعر نے نظم میں کچھ یوں کہا ہے:

دھوپ کے ڈھیر لگاؤ نہ یہاں
ابر کے چاک سے وہ آئے
تو آنے دو اسے(۲۷)

(دھوپ کے ڈھیر لگاؤ نہ یہاں)

ایک اور نظم ''ڈراوا'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان مختلف قسم کے مصائب دیکھ دیکھ کر اب وقت کے جبر سے ڈرنے لگا ہے۔ یہ ڈراوا ہر وقت انسان کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ ماضی کے خوفناک واقعات ذہن میں آتے ہیں تو انسان کی روح تک کانپ جاتی ہے۔ ''ایش ٹرے'' میں شاعر کہتا ہے کہ جب کبھی رات کو نیند نہ آئے تو رات گزارنا کٹھن اور دشوار ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اگر انسان بیمار ہو تو اس کے لیے ایسی رات بہت اذیت ناک ہو جاتی ہے۔ ایک ایک لمحہ سالوں پر محیط لگتا ہے، انسان درد کی شدت سے نڈھال اور ادھ موا سا ہو جاتا ہے۔ ''جلی حروف مٹا کر دیکھو'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسانی چہروں پر بظاہر خوشی نظر آتی ہے، اندر غم ہی غم ہے۔ ظاہر کی خوشی جب انسان ہٹا دیتا ہے تو ہر وقت چہرہ اداس اور پریشان رہتا ہے۔ اس کے اندر کا دکھ اس کے چہرے پر عیاں ہو جاتا ہے۔ ''لفظوں کی اک ڈار'' میں شاعر کہتا ہے کہ حادثات نے میری خوشیوں بھری بولی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ہر طرف دکھ ہی دکھ دکھائی دے رہا ہیں۔ زندگی دکھوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ ''اک برکھا بھیگے خوابوں کی'' میں شاعر کہتا ہے کہ میں دکھ کی آگ میں جل رہا ہوں، مجھے ہر کوئی دکھی اور پریشان نظر آتا ہے۔ دنیا دکھوں اور

پریشانیوں کا گھر ہے اس لیے یہاں ہر کوئی دکھی اور پریشان ہے۔ ''ریزہ ریزہ کر جاتا ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ خوشی کی زندگی گزارنے والوں کو کون سمجھائے کہ جب غم کا لمحہ آجاتا ہے تو زندگی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ شاعر نے ہر انسان کو دنیا کی حقیقت سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اچھے وقت میں بُرے وقت کو یاد رکھنے کا درس دیا ہے کیونکہ برا وقت آتے دیر نہیں لگتی، یہ دنیا تو ہے ہی مصیبتوں، دکھوں اور تکلیفوں کا گھر۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

جب لمحوں کے
نظر نہ آنے والے ریزے
جڑ جاتے ہیں
کیسے۔۔۔۔ ایک پہاڑ سا لمحہ
بن جاتے ہیں (۲۸)
(ریزہ ریزہ کر جاتا ہے)

''کیسا انوکھا بخیہ گر ہے'' کے عنوان سے نظم وزیر آغا کی شعری کتاب ''ہم آنکھیں ہیں'' میں موجود ہے۔ اس نظم میں شاعر ماضی کے حادثات پر نوحہ کناں ہے، وہ اپنے دل کی بھراس قلم کے ذریعے کاغذ پر نکالتا ہے، سارا دن لوگوں کے دکھ محسوس کر کے رات کو ان تمام دکھوں کو کاغذ پر اتار کر دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔ اسی مجموعہ کی نظم ''دکھ بھائی'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسانی زندگی دکھوں اور تکلیفوں کا مجموعہ ہے۔ دکھ انسان کو بے حد بے زار کرتا ہے لیکن انسان ان کا مقابلہ کر کے اپنی زندگی جیتا ہے۔ انسان ان دکھوں کو شکست دے کر زندگی جیتا ہے۔ نظم ''بندھن'' میں شاعر سوالیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دنیا کا امن، خوشی اور اچھے دن کہاں گئے جب سب مل جل کر پیار محبت سے رہا کرتے تھے۔ اب تو ہر طرف خوف، بے یقینی اور ظلم کا بازار گرم ہے۔ ہر کوئی پریشان اور ہراساں ہے۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

> ''بندھن'' میں صرف شعری کردار ہی نہیں بلکہ اس کے اردگرد کی ساری کائنات ہی خوف کی مٹھی میں مقید ہے۔ ڈرے، سہمے ہوئے معاشرہ کی تصویر کشی کر کے وہ خود سے یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ کون ہیں ہم جو سہمے پیڑوں، ڈرے پرندوں، لرزتے تاروں سے بندھ گئے ہیں، خود اپنے سایوں سے ڈر گئے ہیں۔ وہ جب اپنے اردگرد نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کے ذہن میں ایسے کئی سوالات جنم لیتے ہیں جو ان کی اجتماعی وجود کی ذمہ داریوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ خارج سے باطن کی جانب یہ

مراجعت ان کے تخلیقی رویہ کی نشاندہی کرتی ہے۔(۲۹)

''کاسہ شام'' جو کہ وزیر آغا کی شاعری کا آخری مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں دکھ کے عنوان پر مشتمل نظموں میں ''مہا اسطور کے اندر کہیں''، ''دکھ کی میلی دھند کے اندر''، ''تعاقب'' اور ''خاک میں مل کر خاک'' شامل ہیں۔ ''مہا اسطور کے اندر کہیں'' میں شاعر نے ماضی کے دکھوں کو بھلا کر موجودہ خوشی سے لطف اندوز ہونے کو کہا ہے۔ ''دکھ میلی دھند کے اندر'' میں شاعر نے دکھ کو موضوع بناتے ہوئے کہا ہے کہ دکھ دنیا سے آگے بڑھ کر آسمان تک پہنچ چکا ہے۔ ہر طرف دکھ ہی دکھ نظر آتا ہے۔ اس دکھ کی دھند کے اندر ہم کسی کو بھی دیکھنے سے قاصر ہیں۔ ہر انسان اپنے دکھوں میں اتنا کھویا ہوا ہے کہ اسے دوسرے کے دکھ ہلکے ہلکے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے دکھوں میں گھرا دوسروں کے دکھ دیکھ ہی سکتا ہے، کر کچھ بھی نہیں سکتا۔ ''تعاقب'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان ہر دم نیا سفر شروع کرتا ہے جو دکھوں، تکلیفوں اور مشکلات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ''خاک میں مل کر خاک'' میں شاعر نے ایسے انسان کا ذکر کیا ہے جو اپنے دکھوں کی وجہ سے رو رو کر ہلکان ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے ہیں۔ پھر وہ بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، خدا سے آہ و پکار کرتا ہے لیکن اس کی دعا عرش کے پاؤں سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہے یعنی قبول نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ:

آنسو اس کے خشک ہوئے تھے
اور پھر زخمی چیخیں
گھر کی دیواروں سے ٹکرائی تھیں (۳۰)
(خاک میں مل کر خاک)

مختصراً یہ کہ وزیر آغا کی شاعری میں دکھ کا موضوع جا بجا پایا جاتا ہے۔ وزیر آغا نے دکھ کے مختلف انداز بیان کیے ہیں اور انسان کا سچا اور پکا ساتھی دکھ کو قرار دیا ہے۔

وزیر آغا کی نظموں میں ''خودی کی بیداری اور ضمیر کی بیداری'' کا عنوان جا بجا ملتا ہے۔ اُنہوں نے بار بار اس نکتے کو اجاگر کیا ہے کہ ضمیر کی بیداری کے بغیر انسان خود کو پہچان نہیں سکتا۔ کائنات اور اس کے اسرار سے واقف نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے اصل مقصد کو جان نہیں سکتا۔ اس لیے شاعر نے قارئین کو اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ اپنی پہچان کریں، خود کو پہچان کر ہی وہ زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور انسان ہونے کا اصل حق ادا کر سکتے ہیں۔ اس عنوان پر وزیر آغا کی تقریباً ہر کتاب میں کچھ نظمیں ضرور مل جاتی ہیں۔ جامع اللغات میں لفظ خودی سے مراد اپنا آپ، خود غرضی، خود سری، فخر، غرور وغیرہ لیا گیا ہے۔(۳۱) اقبال کی شاعری کا اہم ترین

موضوع بھی یہی ہے۔اقبال کے چند غزلیہ اشعار ''بال جبریل'' سے اس موضوع پر ملاحظہ ہوں

۱) حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

۲) خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

۳) اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

۴) عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف

۵) خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجُو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

۶) خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

۷) نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

۸) بے ذوقِ نمودِ زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

۹) خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

۱۰) تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر (۳۲)

وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''دن کا زرد پہاڑ'' کی نظم ''سلسلہ در سلسلہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ زمین کائنات کا ایک جزو ہے اور انسان زمین کا ایک جزو اور کائنات کے مقابلے میں ایک ذرہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ میرے نزدیک اگر انسان خود کو پہچان لے تو اس کی حیثیت اور ہستی کائنات کی افضل ترین ہستی ہے۔شعری کتاب ''نردبان'' میں اس عنوان پر لکھی گئی نظموں میں ''نباض''، ''عجیب ہے یہ

سلسلہ''، ''ذات کے روگ میں''، ''دست بستہ کھڑا ہوں''، ''آویزش''، ''جب آنکھ کھلی میری'' اور ''ٹین کا ڈبہ'' شامل ہیں۔ ''نباض'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اگر اپنا محاسبہ کرے تو ہی اسے اپنی برائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر محاسبہ نہ کرے تو برسوں وہ اپنی برائیوں کے ساتھ جیتا رہتا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ برائیوں کا شکار ہے۔ روح کی بیماری کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ:

روگ
باہر کی طرف آئے
تو چہرے پہ لکیریں اس کی
یوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ
ابھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں (۳۳)

(نباض)

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے یہاں روح کے روگ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رفیق سندیلوی اس نظم کو کچھ اس انداز سے دیکھتے ہیں:

> وزیر آغا نے ''نباض'' کے پس منظری مواد پر خود بھی بات کی ہے جس کی روشنی میں نظم کی داخلی کروٹوں کو دیکھنے میں نسبتاً آسانی ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ اس نظم میں وزیر آغا نے بیماری کا نہیں، روگ کا ذکر کیا ہے۔ روگ باطنی بیماری کا نام ہے۔ یہ بیماری کی اتھاہ اور ارفع ترین حالت ہے۔ اس نظم میں وزیر آغا نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ روگ کو وہی شخص جان سکتا ہے جو بذاتِ خود روگ کا شکار ہو۔ معالج یا نباض نبض کی حرکت سے بیماری کی تشخیص تو کر سکتا ہے لیکن روگ کی تہہ تک پہنچنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ نظم ''نباض'' دو ہم روگی شخصیات کے روحانی عکسوں کے تقابل سے جنم لیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شاعر نے اپنی ذات کو نباض کے تکلم ترک مزاج سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ لہٰذا دونوں اطراف سے روگ کی جس قدر بھی تشخیص ہوئی ہے، خاموش اور بھید بھری فضا میں ہوئی ہے۔ (۳۴)

ایک اور نظم ''عجیب ہے یہ سلسلہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ اپنے گناہوں پر نادم ہوتا کہ تمھاری

خطاؤں کی بخشش ہو سکے اور آئندہ کی زندگی بہتر انداز سے گزارو۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم معافی نہیں مانگیں گے تو حالات بہتر نہ ہو سکیں گے۔ ''ذات کے روگ میں'' میں شاعر کہتا ہے کہ سویا ہوا ضمیر جب جاگتا ہے تو انسان سکون محسوس کرتا ہے اور پھر ضمیر کی آواز سن کر جینا شروع کر دے تو چین کی موت مرتا ہے۔ شاعر خواہش کا اظہار کر رہا ہے کہ مرتے دم تک باضمیر رہے تا کہ اسے چین کی موت نصیب ہو اور موت کے بعد بھی چین میں رہے۔ ''دست بستہ کھڑا ہوں'' میں شاعر کہتا ہے کہ روح انسان کے زندہ ہونے کی وجہ ہے اور زندہ انسان روزگار کے بغیر جی نہیں سکتا۔ انسان کو روزگار میں پڑ کر اپنے ضمیر کو نہیں سلا دینا چاہیے، اس کی آواز سننی چاہیے۔ جب انسان ضمیر کی آواز سن کر زندگی بسر کرتا ہے تو اس کی زندگی میں اجالا ہو جاتا ہے اور وہ خود کی حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

میں اپنی طرف مڑ گیا ہوں
مگر دیکھتا ہوں
میں خود اپنے رستے میں
اک سبز جنگل کی صورت کھڑا ہوں (۳۵)
(دست بستہ کھڑا ہوں)

اسی مجموعہ کی نظم ''آویزش'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کبھی کبھی کسی وجہ سے اپنے ضمیر سے ہم کلام ہوتا ہے تو وہ انسان کو خوش آمدید کہتا ہے، وہ تو ہر وقت باہر کے انسان کے انتظار میں رہتا ہے اور جب کبھی اس کی اس انسان سے ملاقات ہوتی ہے تو اس سے خوب باتیں کرتا ہے۔ باہر کا انسان اس کا مقابلہ منفی انداز میں کرتا ہے لیکن اندر کا انسان ہمیشہ انسان کا حقیقی فائدہ ہی چاہتا ہے۔ ''جب آنکھ کھلی میری'' میں شاعر کہتا ہے کہ جب انسان کی حقیقی آنکھ بیدار ہوتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت قیمتی ہستی ہے۔ اسے ایک وقت مقررہ تک مہلت ملی ہے کہ اس وقت میں دنیا میں روشنی پھیلائے، کچھ کر کے دکھائے۔ ''ٹین کا ڈبہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ ضمیر بیدار ہو جائے تو انسان اندھیروں سے نکل کر روشنی کے جہاں میں چلا جاتا ہے۔ انسان کے اندر کی تاریکیاں، روشنیوں میں بدل جاتی ہیں۔ شعری کتاب ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''اپ اینڈ ڈاؤن'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ ہر کسی نے ایک نہ ایک دن اپنی باری آنے پر اس دنیا کو چھوڑ جانا ہے۔ وہ دن آنے سے قبل اپنی اندر کی دنیا آباد کر لو۔ تم آسمان پر جانے سے قبل ہی آسمان کو چھو لو گے۔ خود کو پہچانو، بلندیوں کو چھو لو گے۔

نظم ''پوسٹ مارٹم'' جو کہ آپ کی شعری کتاب ''گھاس میں تتلیاں'' میں موجود ہے۔ اس نظم میں وزیر آغا نے زمین کی موت کی بات کی ہے کہ زمین بنجر اور مردہ ہو چکی ہے اور اس کو دوبارہ زندہ نہ کرنا بہت

نقصان دہ ہے۔ یہاں زمین سے مراد انسانی ضمیر لیا گیا ہے، شاعر نے یہ سب کچھ آج کل کے انسان کے بارے میں کہا ہے کہ آج کل کے اکثر انسانوں کا ضمیر مُردہ ہو چکا ہے، وہ دنیاداری میں غرق ہو کر رہ گئے ہیں۔ صابر لودھی نے اس نظم کا تجزیہ کچھ اس انداز سے کیا ہے: ''نظم ''پوسٹ مارٹم'' میں انسانی جسم کے حوالے سے زمین اور زمین کے حوالے سے جسم کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ انسان فطرت کا ایک حسین مظہر ہے وہ فطرت سے جدا نہیں ہو سکتا۔ شاعر کے نزدیک چٹانوں کا وجود بھی انسانی وجود کا ایک حصہ ہے۔''(۳۶)

شعری مجموعہ ''یہ آواز کیا ہے'' میں اس موضوع پر مشتمل نظم ''چپ بیٹھے کیوں اپنا آپ گنواتے ہو'' ہے۔ اس نظم شاعر نے خودی کی بیداری کی تلقین کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اپنے آپ کو پہچانو، اپنی اصلاح کرو۔ فارغ وقت ضائع کرنے والوں سے شاعر کہتا ہے کہ تم بھی کوئی کام تلاش کرو اور محنت کر کے اپنی زندگی بناؤ۔ تم اس قابل ہو جاؤ کہ لوگ تمھاری پیروی کریں اور یہ صرف اور صرف محنت سے ہی ممکن ہے۔ لوگوں کا مذاق نہ اُڑاؤ۔ ساری عمر یہی کام کرتے رہے ہو۔ جو ایسا کرتا ہے وہ خود بھی لوگوں کے لیے اپنی کاہلی کی وجہ سے مذاق اور تماشہ بن جاتا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو خود کوئی کام نہیں کرتے بس بیٹھے دوسرے لوگوں کے کاموں میں نقائص ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسے لوگ جو دوسروں کا تماشہ بن جاتے ہیں۔ شاعر ایسے لوگوں سے کہتا ہے کہ وقت ضائع کرنا چھوڑو، اپنے آپ کو پہچانو، محنت کرو، محنت ہی زندگی بناتی ہے ورنہ کاہلی اور سستی انسان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

> ''چپ بیٹھے کیوں اپنا آپ گنواتے ہو'' میں تخاطب ان لوگوں سے ہے جو کرتے دھرتے کچھ نہیں لیکن نکتہ چینی کے فن میں طاق ہیں۔ ان کے لیے ایک اشارہ ہے کہ تماشا بننے کے بجائے خود تماشہ بننا چاہیے اور اپنے ہاتھوں سے تخلیق کرنے اور اس تخلیق سے محبت کر کے دیکھنا چاہیے۔ یہی زندگی کی کامیابی کا راز ہے بلکہ اصل زندگی یہی ہے اور تماشا بننے بلکہ اپنی ذات کو مکمل طور پر اپنے مقصد کے سپرد کرنے کے بعد ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ غرضیکہ خود شناسی کی دعوت بھی ہے اور انفرادی شخصیت کو نکھارنے کی صلاح بھی۔(۳۷)

شعری کتاب ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر موجود نظموں میں '' SLEEP WALKING''، ''ٹھوکر''، ''پنڈورا'' اور ''نبض'' شامل ہیں۔ '' SLEEP WALKING'' میں شاعر

کہتا ہے کہ انسان اکثر اپنی زندگی میں سوتے میں چلنے کے مترادف زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اصل مقصد سے انجان ہو کر گمراہی میں پڑا رہتا ہے کہ اچانک اس کی آنکھ کھلتی ہے کہ وہ تو کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے، اس پر شیطان کا غلبہ ہے۔ شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

معاً آنکھیں مری کھلتی ہیں
اور میں دیکھتا ہوں
ہر طرف گہرا اندھیرا ہے (۳۸)

(SLEEP WALKING)

نظم ''ٹھوکر'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کو ٹھوکر لگتی ہے تو اس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہ گہری نیند سے جاگتا ہے اور اپنے برے اعمال پر نادم ہو کر معافی مانگتا ہے۔ پھر حالات آہستہ آہستہ معمول پر آجاتے ہیں تو دوبارہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ ''پنڈورا'' میں شاعر کہتا ہے کہ اپنے آپ کو پہچانو، گناہوں کی زندگی چھوڑو اور توبہ کر لو۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ ابھی اس گناہوں سی اٹی زندگی میں نہ جانے کتنے سفر، کتنے منصوبے باقی ہیں لیکن اگر موت آگئی تو سارے کے سارے سفر، منصوبے خاک میں مل جائیں گے اور انسان اپنے منصوبوں اور ارادوں پر نادم ہوگا کہ کاش اپنی عاقبت بہتر بنالیتا، دنیاداری کی سوچوں سے آزاد ہو جاتا۔ ''نبض'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کا جسم ایک پوری کائنات ہے۔ انسان اگر اپنے بدن کا بغور جائزہ لے تو وہ کائنات کے بہت سے راز جان سکتا ہے لیکن انسان کی بدقسمتی ہے کہ اس نے کبھی اس کی طرف غور نہیں کیا۔ اس نے آج تک اپنے آپ کو ہی نہیں سمجھا۔ شاعر نے کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے:

مگر ہم اپنی شریانوں میں پھرتی
چاپ میں کھوئے ہوئے
اس کائناتی چاپ کو
سننے کے قابل ہی نہ ہوں (۳۹)

(نبض)

''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر لکھی گئی نظموں میں ''نظم''، ''رات کے پچھلے پہر''، ''کیوں دکھ اوڑھ کے'' اور ''گہراؤ'' شامل ہیں۔ ''نظم'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان جب تک خود کو نہ پہچان لے وہ ایک عجیب دھندلی سی کیفیت میں ہوتا ہے۔ اسے اپنے ہونے نہ ہونے اور اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جب انسان خود کو پہچان لیتا ہے تو وہ سب کچھ جان جاتا ہے اور جب تک وہ خود سے ناواقف ہوتا ہے تو

اسے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ ذوالفقار احسن نے اپنے ایک مضمون ''وزیر آغا کی نظم نگاری (چٹکی بھر روشنی) کے حوالے سے'' میں اس نظم کے بارے میں محترمہ پروین طاہر کی رائے کچھ یوں بیان کی ہے:

> نظم کی تیسری جہت موت ہے جو کہ زندگی اور تخلیق سے ہٹ کر ہے۔ اس ریفرنس میں دھند سے مراد وہ سرمئی دھندلکے ہیں جو مرنے سے کچھ دیر پہلے انسان کو اپنے اطراف میں محسوس ہوتے ہیں۔ وہ خاموشی ہے جو اعصابی تھکن کے آخری مراحل میں انسان کی روح میں سرایت کر جاتی ہے اور اسی خاموشی میں انسان موت کی سرگوشی سن پاتا ہے اور موت کسی پیکر کی صورت اپنی برفاب پوروں سے چھو کر انسان کو اپنے اٹل ہونے کا یقین دلاتی ہے۔ (۴۰)

نظم ''رات کے پچھلے پہر'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسانی خواہشات انسان کو بے ضمیر کر دیتی ہیں۔ رات کے آخری حصے میں جبکہ نیند آخری مرحلے میں ہوتی ہے تو انسان اپنی خواہشات کے خواب دیکھتا ہے۔ شروع سے انسانی خواہشات ایک سی رہی ہیں جو کہ آج کے انسان کی بھی ہیں۔ شاعر نے ان خواہشات کو غلیظ اور گھٹیا قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ انسان ان خواہشات کو ہر وقت سوچتا رہتا ہے، یوں رات خواب میں بھی اسے یہی کچھ دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ انسان کے ذہن میں چل رہا ہوتا ہے، اس کے خوابوں میں وہی کچھ اسے دکھائی دیتا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں انسانوں کو ایسی خواہشات سے خود کو بچانے کی تلقین کی ہے اور اپنی اصلاح کرنے کی طرف مائل کیا ہے تاکہ انسان کا نقصان نہ ہو۔ نفسانی و مادّی خواہشات انسان کی دشمن ہیں، یہ بظاہر خوش نما اور پیاری لگتی ہیں لیکن ان کے پیچھے لگ کے انسان بے ضمیر ہو جاتا ہے جس کا انسان کا ازلی نقصان اٹھانا پڑے گا جو کہ بہت بڑا اور ناقابل برداشت نقصان ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

صدیوں پرانی خواہشوں کے
ہر طرف بکھرے
مغلظ اشتہا انگیز ریزے
چنتے پھرتے ہیں (۴۱)

(رات کے پچھلے پہر)

ایک اور نظم ''کیوں دکھ اوڑھ کے'' میں شاعر کہتا ہے کہ خود کو پہچانو، اپنی اوقات کو جان جاؤ اور خود کو جان کر اپنی حیثیت کے مطابق کام کرو۔ ہر طرح کی قید سے خود کو آزاد کرو۔ جب خود کو آزاد کر لو گے تو

خوش ہو جاؤ گے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کے اندر کا دکھ، غم یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر کو سلائے رکھتا ہے۔ جب انسان کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے تو انسان خوش حال ہو جاتا ہے۔ ''گہراؤ'' میں شاعر کہتا ہے کہ اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ جب انسان خود کو پہچان جاتا ہے تو وہ اصل میں انسان بنتا ہے اور انسانیت اپنا کر فرشتوں سے بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ شاعر اندر کے انسان کو جگانے اور اس کو سمجھنے کی نصیحت کر رہے ہیں۔ ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''لفظوں سے مت تولو مجھ کو'' اور ''رڑک'' شامل ہیں۔ ''لفظوں سے مت تولو مجھ کو'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان جب خود کو پہچان لیتا ہے تو اس کے لیے کسی بھی قسم کا کوئی لفظ اس کے مترادف نہیں ہو سکتا۔ وہ اس اعلیٰ درجے پر پہنچ جاتا ہے جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ شاعر اپنے بارے میں کہتا ہے کہ میں بے حس اور بے آواز نہیں ہوں۔ میں نے سارے بوجھ اتار دیئے ہیں۔ میں آزاد بادل ہوں یا خوشبو کی ایک چٹکی کی طرح ہوں یا ریشم کی طرح نرم و ملائم ہوں۔ مجھ میں کوئی بھاری یا سخت پن نہیں رہا۔ ایک اور نظم ''رڑک'' میں شاعر کہتا ہے کہ میرے اردگرد سب کے سب مر چکے ہیں مراد سب کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی دل کی آنکھ نہیں کھل رہی۔ میرے دل کی وہ آنکھ کھل چکی تھی۔ میری طرح کا میرے ساتھ ایک اور بھی تھا جس نے مجھے اس جذبے سے سرشار کیا۔

شعری مجموعہ ''ہم آنکھیں ہیں'' کی نظم ''آخر تیرے دروازے تک'' میں وزیر آغا نے انسان کا دنیاوی الجھنوں میں پھنس کر اپنے حقیقی مقاصد سے دوری کا بیان ہے لیکن جب انسان الجھنوں سے نکلتا ہے تو وہ اپنے مقصد کو جان لیتا ہے، بالآخر وہ تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے کرتے اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی مجموعہ کی ایک اور نظم ''ایسی جلدی بھی کیا ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کا ضمیر اسے ہر برائی پہ ملامت کرتا ہے، انسان کو محسوس تو ہوتا ہے کہ اس کا دل اور اس کا ضمیر اس برے کام سے روک رہا ہے لیکن انسان ضمیر کی آواز کو سن کر بھی اَن سُنا کر دیتا ہے۔ ایک اور نظم ''چلو بات کرتے ہیں خود سے'' میں شاعر نے کہا ہے کہ انسان دنیاوی کاموں میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اس کے پاس ضمیر کی آواز سننے کا وقت نہیں ہے، وہ دنیا حاصل کرنے کے لیے شب و روز تگ و دو کرتا رہتا ہے یوں وہ بے ضمیر ہو کر زندگی بسر کرتا رہتا ہے۔

اُن کی کتاب ''کاسۂ شام'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''مجھے اب کچھ نہیں کرنا''، ''مکتی''، ''شجر سے شجر تک'' اور ''سرگوشی نے لب کھولے'' شامل ہیں۔ ''مجھے اب کچھ نہیں کرنا'' میں شاعر کہتا ہے کہ اپنے اندر کی آنکھ کھولو۔ شاعر حقیقی یا اندر کی آنکھ کے کھلنے کا خواہشمند ہے جو کہ انسان کو حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے دنیا کے کاموں سے کوئی سروکار نہیں رہا، جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ شاعر نہ قدرتی مناظر دیکھنے کا خواہاں ہے اور نہ ہی شہروں میں رہنا پسند کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے صرف اور صرف حقیقی آنکھ

کا مشاہدہ کرنا ہے مراد یہ ہے کہ شاعر اندر کے انسان کو جاننا چاہتا ہے۔ ''مکتی'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اگر اپنی اصلیت یعنی اپنا اصل چہرہ دیکھ لے تو ڈر جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سایہ اور تم الگ الگ نہیں ہو، ایک ہی ہو۔ ڈرنے کی بجائے اپنی اصلاح کرو اور اپنی اصلاح کرو اور اپنے سائے سے مل جاؤ تا کہ تمھیں سکون ملے۔ شاعر نے اصل چہرہ اور سایہ انسان کے ضمیر اور اصل انسانیت کو کہا ہے شاعر کہتا ہے کہ:

تم بھی کبھی جو
صبح سویرے جھیل کنارے جاؤ
اپنا سایہ دیکھ کے
اس سے ہرگز ڈر نہیں جانا (۴۲)
(مکتی)

نظم ''شجر سے شجر تک'' میں شاعر کہتا ہے کہ جب اندر کا انسان بیدار ہو جاتا ہے تو وہ اپنی اصلاح کرتا ہے اور یوں وہ راہ راست پر آجاتا ہے۔ اس کے اندر کے اندھیرے ختم ہو جاتے ہیں اور روشنی ہی روشنی ہو جاتی ہے۔ نظم ''سرگوشی نے لب کھولے'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان دنیا میں اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑ دوڑ کر بالآخر ایک دن فوت ہو جاتا ہے اور جب وہ وفات پا جاتا ہے تو اس کی اصل آنکھ کھلتی ہے۔ تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کا مجاور بنا رہا۔ وہ اپنے اصل مقصد سے بھٹکا رہا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس لیے زندگی میں ہی اپنے آپ کو اور اپنے جینے کے مقصد کو پہچان لو تا کہ ہمیشہ کی رسوائی سے بچ سکو۔

جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے، نیکی اور بدی کا جھگڑا تب سے جاری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں، کبھی نیکی بدی پر غالب آجاتی ہے تو کبھی بدی نیکی پر غالب آجاتی ہے۔ وزیر آغا کے نزدیک شروع سے اس دنیا میں بدی کا زور زیادہ رہا ہے اور اچھائی ہمیشہ سے کم رہی ہے۔ اسلام بھی نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے بلکہ دنیا کا ہر مذہب نیکی کے کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور برے کاموں سے باز رہنے پر زور دیتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ: ''نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور برائی و بے حیائی کے کاموں سے ایک دوسرے کو منع کرو۔'' (قرآن مجید) وزیر آغا نے بھی نیکی کو عام کرنے کی نصیحت کی ہے اور برائی کے خاتمے کے لیے تدابیر کرنے کا کہا ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بات بھی کرتے ہیں کہ برائی کا ہمیشہ بول بالا رہا ہے تو نیکی کیسے برائی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتی ہے۔ نہ جانے کیوں برائی اس دنیا میں ہمیشہ سے زیادہ رہی ہے؟

شعری مجموعہ ''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''گوری اور کالی'' اور ''جسم'' شامل ہیں۔ ''گوری اور کالی'' میں شاعر نے سحری کے وقت کی منظر کشی کی ہے اور کہا ہے کہ صبح

رات کا خاتمہ کر رہی ہے۔ دن رات کا دشمن ہے، دن سے مراد نیکی اور اچھائی جو رات یعنی برائی اور گمراہی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ شاعر کو مستقبل بہتر دکھائی دے رہا ہے کیونکہ برائی کا خاتمہ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ ''جسم'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان جسم اور روح کا مرکب ہے۔ انسان کے اچھے اعمال اس کی روح کو خوشبودار اور برے اعمال بدبودار بنا دیتے ہیں۔ اچھائی کے خواص اور برائی کے نقائص کی نشاندہی کی گئی ہے۔ شعری مجموعہ ''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''اگر ازل سے یہی چلن ہے''، ''سلومی''، ''اس کے دشمن'' اور ''آنکھ بھنور کی'' شامل ہیں۔ ''اگر ازل سے یہی چلن ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ ازل سے دنیا میں برائی کا زور زیادہ رہا ہے، یہ برائی آنے والی نسلوں کو بھی مریض بنائے رکھتی ہے اور یوں نسل در نسل برائی کا زور چلتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ اچھائی ہمیشہ سے کم رہی ہے، اگر ہر انسان اچھائی کو پسند کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ اچھا ہی ہو، ہر کوئی امن کا خواہاں ہے تو پھر دنیا میں امن کیوں نہیں ہو رہا؟ برائیوں کا راز کیا ہے؟ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

تو پھر یہ نمناک ساحلوں کے سفید مرمر پہ
کالے شبدوں کا رقص کرتا ہجوم کیا ہے؟
مہیب، کالے، حریص جنگل میں
چور قدموں کی چاپ کیا ہے؟
سقیم ورثے کا راز کیا ہے؟ (۴۳)
(اگر ازل سے یہی چلن ہے)

ان اشعار سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وزیر آغا نے اس نظم میں برائی کے ہمیشہ سے غلبہ کا ذکر کیا ہے لیکن ناصر عباس نیّر اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''نظم ''اگر ازل سے یہی چلن ہے'' (۱۹۷۷ء) میں جنگل کی علامت مزید گہری اور تہ دار ہو گئی ہے۔ اس نظم میں وزیر آغا جنگل کی علامت کی مدد سے انسان کے کربِ تخلیق کے راز کو سمجھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔'' (۴۴)

نظم ''سلومی'' میں شاعر کہتا ہے کہ نیک جسم میں روح خوش رہتی ہے جبکہ بد جسم میں روح تڑپتی رہتی ہے۔ نظم ''اس کے دشمن'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اپنی برائیوں کی وجہ سے پس رہا ہے۔ دنیا کے امن کو انسان نے خود تباہ کر رکھا ہے، کوئی بیرونی دشمن نہیں ہے۔ اسی طرح انسان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خود کو تباہ کرتا ہے۔ کوئی بیرونی دشمن اسے تباہ نہیں کرتا۔ اس کے اپنے اعمال ہی اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ''آنکھ بھنور کی'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسانی سوچ ہر وقت کام میں لگی رہتی ہے۔ انسانی ذہن میں ہر وقت کچھ نہ کچھ چلتا رہتا ہے، کبھی کبھی سوچ میں ہلچل مچ جاتی ہے اور ایک بھنور سا بن جاتا ہے، طوفان سا آ جاتا ہے۔ اگر سوچ بہک جائے

تو معاشرے میں برائیاں پھیل جاتی ہیں اور اگر سوچ راہ راست پر آ جائے تو معاشرے میں امن ہو جاتا ہے۔''عجب اک مسکراہٹ''میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام''کسی نے بتایا نہ تھا'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے اچھائی اور برائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ برائی کو ہمیشہ اچھائی سے ڈر رہتا ہے کہ وہ اسے بے اثر نہ کر دے۔شاعر کہتا ہے کہ برائی ہمیشہ اچھائی سے گھبراتی ہے۔

انسان جب کبھی دنیاوی پریشانیوں سے گھبرا کر بددل ہو جاتا ہے تو مایوسی اور نا امیدی اس کو زندگی کا خاتمہ کرنے پر اکساتی ہے لیکن پھر کہیں سے امید کی روشنی دکھائی دینے پر انسان دوبارہ جینا شروع کر دیتا ہے۔انسان کی اس فطرت کو وزیر آغا نے بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔وزیر آغا سے قبل کئی شعرا اور ادبا نے اس موضوع کو ادب کا حصہ بنایا جن میں سر سید احمد خاں کے اس موضوع پر مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے بعد جدید ادب میں بہت سے ادیبوں نے آس و یاس یعنی امید و نا امیدی کے موضوع کو مختلف انداز سے اردو ادب کا حصہ بنایا ہے۔اقبال کی شاعری میں بھی جا بجا امید کا پیغام اور نا امیدی کا رد ملتا ہے۔بانگ درا کی نظم''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ''اس کی بہترین مثال ہے۔اس کے علاوہ اقبال کا درج ذیل شعر بھی اس عنوان کی عکاسی کرتا ہے:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ضربِ کلیم سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

خودی میں ڈوب زمانے سے نا امید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے درپردہ اہتمامِ رفو (۴۵)
(محراب گل افغان کے افکار ۲)

وزیر آغا نے بھی اس موضوع کو اپنی شاعری میں ایک الگ اور انوکھے انداز سے بیان کیا ہے۔شعری مجموعہ''شام اور سائے''میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں''مسرت''،''عفریت''اور''طلسم'' شامل ہیں۔''مسرت''میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اپنے محبوب حقیقی کو ازل سے جانتا ہے اور اس کے جلوے کا منتظر ہے۔انسان اپنے محبوب حقیقی کو جانتا ہے،اسے محسوس کرتا ہے اور اس کے جلوے کے دیدار کا منتظر ہے۔انسان اپنے محبوب حقیقی سے ملاقات کے لیے پر امید ہے خاص طور پر اس انسان کی بات کی گئی ہے جو اپنے محبوب حقیقی کی جستجو اور تلاش میں سرگرداں ہو اور اپنے محبوب حقیقی سے ملاقات کا متمنی ہو۔''عفریت''میں شاعر کہتا ہے کہ ہر طرف خوف ہی خوف ہے۔زندگی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔تاریکی اور نا امیدی شاعر کو ڈرا رہی ہے۔اُن

کے خوف سے شاعر کچھ نہیں کر پا رہا۔شاعر نے دراصل اپنے معاشرے کے حالات کو بیان کیا ہے کہ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ان خطرات نے شاعر کو نا امید کر دیا ہے۔شاعر نا امیدی کو اپنی غلطی قرار دے رہا ہے۔شاعر کہتا ہے انسان کو حالات سے گھبرا کو نا امید نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کا جواں مردی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔''طلسم'' میں شاعر نے حالات کی خرابی کے باعث نا امیدی کا اظہار کیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے،کہیں روشنی دکھائی نہیں دے رہی۔شاعر امید کر رہا ہے کہ کہیں سے روشنی آجائے اور ہر طرف اجالا کر دے۔معاشرتی حالات کی خرابی کا بیان ہے اور حالات بہتر ہونے کی خواہش کی گئی ہے۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

دل کہتا ہے کاش کہیں سے چیختا پنچھی آئے
چاند کا کنگن،کالے بھیانک پربت پر گر جائے
کنگن سے کرچیں اڑ اڑ کر بکھریں،دور تک آئیں
جگمگ کرتے ننھے ننھے تارے بنتی جائیں (۴۶)

(طلسم)

''دیکھ دھنک پھیل گئی''میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''اسے آنا تو ہے اک دن''اور''اک زخمی منظر''شامل ہیں۔''اسے آنا تو ہے اک دن''میں شاعر کہتا ہے کہ مجھے خوشی کے آنے کی امید ہے۔شاعر کہتا ہے کہ خوشی کبھی نہ کبھی تو ضرور آئے گی۔جب اسے ایک نہ ایک دن آنا ہی ہے تو ابھی آجائے۔کسی بن بلائے مہمان کی طرح آجائے۔شاعر کو خوشی کے آنے کی امید ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جلد از جلد اس کی زندگی میں خوشی آجائے تا کہ اس کے دکھوں میں کچھ کمی واقع ہو سکے۔''اک زخمی منظر''میں شاعر پر امید رہنے کی تلقین کر رہا ہے۔نا امیدی کی باتیں کرنے سے منع کر رہا ہے۔نا امیدی کفر ہے اس لیے شاعر کہتا ہے کہ نا امیدی کی باتیں نہ کرو۔شاعر کہتا ہے کہ امید کی باتیں کرو،مثبت سوچو،ہر چیز خود بخود اچھی لگے گی۔دوسروں کو خطروں سے مت ڈراؤ،دوسروں کو نا امید نہ کرو۔''یہ آواز کیا ہے''میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام''لگتا ہے اب بارش ہو گی''ہے۔اس نظم میں شاعر کو بہتری کی امید ہے۔شاعر کہتا ہے کہ ایک عرصہ ہو گیا اچھائی کا دور گئے اور برائی کا دور عام ہوئے۔اب لگتا ہے کہ بارش ہو گی جو برائی کو دھو ڈالے گی اور اچھائی دوبارہ سے غالب آئے گی،دنیا امن کا گہوارہ بنے گی۔''ہم آنکھیں ہیں''میں نظم''اکیسویں صدی''میں شاعر بیسویں صدی کے اختتام پر شکر ادا کر رہا ہے کہ شکر ہے کہ مصائب بھری صدی ختم ہوئی۔نئی صدی کے آغاز پر بہتری کی امید وابستہ کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ خدشات بھی شاعر کے دل میں جنم لے رہے ہیں۔

وزیر آغا نے انسانی اخلاقیات کی بہتری کے لیے اپنی شاعری میں بہت سے اخلاقی موضوعات کو بیان کیا ہے، اسی کی ایک کڑی آپ کی شاعری کا موضوع ''جھوٹ اور سچ'' ہے۔ وزیر آغا نے سچ کو اپنانے اور جھوٹ سے اپنا دامن بچانے کی نصیحت کی ہے کیونکہ سچ ہمیشہ جھوٹ پر غالب آتا ہے۔ جھوٹ ہمیشہ ناکام اور نامراد ہوتا ہے۔ دنیا میں موجود تمام مذاہب سچ بولنے کی تلقین کرتے ہیں جبکہ جھوٹ سے نفرت کا اظہار تمام مذاہب میں ملتا ہے۔ حضورؐ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ''مومن ہر گناہ کر سکتا ہے لیکن کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' (حدیث نبویؐ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا سب سے اہم سکھایا ہوا سبق سچ بولنا اور جھوٹ سے نفرت کرنا ہے۔ وزیر آغا نے بھی اس موضوع کو بہت اچھے انداز سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''سکتہ'' اور ''اک تماشا بنا دیا تو نے'' شامل ہیں۔ ''سکتہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ جب انسان پر ایسی کیفیت طاری ہو جائے کہ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا ہو کہ کیا سچ ہے کیا جھوٹ؟ کیا حقیقت ہے کیا خواب تو اسے زمانے کی ابتدا سے انتہا تک کے تمام حالات و واقعات پر نظر دوڑانی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ ''اک تماشا بنا دیا تو نے'' میں شاعر کہتا ہے کہ جھوٹ اور باطل نے ہمیں فریب میں ڈالا ہوا ہے، سچ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ہماری آنکھوں پر جھوٹ کا پردہ پڑ چکا ہے لیکن سچ ہمیشہ چمکتا رہتا ہے۔ اگر ہم دل کی آنکھ کھول لیں تو سچ صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ شاعر نے سچ کے بارے میں کچھ یوں کہا ہے:

گہرے بادل کے چیتھڑے سے پرے
تو بدستور جگمگاتا ہے
اپنی کرنیں بکھیرتا ہے سدا
روشنی دان کرتا جاتا ہے (۴۷)
(اک تماشا بنا دیا تو نے)

بہادری کے موضوع کو وزیر آغا نے اپنی شاعری میں بار بار لایا ہے۔ اُن کے نزدیک بہادری انسان کی اہم صفت ہے، بہادر انسان مصیبتوں، تکلیفوں اور پریشانیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بہادر انسان ظلم کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے، وہ خاموش تماشائی بن کر ظلم برداشت نہیں کرتا اور نہ ہی اپنے اردگرد ظلم ہوتا دیکھتا رہتا ہے بلکہ وہ اس ظلم کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوتا ہے۔ وہ ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق بلند کرتا ہے۔ بہادری کے موضوع کو اکثر شعرا نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، وزیر آغا نے جب اپنی قوم کو بزدلی اپنائے ہوئے دیکھا تو قوم میں بہادری پیدا کرنے کے لیے اپنی شاعری میں اس موضوع کو بار بار

استعمال کیا۔قوم کوظالم حکمران کے سامنے ڈٹ جانے کی نصیحت کی ہے،اپنے اندر سے ظالموں کا ڈر ختم کرنے کی تلقین کی ہے۔اقبال بہادری کے بارے میں بال جبریل کی غزل نمبر ۳۴ میں کچھ یوں کہتے ہیں:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (۴۸)

بہادری کا درس دیتے ہوئے اقبال بال جبریل کی غزل نمبر ۴۰ میں مزید کہتے ہیں کہ:

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

مزید ایک شعر ''بال جبریل'' سے ملاحظہ ہو:

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس (۴۹)
(لہو)

وزیر آغا کی شعری کتاب ''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''قریب ودور''، ''بلاوا''، ''انسان'' اور نظم ''نوجوانی'' شامل ہیں۔''قریب ودور'' میں شاعر کہتا ہے کہ کسی چیز کا قریب یا دور نظر آنا انسانی سوچ پر منحصر ہے۔ہمت اور حوصلے سے دوری قربت میں بدل جاتی ہے۔کم حوصلگی سے قریب چیزیں بھی دور دکھائی دینے لگتی ہیں۔شاعر کا کہنا ہے کہ بہادری، ہمت اور حوصلہ سے ہو مشکل کام آسان جاتا ہے۔''بلاوا'' میں شاعر کہتا ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے راستے میں آنے والی تمام مشکلات کا مقابلہ جواں مردی اور ہمت سے کرنا پڑتا ہے۔رستے میں آنے والی رکاوٹیں ہمیشہ آگے بڑھنے سے روکتی ہیں لیکن منزل تک پہنچنے کے لیے ہر رکاوٹ کو پار کرنا پڑتا ہے۔منزل پر موجود چیز یا شخص ہمارا منتظر ہوتا ہے اس لیے ہمیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے پوری محنت، لگن اور بہادری دکھانا ہوتی ہے۔''انسان'' میں شاعر انسان کے بارے میں کہتا ہے کہ انسان صبح ہونے کا منتظر رہتا ہے، صبح ہوتے ہی کام میں لگ جاتا ہے، سارا دن محنت مزدوری کرتا ہے، اپنے رزق کے لیے کماتا ہے۔شاعر کہتا ہے جو انسان محنت، ہمت اور بہادری سے زندگی بسر کرتا ہے، اس کی زندگی بہتر گزرتی ہے۔بہادری انسان کی اہم خوبی ہے لیکن جو اس خوبی کو اپنائے۔''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''بھوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں'' اور ''انسان'' شامل ہیں۔''بھوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں'' میں شاعر نے مشکلات کا سامنا بہادری سے کرنے کا کہا ہے۔مشکلات سے گھبرانے کی بجائے ان کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے کو کہا گیا ہے۔محنت کرنے کا درس دیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ محنت اور بہادری سے ہر کام کیا جا سکتا

ہے۔نظم ''انسان'' میں شاعر نے انسان کے بارے میں بتایا ہے کہ انسان کتنی سخت جان ہے کہ سخت سے سخت موسم میں جب کہ دیگر تمام مخلوقات انتہائی پریشانی میں ہوتی ہیں، یہ اپنے کام میں مگن ہوتا ہے، اپنے روزگار ورزق کی تلاش میں نکلا ہوتا ہو۔انسان کی بہادری کو موضوع بنایا گیا ہے اور انسان کی قوت تسخیر کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔انسان کے اندر جوشعور اور جستجو کی خوبی ہے اس کے مطابق انسان ہر چیز پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کے دل میں چیزوں کو سمجھنے کی آگ ہے، انسان کی محنت ومشقت کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ زبان دانی میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور یہ ہر دم کام میں لگا رہتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ:

ڈوبے جو آفتاب تو
تیری رضا ہے یہ
پھوٹے سحر تو اس میں بھی
تیرا ہی ہات ہے
اوپر فلک ہے جس کی
نہایت نہیں کوئی
نیچے زمیں ہے جس پہ
فقط تیری ذات ہے (۵۰)

(انسان)

''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''خوف مت کھاؤ'' اور ''للک'' شامل ہیں۔''خوف مت کھاؤ'' میں شاعر کہتا ہے کہ خطروں، دکھوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے مت گھبراؤ، یہ سب انسان کو ڈراتے ہیں۔انسان کی زندگی میں تاریکی لانے کی کوشش میں لگے ہیں لیکن تم اشرف المخلوق ہو، ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، ان کا مقابلہ کرو۔بے شک یہ شیطانی قوتیں شکست پائیں گی، تم بس اپنے ایمان کی روشنی کو ختم نہ ہونے دو۔شاعر نے انسان کو بہادری سے زندگی گزارنے کی نصیحت کی ہے۔''للک'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے بہت جوش کے ساتھ کام کرتا ہے۔یہ جوش، ولولہ، ہمت، حوصلہ اور بہادری انسان کی اہم ترین خوبی ہے۔کاہل، سست اور نکما شخص زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ہمت، حوصلہ اور بہادری ہی انسان کو کامیاب بناتی ہے اور ایک بہتر زندگی گزارنے میں مدد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔

شعری مجموعہ ''گھاس میں تتلیاں'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''مجھے خزاں نے بہت ڈرایا'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کو زندگی میں کئی مشکلات اور مصائب پریشان کرتے ہیں۔انسانی

زندگی دکھوں کا مجموعہ ہے۔اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا انسان کی خوبی ہے اور ان کے سامنے ہتھیار ڈال دینے سے انسان ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے۔شاعر نے انسان کو بہادری سے جینے کی تلقین کی ہے اور بزدلی کو چھوڑنے کا کہا ہے۔''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''بڑے ڈرپوک ہوتا رو'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے انسان کو بہادری اور جواں مردی کا درس دیا ہے۔بزدلی کی تردید کی ہے،شاعر کہتا ہے کہ بزدل اور ڈرپوک شخص رات کو گھر سے نکلتا ہے،دن کو اسے ڈر ہوتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔اکثر لوگ خوف اور بے خوفی کے درمیان زندگی گزار دیتے ہیں،وہ نہ جینا چاہتے ہیں اور نہ ہی مر سکتے ہیں۔شاعر کہتا ہے کہ سورج کی طرح بہادر بنو،دن کو نکلو،خطروں کا دلیری سے مقابلہ کرو اور دلیری سے لڑتے لڑتے سورج کی طرح شام کو اپنی جان تک قربان کر دو۔شعری کتاب ''ہم آنکھیں ہیں'' کی نظم ''مجھے'' میں شاعر نے بہادر،طاقتور اور زمانہ ساز لوگوں کی تعریف کی ہے جبکہ ایسے طاقتوروں سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے جو مغرور ہوتے ہیں،جو اپنی طاقت کو منفی انداز سے استعمال کرتے ہیں۔

محبت جیسے اہم جذبہ کو وزیر آغا نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔انہوں نے بتایا ہے کہ محبت کرنے والے ہر مصیبت،دکھ اور پریشانی کا دلیری سے مقابلہ کرتے ہیں۔وہ محبت کے لیے کچھ بھی کر جانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔نسیم اللغات میں لفظ ''محبت'' سے مراد لگن اور یارانہ لیا گیا ہے۔(۵۱) اس عنوان پر وزیر آغا نے ہی نہیں بلکہ ہر دور کے تقریباً ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز سے کچھ نہ کچھ اشعار ضرور لکھے ہیں۔اسلام بھی محبت و رواداری کو عام کرنے کا درس دیتا ہے بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا دوسرا نام محبت ہے۔اسلام نے آ کر نفرتوں کا خاتمہ کیا اور ایک دوسرے کے دشمنوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ڈاکٹر فرحت ہاشمی اپنی کتاب میں ایک حدیث بیان کرتی ہیں کہ:''سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے،رسول اللہؐ نے فرمایا:مومن سراپا الفت ہے اور اُس میں کوئی خیر نہیں جو نہ محبت کرتا ہے اور نہ وہ محبت کیا جاتا ہے۔''(۵۲)

وزیر آغا نے بھی اس عنوان کو اپنی شاعری میں اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔''شام اور سائے'' کی نظم ''نوجوانی'' میں دو محبت کرنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ محبت کرنے والے آنے والے بھیانک وقت کے بارے میں نہیں سوچتے،وہ کسی بھی نفرت والی بات کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے۔بھیانک وقت کیونکہ نفرت کی وجہ سے آتا ہے اس لیے وہ ایسی بات سوچ ہی نہیں سکتے۔انہیں سارا جہاں محبت میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے،انہیں محبت کے سوا کائنات میں اور کوئی شے دکھائی ہی نہیں دیتی۔ناصر عباس نیّر نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

اس نظم میں دو پریمیوں کی رات کی تنہائی میں ملاقات کا ذکر ہے۔نظم

میں پیش کی گئی فضا سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریمی تنہا نہیں ہیں۔ان کے ہمراہ پوری کائنات ہے ،جو انہی کی طرح چپ اور دم بخود ہے۔سارے عالم میں طلسماتی خاموشی کا تسلط شاعر کو زندگی کے گہرے رازوں سے آگاہ ہونے کی تخلیقی کیفیت عطا کرتا ہے۔کائناتی اسرار کے انکشاف سے پہلے ہمیشہ دردناک خاموشی اور سکون کا وقفہ آیا کرتا ہے چنانچہ شاعر کے نزدیک دو پریمی زیست کے دو سربستہ راز ہیں جن میں انسانی زندگی اور احساسات کے تسلسل کے بیج پوشیدہ ہیں۔(۵۳)

''دیکھ دھنک پھیل گئی''میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام''بھیگی رت میں'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ پیار دکھاوے کا نام نہیں، پیار تو جان قربان کر دینے کا نام ہے۔ پیار چند لمحوں کے لیے ہونا پیار نہیں، پیار ہمیشگی پیار کا نام ہے۔''یہ آواز کیا ہے''میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں''تم جو آتے ہو''اور''پہاڑ کیسی عجیب چیز ہے''شامل ہیں۔''تم جو آتے ہو''میں شاعر محبت کے بارے میں کہتا ہے کہ محبوب جب آتا ہے تو عاشق کو کسی کی فکر نہیں رہتی۔محبوب اُس کا سب کچھ ہے،وہ ہر کسی کو بھول کو اپنے محبوب میں محو ہو جاتا ہے اور جب محبوب چلا جاتا ہے تو عاشق کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔محبوب کے بغیر عاشق کو ہر شے ستاتی ہے۔اس کی جدائی کا غم سہنے کی عاشق میں ہمت نہیں ہوتی۔جدائی میں عاشق کی حالت اچھی سے بری ہو جاتی ہے۔عاشق محبوب کی جدائی میں بے سکون و بے آرام رہتا ہے۔اسے دوبارہ محبوب کے لوٹ آنے کا انتظار رہتا ہے تاکہ وہ سارے عالم سے بے نیاز ہو کر اپنے محبوب کے ہمراہ خوش و خرم زندگی بسر کر سکے۔محبت وہ جذبہ ہے جو دو لوگوں کو خوشیاں عطا کرتا ہے۔شاعر نے محبت کو عام کرنے پر زور دیا ہے۔اس جذبے سے دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے،خوشحال ہو سکتی ہے۔

''عجب اک مسکراہٹ''میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام''آپ کا کوئی نام تو ہوگا'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن سے قطع تعلق کرنا ناممکن ہوتا ہے۔یقیناً شاعر نے ایسے رشتوں کا ذکر کیا ہے جن سے انسان بے حد محبت کرتا ہے یوں شاعر نے محبت کی طاقت و اہمیت کو بیان کیا ہے۔ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:''کچھ رشتے ہوتے ہیں جو ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹ سکتے۔ان کی جڑیں لاشعور کی گہرائیوں میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ ان کی بیخ کنی کبھی ممکن نہیں ہو سکتی۔''(۵۴)

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''کراں تا کراں'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ محبت و چاہت میں ہر چیز سے زیادہ مزہ ہے۔خدا یا دنیاوی محبوب دونوں میں سے کسی ایک کی طرف شاعر کا اشارہ ہوسکتا ہے۔زیادہ قریب اشارہ خدا کی طرف لگتا ہے۔جس نے محبت اور امن کو دنیا میں پھیلانے کا حکم دیا ہے اور اس امن اور محبت میں ہی اصل مزہ ہے۔وہ امن جو ہمارے نبی، خلفائے راشدین کے عہد میں تھا۔بھائیوں میں محبت والفت پائی جاتی تھی۔شاعر کہتا ہے کہ:

جو مزہ چاہت میں ہے
حاصل میں اس کا ڈھونڈنا بے کار ہے(۵۵)
(کراں تا کراں)

''ہم آنکھیں ہیں'' کی نظم ''فاصلے'' میں شاعر کہتا ہے کہ وقت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، نئی نسل اب پرانے لوگوں سے پوچھتی ہے کہ آپ کس دور کے ہیں۔اگر پرانے لوگ نئی نسل کو وعظ و نصیحت کریں تو ان کا اکثر یہی جواب ہوتا ہے کہ آپ کس دَور کی بات کر رہے ہیں۔شاعر نے اس نظم میں دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ایک یہ کہ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے اور دوسری یہ کہ نئے زمانے کے لوگ مشینی اور دنیا دار ہو گئے ہیں، انہیں اخلاقی اقدار سے کوئی سروکار نہیں رہا، پیسہ ہی سب کچھ بن کے رہ گیا ہے۔

''ماں'' ایک ایسا موضوع ہے کہ جسے تقریباً ہر ادیب نے کسی نہ کسی انداز سے ادب کا حصہ بنایا ہے، وزیر آغا نے بھی اپنی شاعری میں ماں کے موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔اکثر ماں کی وفات کے بعد انسان ماں کی اہمیت کو سمجھ پاتا ہے اور پھر وہ اپنے جذبات کو ادب میں منتقل کرتے ہیں، یہی کچھ وزیر آغا کے ساتھ بھی ہوا۔انہوں نے بھی اپنی ماں کی وفات کے بعد ماں کے بارے میں اپنے جذبات اور احساسات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ڈاکٹر فرحت ہاشمی نے اپنی کتاب میں ماں کی عظمت کے حوالے سے ایک حدیث کچھ یوں بیان کی ہے:''سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک صحابی رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میرے اچھے سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا تمھاری ماں ہے۔انہوں نے پھر پوچھا اس کے بعد کون؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: تمھاری ماں ہے۔انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: تمہاری ماں ہے۔انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: تمہارا باپ ہے۔''(۵۶) اقبال نے بھی ماں کے بارے میں ایک طویل نظم لکھی جو ایک انوکھا تجربہ تھا۔وہ اپنی شعری کتاب بانگ درا کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار

کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟ (۵۷)

وزیر آغا کی شعری کتاب ''دن کا زرد پہاڑ'' کی نظم ''بانجھ'' میں شاعر نے عورت کی ماں بننے کی خواہش اور تڑپ کو بیان کیا ہے۔ ایسی عورت کا ذکر ہے جو بانجھ پن کی وجہ سے ماں نہ بن سکی۔ اس دکھ کی وجہ سے اسے ہر شے بری لگتی ہے، اسے نہ ہی اپنا حسن اور نہ ہی کائنات کی کوئی حسین شے اپنی طرف متوجہ کر سکی۔ اس کی زندگی ماں نہ بننے کے دکھ کی وجہ سے اجیرن بن کر رہ گئی ہے۔ اسی مجموعہ کی ایک اور نظم ''ماں'' میں شاعر کہتا ہے کہ ماں اولاد کی حفاظت اور پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ ماں ہمیشہ اولاد کے آرام کے لیے خود بے آرام ہوتی ہے لیکن پھر بھی مسکراتی رہتی ہے کیونکہ اس کے لیے اس کی اولاد کی خوشی ہی اس کی خوشی ہوتی ہے۔ سعد اللہ کلیم اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اس نظم میں ماں کا تصور عام انسانی رشتے کے حوالے سے اُبھرتا ہے، جس میں ان تمام لذتوں کے گہرے شعور نے رنگ بھرا ہے جو اس شفیق اور محترم ہستی کے وجود سے کرنوں کی طرح پھوٹتی ہیں۔ اُن لذتوں کے ادراک میں لامسہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ اور باصرہ بالترتیب بروئے کار آئی ہیں اور بند کے آخر تک قاری ایک مکمل تصویر کو اپنے اندر یوں حل ہوتا محسوس کرتا ہے جیسے دودھ میں شکر حل ہو جائے۔ نظم کے دوسرے حصے میں اس مجبوری کا احساس نمایاں ہے جس کے تحت ہم ماں سے جدا کر دیئے جاتے ہیں اور اس جدائی کے نتیجے میں خارجی انتشار اور بکھراؤ کا منظر سامنے آتا ہے۔ (۵۸)

شاعر مزید کہتا ہے کہ ماں کے ہوتے ہوئے اولاد کو یہ احساس رہتا ہے کہ کوئی ہے جو اس کے لیے دعائیں کر رہا ہے، کوئی ہے جسے اس کی بہت فکر ہے، ماں اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنی والدہ کی وفات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم آغا اس نظم کے بارے میں کہتے ہیں:

> وزیر آغا کی نظم ''ماں'' اس لیے ہی اہم نہیں کہ شاعر نے واقعی ایک ایسی ہستی کے لیے یہ نظم لکھی جس نے ایک دن کوہ ندا کی آواز پر لبیک کہی اور تمام رشتے قطع کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہو گئی

بلکہ اس لحاظ سے بھی اس کا مطالعہ سودمند ثابت ہوسکتا ہے کہ شاعر
جب ماں کی موت کے عظیم تجربہ اور اس کے نتیجہ میں منفرد کرب سے
دوچار ہوتو کیا ہوتا ہے؟(۵۹)

''یہ آواز کیا ہے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''جرسی'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ ماں اپنی اولاد کی پرورش بہت محنت اور باریک بینی سے کرتی ہے جیسے جرسی بنتے وقت ایک کاریگر محنت اور باریک بینی سے کام لیتا ہے اور یوں بالآخر بچے کے جوان ہونے تک اس کی زندگی کے سارے پیچ وخم دور ہو جاتے ہیں۔وہ ایک مکمل شخصیت کا مالک بن جاتا ہے جیسا کہ ایک جرسی کا کاریگر جرسی کے سارے پیچ وخم دور کر کے اسے ہموار کر دیتا ہے۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

نازک مخروطی پوروں نے
اون کا اک منظر سا بنا ہے
کس ممتا سے
مجھ موّاج سمندر کو ہموار کیا ہے(۶۰)
(جرسی)

''گھاس میں تتلیاں'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''جزیرے'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے ماں کو سمندر سے تشبیہ دی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ سمندر اور ماں دونوں خوشیاں بکھیرتے ہیں۔ماں کی مامتا کی مثال سمندر کے پیار سے دی گئی ہے۔سمندر انسانوں کے لیے صاف ہوا اور پانی فراہم کرتا ہے۔بارشوں کا سبب بنتا ہے۔سمندر اور ماں دونوں ہی انسان کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔دراصل ماں کی ممتا کو بیان کرنا شاعر کا اصل مقصد ہے۔ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جزیرے'' سمندر کے بطن سے جنم لیتے ہیں اور زندگی بھر سمندر سے جدائی کے کرب انگیز احساس میں ڈوبے رہتے ہیں۔ماں ایسی شفیق ہستی سے بچھڑ کر بھی انسان اس کی شفقتوں کی تلاش کرتا رہتا ہے اور جاگتے سوتے میں خواب دیکھتا رہتا ہے۔''(۶۱)

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''مڈوائف'' اور ''ممتا'' ہیں۔ نظم ''مڈوائف'' میں شاعر نے عورت کے ماں بننے کی خواہش کا ذکر کیا ہے۔ایک ایسی عورت جو ماں نہیں بن سکتی،اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک بچہ اپناتی ہے،بچہ اصل ماں کے پاس جانے کے لیے روتا ہے۔وہ اسے کہتی ہے کہ میں تیری ماں ہوں۔دراصل شاعر نے عورت میں موجود ممتا کے جذبے کو اجاگر کیا ہے۔ نظم ''ممتا'' میں شاعر نے ماں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ماں رات کو بچے کے بالوں میں اپنی انگلیاں

پھیرتی ہے۔ جب ماں بچے کو یوں چھوتی ہے تو بچے کی زندگی میں روشنی ہو جاتی ہے، بچے کو بہت سکون ملتا ہے۔ پوری نظم میں ماں کی بدولت بچے کو ملنے والی خوشیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ناصر عباس نیر نے اپنی کتاب ''دن ڈھل چکا ہے'' میں وزیر آغا کی شاعری میں ماں کے موضوع کے بارے میں کچھ یوں تجزیہ کیا ہے:

> ماں کی حیثیت میں عورت کو موضوع بناتے ہوئے وزیر آغا نے عورت کی حقیقت کو پہچانا ہے۔ کائنات میں عورت کے مقام امتیاز کو مشخص کیا ہے۔ ماں سے جدائی وزیر آغا کے لیے ایک سانحہ تھا، جو ان کی ذات کے پاتال میں اتر گیا تھا۔ مگر وہ محض ماں کی عظیم جدائی پر اشک فشاں نہیں رہے۔ ماں جب بھی انہیں زندگی کے دکھوں کے صحرا میں یاد آئی ہے تو وہ عورت کے وجودِ حقیقت کی مختلف پرتیں اتارتے اور اپنی شعری کائنات میں انوکھے مناظر ابھارتے چلے گئے ہیں۔ مگر وزیر آغا نے اپنے تجربات کو شخصی سطح صرف اس حد تک دی ہے کہ تخلیقی عمل کو ارضی بنیاد حاصل رہے۔ وہ محض خلاء میں معلّق ہو کر نہ رہ جائے۔ نیز ان کے شاعرانہ تخلیقی عمل میں شخصی حوالہ گہرے خلوص کو داخل کرتا ہے۔ مگر وہ اوپر اٹھ کر امکانات کا سفر بھی کرتے ہیں۔ حقیقت کے مخفی اور نامعلوم گوشوں کی سیاحت بھی کرتے ہیں۔ (۶۲)

وزیر آغا نے انسانی ارتقاء کو ترتیب وار بیان کیا ہے اور بتایا اور سمجھایا ہے کہ کیسے انسان ترقی کرتا کرتا آج اس مقام پر پہنچا ہے۔ اُن کی شاعری میں یہ موضوع اُن کے وسیع مطالعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہر حال اُنہوں نے آج کے دور کو ترقی یافتہ قرار نہیں دیا بلکہ اسے انسانیت اور امن کا دشمن قرار دیا ہے اور دوبارہ فطرت سے ہم آہنگ ہو کر امن اور خوشحالی کو عام کرنے پر زور دیا ہے۔

''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''فاصلے ہی فاصلے'' اور ''سلوٹ'' شامل ہیں۔ ''فاصلے ہی فاصلے'' میں شاعر کہتا ہے کہ نہ جانے کیوں اس کائنات اور وقت کی تخلیق ہوئی اور ہمیں اس میں بھیجا گیا۔ انسان کے ارتقائی سفر کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ انسان ترقی کرتا کرتا پہلے سے کچھ بہتر حالت میں آ گیا ہے۔ رفتہ رفتہ انسان نے لکھنا پڑھنا سیکھا، اس نے چیزوں کے نام رکھے۔ پھر انسان دوبارہ بٹنا شروع ہوا، فرقہ واریت نے انسان کو تقسیم کر کے رکھ دیا اور انسان ایک دوسرے سے دور ہو گیا، اس میں فاصلے پیدا ہو گئے۔ ''سلوٹ'' میں شاعر کہتا ہے کہ وہ زمانہ یاد کرو جب دنیا میں علم و جستجو عام نہیں ہوئی تھی تب انسان اپنے آغاز

اورانجام سے ناواقف تھا۔ پھر وہ زمانہ آیا جب تعلیم وتحقیق کی بنیاد پڑی پھر انسان نے کائنات کے راز جاننے شروع کر لیے۔ شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

جب ابھری زماں کی پہلی سلوٹ
اور تو نے
مسکرا کر
اپنی آنکھیں میچ لیں (۶۳)
(سلوٹ)

شاعر کہتا ہے کہ وہ بھی کیا وقت ہوگا جب انسان نے پہلا راز جانا ہوگا، کیا مسرت کی گھڑی ہو گی۔ غرضیکہ انسان کے ارتقائی سفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ عابد خورشید نے اس نظم کے بارے میں کچھ یوں کہا ہے: ''زمان سے پہلے یہ کائنات ایک بے آباد بستر تھی جس پر جب (زماں کی) پہلی سلوٹ پڑی تو اس نے بستر کو شباہت بخش دی۔ زماں نے وجود میں آ کر مکاں کے تصور کو مکمل کر دیا۔'' (۶۴)

وزیر آغا کی شاعری کا ایک موضوع ''انسان کی حیثیت'' ہے۔ اُنہوں نے انسان کو اس کائنات کا ایک ذرّہ قرار دیا ہے لیکن اگر انسان خود کو پہچان لے تو یہ کائنات کا سب سے اہم اور قیمتی جزو بن جاتا ہے۔ اقبال نے بھی اپنی شاعری میں انسان کو خودی کی بیداری کی تلقین کی ہے اور یہی کہا ہے کہ اگر انسان خود کو پہچان جائے تو یہ کائنات کا اہم ترین حصّہ بن جاتا ہے۔ ''دن کا زرد پہاڑ'' کی نظم ''خدشہ'' میں شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے۔ دنیا کی طرح اس میں موجود تمام مخلوقات نے بھی فنا ہونا ہے، کچھ باقی نہیں بچنا۔ یوں شاعر نے انسان کو سمجھایا ہے کہ اس دنیا میں ہی کھو کر نہ رہ جاؤ، اپنی حقیقت کو پہچانو، تم نے بھی فنا ہو جانا ہے، ہمیشہ کے لیے یہاں نہیں رہنا۔ شاعر نے دنیا کی رنگینیاں بیان کر کے دنیا کے خاتمہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک نہ ایک دن اس دنیا نے ختم ہو جانا ہے اس لیے اس ختم ہو جانے والی دنیا کی فکر چھوڑو اور ہمیشہ کی زندگی کی فکر کرو۔ کمار پاشی اس نظم کا تجزیہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

شاعر اس حقیقت سے باخبر ہے کہ یہ دھرتی ایک معین عرصے تک زندہ ہے اور ایک دن ایسا بھی آئے گا جب لمحہ لمحہ اُون کے گولے ایسی لڑھکتی اور اُدھڑتی زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خلاؤں میں بکھر جائے گی اور نور کی پتیاں بھی مر جائیں گی جن کی زندگی زمین کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ دراصل زمین کی حیثیت تو اس آئینہ کی سی ہے جس میں اگر انسانی

نقوش عکس انداز نہ ہوں تو یہ بے جان ہے اور بے روح۔ یہ تو محض
انسانی وجود کا اعجاز ہے جس سے ان تیرہ خلاؤں میں معلق یہ زمین ہری
بھری، سرسبز و شاداب نظر آتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی وجود
کا مقدر بھی اسی زمین سے وابستہ ہے جس کی عمر پل پل کم ہو رہی ہے
اور جو رفتہ رفتہ حیاتِ انسانی کی طرح موت کے بیکراں سمندر کی طرف
لڑھک رہی ہے۔(۶۵)

''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''بجھی راکھ کا انگ'' اور ''سیل بلا'' شامل ہیں۔ ''بجھی راکھ کا انگ'' میں شاعر کہتا ہے کہ خدا ہمیشہ رہے گا جب کہ انسان کی زندگی کی مثال اس انگارے کی سی ہے جو ایک لمحے کے لیے جلتا ہے اور پھر بجھ کر راکھ ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی حیثیت سے شاعر نے ہمیں روشناس کرایا ہے، انسانی زندگی بہت کم اور عارضی ہے۔ ''سیل بلا'' میں شاعر کہتا ہے انسانی زندگی قرنوں پر مشتمل وقت کے مقابلے میں ایک لمحے کے برابر ہے جو آتا ہے اور فوراً گزر جاتا ہے۔ پھر انسان کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ شاعر نے انسانی زندگی کے مختصر ہونے کو موضوع بنایا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

جو سوچو
تو قرنوں کی اس رہگزر پر
یونہی ایک نٹ کھٹ سا لمحہ رکا(۶۶)

(سیل بلا)

''انسان کی مجبوری و لاچاری'' کا موضوع بھی وزیر آغا کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ اُنہوں نے انسان کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک حد تک خود مختار ہے اور اس کا ذہن بھی ایک حد تک سوچ سکتا ہے، اس پر وہ پریشان ہیں کہ انسان کائنات کے سارے اسرار و رموز کیوں نہیں جان سکتا؟ کیوں انسان کی سوچ پر ایک حد سے آگے پابندی لگا دی گئی ہے؟ اس طرح کے کئی سوالات اُنہوں نے اپنی شاعری میں اٹھائے ہیں اور انسان کو انہی وجوہات کی بنا پر مجبور و لاچار کہا ہے۔ اقبال نے بھی اس موضوع کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ وہ کچھ یوں کہتے ہیں کہ:

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جُو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا

وزیر آغا کی شعری کتاب ''دن کا زرد پہاڑ'' کی نظم ''کٹھور راہیں'' میں انسان کو بہت لاچار اور بے بس دکھایا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں آ کر عجیب شش و پنج اور کشمکش کے عالم میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے دنیا اور کائنات کے نظام کی کوئی سمجھ نہیں آتی۔ ہر میدان میں اتنی الجھنیں ہیں کہ انسان بے سمت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''ازل سے ابد تک'' اور ''ناموجود کے بھاری در پر'' شامل ہیں۔ ''ازل سے ابد تک'' میں شاعر موت اور زندگی کی قید اور سزا کے خلاف احتجاج کر رہا ہے اور اس میں خوش رہنے کی مجبوری کا اعتراف بھی کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان ازل سے ابد کی طرف کا مسافر ہے۔ انسان زندگی اور موت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ انسان کے ذمہ دنیا کو بہتر بنانا ہے اور اپنی زندگی کا سفر طے کرتے جانا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نہ اپنی مرضی سے آتے ہیں اور نہ اپنی مرضی سے جاتے ہیں، قدرت کے اس عجیب فیصلے اور پابندی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ شاعر نے کچھ یوں اظہار کیا ہے:

عجب فیصلہ ہے
عجب یہ سزا ہے
ازل اور ابد کی مسافت میں جھونکے کی
صورت اڑتا پھروں
اپنی صورت کو ترسا کروں
اور زندہ رہوں (٦٧)

(ازل سے ابد تک)

نظم ''ناموجود کے بھاری در پر'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کی سوچ محدود ہے۔ انسانی سوچ کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ اپنی سوچ کے مطابق انسان حد تک سوچتا ہے لیکن چونکہ اس کی سوچ محدود ہے۔ وہ اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتا۔ یہ انسانی عقل کی مجبوری و لاچاری ہے۔ ارمان نجمی نے کچھ یوں کہا ہے:

> نظم ''ناموجود کے بھاری در تک'' ایک آفاقی نظم ہے جس میں ایک انوکھا روحانی تجربہ بیان ہوا ہے، گویا وہ ناموجود کے بھاری در تک پہنچ جاتے ہیں اور دستک دینے لگتے ہیں۔ اب نارسائی اور رسائی کے درمیان صرف ایک بند دروازے کا فاصلہ حائل ہے حتیٰ کہ وہ اس تجربہ کے آخری مرحلہ سے گزرتے ہوئے سچائی کے آخری لمحے کے سامنے آ جاتے ہیں۔ (٦٨)

شاعر کہتا ہے کہ انسان سوچ کے ذریعے ناموجود کے بھاری در تک پہنچ جاتا ہے اور دستک دینے لگتا ہے۔ نارسائی اور رسائی کے درمیان ایک بند دروازہ ہے جسے وہ کھول نہیں سکتا، یہ انسان کی مجبوری ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد اس نظم کے بارے میں کچھ یوں کہتے ہیں:

> زیرِ تبصرہ نظم میں شاعر عقل وخرد کی روشنی میں تاریکی کے بے آواز سمندر کو چھوتا اور ''نامعلوم'' کی نقاب کشائی کرتے ہوئے اچانک ''ناموجود کے بھاری در'' سے جا ٹکراتا ہے۔ یہ بھاری در جو کہ بند ہے علامت ہے نارسائی کی، اس کے پار جانا (عقل وخرد) کی روشنی میں ممکن نہیں۔ اس کے پار حقائق ہیں، شاعر ان کا مبہم سا ادراک اپنے وجدان کی سطح پر کرتا ہے لیکن واضح رہے کہ شاعر نہ تو سالک ہے اور نہ ہی صوفی بلکہ وہ فنکار ہے صرف فنکار۔ اس کے پیشِ نظر تبلیغ کا مشن ہے اور نہ ہی تزکیہ نفس یا اصلاح معاشرہ کا آدرش۔ (۶۹)

''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''بلیک ہول'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انسانی مجبوری اور لاچاری کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کی سوچ بہت محدود ہے۔ وہ اس کائنات کے راز کیسے جان سکتا ہے جبکہ انسان اس کائنات کے ایک جزو دنیا کا ایک ذرّہ ہے۔ اسے کہاں ساری کائنات دکھائی دیتی ہے جو وہ اس کے راز جان لے، انسان تو بس ایک بلیک ہول میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''عنکبوت'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں بہت سی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے جن کی وجہ سے وہ اپنی زندگی آزادانہ طور پر نہیں گزار سکتا۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان بہت سی گرہوں میں قید اور جکڑا ہوا ہے۔

''پرانی یادیں'' وزیر آغا کی شاعری کا ایک اور اہم موضوع ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں کئی جگہ یہ بات بیان کی ہے کہ پرانی خوشگوار یادیں انسانی ذہن وقلب کو خوشی ومسرت عطا کرتی ہیں۔ یہ واقعی حقیقت ہے کہ اچھی یادیں انسانی صحت وذہن پر اچھے اور بُری یادیں انسانی صحت وذہن پر برے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اچھی اور خوشگوار یادیں انسان کی تنہائی کی بہترین ساتھی ہوتی ہیں۔ ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''کوزے بھرنے لگتے ہیں'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ پرانی یادیں، باتیں اور سپنے انسان کو الفاظ مہیا کرتے ہیں۔ انسان اپنے ماضی کے واقعات کو قلمبند کر کے الفاظ کے برتن بھر سکتا ہے۔ جب انسان ماضی کی باتیں، یادیں لکھتا ہے تو اس میں بہت مزیدار اور لطف دینے والے واقعات اس کے ذہن

میں آجاتے ہیں۔ یوں وہ ایک عمدہ تحریر لکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''مہکار'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ کوئی پرانی خوش گوار یاد انسان عجیب سرور دیتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ پرانی یاد کے ذریعے خود کو خوشی کا طریقہ آزما کر دیکھو، بہت لطف آئے گا۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

تو اک سوندگی گھنیری باس
تم کو تو تلے بچپن
کے جھولے میں جھلاتے
خوشنما منظر دکھائے گی (۷۰)

(مہکار)

''زندگی کے مختلف ادوار'' کو وزیر آغا نے اپنی شاعری میں موضوع بنایا ہے خاص طور پر اُن کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' میں انہوں نے اس موضوع کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اُنہوں نے زندگی کے ادوار کو جس طرح محسوس کیا ویسے ہی بیان کیا ہے۔ انہوں نے حقیقی انداز اپنایا ہے اور مصنوعی پن سے اپنے اس موضوع کو بچایا ہے۔ اس عنوان پر بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ شکسپیر نے بھی اس موضوع کو اپنی ایک نظم میں بہت عمدگی سے بیان کیا ہے، اس نے زندگی کے مختلف ادوار میں انسان کی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ ''آدھی صدی کے بعد'' جو کہ ایک طویل نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے بچپن سے بڑھاپے تک کا سفر بہترین منظر نگاری کے ذریعے بیان کیا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے کے دوران آنے والے ہر دَور کی حقیقی منظر کشی کی ہے۔ انسانی جذبات اور کیفیات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ جذبات نگاری باکمال ہے۔ زندگی میں انسان پر آنے والی مشکلات کا بیان کیا ہے۔ بچپن کی میٹھی اور پیاری یادوں کو شاندار انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ جوانی میں انسان کی طاقت اور ہمت کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ پتھر کو بھی پانی کر سکتا ہے اور آخر میں بڑھاپے میں انسان کی کمزوری کا ذکر کیا گیا ہے۔ بچپن کا ایک منظر کچھ یوں بیان کیا ہے:

روٹیوں پر جھپٹتے ہوئے
ہات
چھوٹے چھوٹے سے ہات (۷۱)

بچپن کے دور کی عمدہ منظر کشی کرنے کے بعد جوانی کے بارے میں کہتے ہیں:

مجھے کوئی آواز دیتا تھا کوئی
یہ کہتا تھا

تو

شہر کا دل ہے

سارا زمانہ تجھے دیکھتا ہے(۷۲)

جوانی کی زندگی کی کیفیات کو بیان کرنے کے بعد بڑھاپے کے بارے میں کہا ہے کہ:

اور میں

اپنی آرام کرسی میں لیٹا ہوا

آتے جاتے زمانوں کو تکتا تھا (۷۳)

وزیر آغا نے اپنی زندگی کی آدھی صدی کی کہانی اس نظم میں بیان کی ہے۔ناصر عباس نیّر اس نظم کے بارے میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''آدھی صدی کے بعد'' چار حصوں میں منقسم ہے۔شاعر نے آدھی صدی کو سالوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ نظم کے ابواب ترتیب دیتے وقت اس کے پیش نظر احساس، جذبہ اور عرفان کی منزلیں رہی ہیں۔نظم کے ابواب جھرنے، ندی، دریے اور سمندر ہیں۔ان چاروں میں مشترک شے پانی ہے۔پانی جب جھرنے کی صورت میں ہو تو بچپن کا استعارہ ہے۔ندی لڑکپن کا، دریا جوانی اور سمندر عمر کے اس مرحلے کا جب جذبات کا تلاطم اور خواہشات کے ہنگامے بڑی حد تک تھم جاتے اور آدمی اپنے ہونے کا عرفان پا لیتا ہے۔اس طرح وزیر آغا نے جھرنے، ندی، دریا اور سمندر کی علامتوں کی مدد سے عرفانِ ذات پانے کے عمل کو صورت پذیر کیا ہے۔(۷۴)

وزیر آغا کی یہ نظم زندگی کے تمام ادوار پر نظر ڈالتی ہے۔ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> آدھی صدی کے بعد داخلی سیاحت کی ایسی داستان ہے جو واپسی کا سفر کرتی ہوئی، زندگی کے مختلف ادوار کی جھلکیاں دکھاتی ہوئی ایک بصیرت رسا انجام تک پہنچتی ہے۔اندر کی سیاحت میں مناظر کو جس قالب میں ڈھالا گیا ہے اور انہیں جو لفظی پیکر عطا کیا گیا ہے وہ زمین اور آسمان کی وسعتوں تک پھیلی، نا دیدہ جہتوں کا سراغ دیتا

ہے۔(۷۵)

وزیر آغا نے زندگی کے بارے میں اپنے احساسات کو نظمیہ صورت دی ہے۔ رفیق سندیلوی اس نظم کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''آدھی صدی کے بعد'' ایک ایسی نظم ہے جو اپنی باطنی انگلیوں کی مدد سے ذات و کائنات کی گرہیں کھولتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ جس انجام پر منتج ہوتی ہے، وہ ہوا میں تیر چھوڑنے کے مترادف نہیں ہے۔ نظم کی آخری سطریں اس ساری کثرت کو جو منتشر و متواتر حالت میں نظم کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے، وحدت کے ایک تابناک نقطے پر لے آتی ہیں۔ اس نظم میں موضوع اور ہئیت آپس میں اس طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ انہیں کھرچ کر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔(۷۶)

''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان ایک ہوا کا جھونکا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں بچپن کی یادوں کو یاد کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ انسان جوانی میں خوشیوں سے لبریز زندگی گزارتا ہے اور پھر ادھیڑ پن میں عقل کے در کھلتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جب انسان زندگی کی حقیقت اور دنیا کے حالات سمجھ جاتا ہے تو دکھ سے ہر وقت اشکبار رہتا ہے۔ بڑھاپے میں کمزوری کے باعث انسان کی زندگی بے رنگ ہو جاتی ہے۔

وزیر آغا کی شاعری کا ایک اور اہم موضوع بڑھاپا بھی ہے۔ جواھر اللغات میں لفظ ''بڑھاپا'' سے مراد بوڑھاپن، ضعیفی، پچھلی عمر وغیرہ لیا گیا ہے۔(۷۷) اُن کی اکثر شاعری کی کتابوں میں اس عنوان پر نظمیں موجود ہیں۔ اُنہوں نے کچھ نظموں میں انسانی زندگی کے تمام ادوار میں انسان کی کیفیات، جذبات اور نفسیات کو بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے صرف بڑھاپے پر کئی ایک نظمیں تحریر کی ہیں خاص طور پر ان کتابوں میں جو آپ نے اپنے بڑھاپے میں لکھیں اور شائع کروائیں۔ ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''کتنی مشکل سے'' اور ''آخر آخر میں'' شامل ہیں۔ ''کتنی مشکل سے'' میں شاعر کہتا ہے کہ میری زندگی میں کمزوری اور ناداری آ گئی ہے جس نے مجھے سست اور کاہل بھی کر دیا ہے۔ اس کی وجہ شاعر نے اپنی ضعیف العمری کو قرار دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بڑھاپا انسان کو کمزور تو کرتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ سست اور کاہل بھی بنا دیتا ہے۔ ''آخر آخر میں'' میں شاعر کہتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام یعنی بڑھاپے میں انسان ایک پرانی کشتی کی

طرح ہو جاتا ہے جو کسی بھی وقت ڈوب سکتی ہے۔ کھا پی لیا جو بھی روکھا سوکھا ملا اور بس زندگی کے دن پورے کر رہا ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی زندگی ایک بے نام سی زندگی ہوتی ہے۔ انسان نحیف ونزار ہونے کی وجہ سے اپنے تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''پیڑ کتنا بے کل ہے'' ہے۔ اس نظم میں پیڑ شاعر نے بوڑھے شخص کی علامت کے طور پر لیا ہے جو چلنے کی طاقت کھو بیٹھتا ہے، جو بس اپنے نواسوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی جوان اولاد کو بار بار کہہ کر بلاتا ہے۔ اُن کی باتیں سنتا ہے۔ اپنا دکھ کہاں سُنا پاتا ہے۔ جوان اولاد ایسے بوڑھے والدین کے دُکھ اور بے قراری کو کہاں سمجھ پاتی ہے۔ شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

اس کی بات سنتا ہے
اپنی کب سناتا ہے
کیا پتا پرندے کو
پیڑ کتنا بے کل ہے
کتنے دکھ اٹھاتا ہے (۷۸)

(پیڑ کتنا بے کل ہے)

''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''رکے کھڑے ہیں''، ''پھٹے خیمے کے اندر'' اور ''آخری کوشش'' شامل ہیں۔ ''رکے کھڑے ہیں'' میں شاعر کہتا ہے کہ بڑھاپے تک پہنچتے پہنچتے انسان کی حقیقی آنکھ بیدار ہو جاتی ہے، اسے دنیا اور زندگی کی حقیقت معلوم پڑتی ہے، انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ آتا ہے۔ پہلے کی ساری زندگی حرارت ہونے کے باعث تیزی سے گزر جاتی ہے۔ یہ عمر ٹھہری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ''پھٹے خیمے کے اندر'' میں شاعر کہتا ہے کہ میں اب کسی کے کام نہیں آ سکتا۔ میں اب کسی کو علم بھی سکھا نہیں سکتا کیونکہ بڑھاپے کی وجہ سے میں کمزور اور کاہل ہو چکا ہوں۔ میری زندگی کا خاتمہ ہونے کو ہے، چند ہی ایام باقی بچے ہیں نہ جانے کب موت کا فرشتہ آ جائے۔ اس لیے میں کسی کو علم نہیں سکھا سکتا، مکمل علم کے حصول کے لیے تو ایک مدت چاہیے جو اَب میرے پاس نہیں ہے۔ ''آخری کوشش'' میں شاعر کہتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان انتہائی کمزور ہو جاتا ہے، اُس کے اعصاب کام کرنا چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر طرف اُسے موت دکھائی دینے لگتی ہے، کمزوری کے باعث انسان نڈھال رہتا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بہت کم رہ جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس حالت میں آخری کوشش کر رہا ہوں کہ کچھ حرارت شاید کہیں باقی ہو تو میں اس کے ذریعے کوئی توانائی والا کام کر سکوں۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

لرزتے کانپتے ہاتھوں سے کوئی
راکھ کھودے
شرارہ، کیا عجب کوئی بچا ہو
کوئی بچہ ابھی تک جی رہا ہو
گھنے، بھاری، سیہ ملبے کے نیچے (۷۹)
(آخری کوشش)

''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''مجھے ہی نصب ہونا ہے''، ''۱۸ مئی ۱۹۹۶'' اور ''کتنا اچھا لگتا ہے'' شامل ہیں۔ ''مجھے ہی نصب ہونا ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ زندگی فانی ہے، ایک نہ ایک دن اس کا خاتمہ ہو جانا ہے۔ یہ بہت مختصر عرصے پر محیط ہے، اسے اچھے طریقے سے گزارو۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے بھی ایک نہ ایک دن موت آجانی ہے لیکن میں ایسا کام کر جانا چاہتا ہوں کہ فنا ہو کر بھی زندہ رہوں۔ دراصل یہ نظم وزیر آغا نے بڑھاپے کی عمر میں لکھی ہے، انہیں اپنی زندگی ختم ہوتی نظر آرہی تھی اس لیے انہوں نے نصیحت کی ہے کہ اس مختصر سی زندگی کی قدر کرو، اس میں کچھ ایسا کام کر جاؤ کہ فنا ہو کر بھی باقی رہو۔ نظم ''۱۸ مئی ۱۹۹۶'' میں شاعر اپنی زندگی کی ۷۴ ویں سالگرہ پر کچھ پریشان اور کچھ خوش دکھائی دے رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج میرا نیا جنم ہوا ہے، ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے، مجھے جینا اچھا لگنے لگا ہے لیکن میرے اندر کے بزدل انسان نے جینے پر موت کو ترجیح دی ہے۔ شاعر کہتا ہے دوسری بار زندگی کو اپنا کر کتنا پریشان کن، کتنا غیر واضح اور کتنا بے معنی سا لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ گزری ہوئی زندگی اور آنے والی زندگی کے درمیان یہ دن کتنا پیارا لگ رہا ہے۔ یہ جاتا ہوا پیارا دن میں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا ہے۔ شاعر بڑھاپے کے ایام میں انسانی کیفیات کو بیان کر رہا ہے۔ نظم ''کتنا اچھا لگتا ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان کو کوئی خواہش نہیں رہتی۔ بڑھاپے میں انسان کے اعصاب کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے شاعر نے کہا ہے کہ اب ہم اندر سے خالی ہو گئے ہیں یعنی بڑھاپے کی وجہ سے انسان اندر سے خالی ہو جاتا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

اور اب یوں لگتا ہے جیسے
خواہش تو بس اک رنگین حباب تھی
جس میں
ہوا بھری تھی (۸۰)
(کتنا اچھا لگتا ہے)

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں نظم ''تھکن'' شامل ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان جب بڑھاپے تک پہنچتا ہے تو تھک چکا ہوتا ہے۔زندگی کے سفر میں انسان تیز چلتا چلتا بلکہ بھاگتا بھاگتا بڑھاپے تک پہنچتا پہنچتا تھک ہار جاتا ہے۔تھکن کو شاعر نے جھریوں بھرے چہرے والی بڑھیا قرار دیا ہے جو عمر کے طویل اور تکلیف دہ سفر سے تھک چکی ہے لیکن پھر بھی انسان کو زندگی سے پیار ہے۔انسان بوڑھا ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ عرصہ جینا چاہتا ہے۔اسے زندگی پھر بھی پیاری لگتی ہے۔صفدر رضا صفی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس نظم میں نہایت فنکارانہ انداز سے ''تھکن'' کو جو ایک کیفیت کا نام ہے، ایک ایسی جھریوں بھرے چہرے والی بڑھیا کی شخصیت میں مجسم کیا گیا ہے جو عمر کے طویل اور تکلیف دہ سفر سے تھک چکی ہے۔اس کے قوی اب اس کا ساتھ دینے سے ہچکچاتے ہیں، لیکن اس تھکاوٹ کے باوجود زندگی سے گہری محبت اور وابستگی کو وجہ سے اس کے عزم سفر میں کوئی کمی نہیں آئی اور نہ اس کی مسلسل مسافرت میں کوئی دراڑ ہی نمودار ہوئی ہے۔(۸۱)

''یہ آواز کیا ہے'' میں موجود نظم ''بوڑھے لوگ'' میں شاعر کہتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان اکیلا ہو جاتا ہے، کوئی اس سے بات نہیں کرتا کیونکہ کسی کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ہر کوئی اپنے کام دھندے میں مصروف ہوتا ہے۔بوڑھے لوگ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔''کاسہء شام'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''ایک پرانا قلعہ''، ''تخفیف'' اور ''خزاں تو کہاں ہے'' شامل ہیں۔''ایک پرانا قلعہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ میں ایک پرانا قلعہ ہوں، شاعر نے بڑھاپے کی وجہ سے خود کو ایک پرانے قلعے سے تشبیہ دی ہے۔اس کا حال اس شکستہ قلعہ کا سا ہو چکا ہے جو اس کی ایک نواسی دیکھنے گئی تھی۔وزیر آغا کی یہ نظم بہترین نظم قرار دی جا سکتی ہے۔شاعر نے اپنی نواسی کو کچھ یوں کہا ہے:

میں کہتا ہوں اب چپ کرو
تم پرانے زمانے کے اس فورٹ کو
دیکھنے کے بجائے
مجھے آ کے دیکھو(۸۲)

(ایک پرانا قلعہ)

نظم ''تخفیف'' میں شاعر نے خود کو نا آشنا صورت قرار دیا ہے، زندگی کے خاتمے کی طرف اشارہ ہے ۔بڑھاپے میں انسان کی جو کیفیات ہوتی ہیں ،ان کا بیان ہے مثلاً چہرے پر جھریاں، کمزوری، لاچاری اور تنہائی۔ ''خزاں تو کہاں ہے'' میں بڑھاپے کی وجہ سے زندگی کی رعنائیاں ختم ہونے کا ذکر ہے اور بڑھاپے کی وجہ سے جسمانی کمزوری کو بیان کیا گیا ہے۔ بڑھاپا انسان سے اس کی ہر خوشی، ہر رونق کو چرا لے جاتا ہے۔ ستیہ پال آنند اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> نظم ''خزاں تو کہاں ہے'' بظاہر تو خزاں کے موسم سرما میں بدل جانے کا نوحہ ہے لیکن بین السطور زوالِ عمر کے احساس سے کہیں آگے جا کر جسم اور روح کے اشتراک کو درختوں اور ان کے پتوں کے استعارے کے حوالے سے دیکھنے کی سعی ہے۔ بہار کے خزاں میں بدلنے کا نوحہ تو اردو کی غزلیہ شاعری کا پسندیدہ شغل ہے لیکن ادھیڑ عمر سے آگے عمر کا وہ پڑاؤ جسے مہا کوی تلسی داس نے ''گہن بڑھاپا'' کہا ہے اور کبیر نے ''اگن شریر کی مند بھیو بوڑھو بھیو کبیر'' کہہ کر ویا کھیا کی ہے، بہت کم شاعروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔(۸۳)

موت بھی وزیر آغا کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ فرہنگ تلفظ میں لفظ ''موت'' سے مراد مرنا، مرگ، وفات، تباہی، خرابی، شامت، نیستی، نابودی، مرنے کا واقعہ وغیرہ لیا گیا ہے۔(۸۴) وزیر آغا نے موت کو یاد کرنے کی نصیحت کی ہے۔ اس سے انسان گمراہ نہیں ہو پاتا۔ اسے اپنا حقیقی مقصد ہر پل یاد رہتا ہے اور وہ اسی مقصد کے تحت اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر انسان موت کو یاد نہ کرے تو اس کی زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے اور وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ حضورؐ کی احادیث میں بھی موت کو کثرت سے یاد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''دائرہ'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے بادل سے پانی برسنے سے لے کر دوبارہ اس پانی کے بخارات بن کر بادل بننے تک کے چکر کو بیان کیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ بادل پہاڑوں پر برستے ہیں اور صحراؤں پر نہیں برستے۔ پھولوں پر گرے بارش کے قطروں کو پھولوں کے لیے امانت قرار دیا ہے کہ جب روشنی ان پر پڑتی ہے تو یہ بخارات بن کر اڑتے ہیں اور دوبارہ جہاں سے جدا ہوئے تھے وہیں اپنی اصل تک پہنچ جاتے ہیں مراد یہ ہے کہ انسان نے بالآخر اپنے اصل کی طرف لوٹ کر جانا ہے جہاں سے وہ آیا تھا۔

''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''اشومیدھ یگیہ'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے

کہ انسان زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، دکھ بھی سہتا ہے۔ اپنی طاقت کے بل پر دنیا کو زیر بھی کرتا ہے پھر ایک دن موت اسے آدبوچتی ہے اور اس کا کام تمام کر دیتی ہے۔ وزیر آغا نے واقعہ کربلا کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ امام حسین باطل قوت کو مسمار کرنے نکلے لیکن کربلا کے واقعے میں باطل نے تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ اور آپ کے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خوشیاں منائیں لیکن وہ بھی کتنے دن خوش رہے ہوں گے، کتنی زندگی اور گزار لی ہوگی بالآخر انہیں بھی موت کا مزہ چکھنا ہی پڑا۔ شاعر نے اس بات کی نصیحت کی ہے کہ موت تو آ ہی جانی ہے اس لیے اس زندگی کو حق پر قربان کر دو۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اشومیدھ یگیہ'' میں مرکزی پیکر گھوڑا ہے اور اس کی صفات گوری چٹی یال اور دودھ ایسی پوشاک میں ایسے قرینے موجود ہیں جن سے خیال کا دھارا حضرت امام حسین کے ذوالجناح کی طرف مڑ جاتا ہے ساتھ ہی ساتھ خاک کو مٹھی میں بھر کر منہ پر ملنے اور صدیوں کے دکھ جھیلنے میں بھی اشارہ ایثار کی اسی روایت کی طرف ہے۔ قدیم ہندوستانی اساطیر کے مطابق گھوڑا اشومیدھ یگیہ پر کھولا جاتا تھا اس کا مطلب اپنی طاقت کا مظاہرہ تھا اگر کوئی اس گھوڑے کو روک لیتا تو گویا وہ اس طاقت کو پیکار کی دعوت دیتا گویا گھوڑا حق و نصرت کا نشان تھا اور اس کو للکارنے والے باطل و شر کے پیروکار تھے۔ چونکہ سچائی کی خاطر موت زندگی کا سب سے بڑا داؤں ہے۔ اس لیے تیر کھانے اور خون پھوٹنے کے بعد جو قوت پیدا ہوتی ہے وہی کارزارِ حیات میں انسانیت کی سب سے بڑی قوت ہے اور اسی قوت کے طفیل موت کے آگے سر جھکانے سے انکار کی جرات پیدا ہوتی ہے۔ (۸۵)

وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''کاغذ'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ موت کے بعد انسان دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ شاعر نے اس عالم اور موت کے بعد کے عالم کو ایک ہی کاغذ کے دو رخ قرار دیا ہے۔ بس درمیان میں ایک رکاوٹ موت کو قرار دیا ہے کی جس کے آتے ہی ان دونوں کے فاصلے ختم ہو جاتے ہیں اور انسان اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''ہئیت''، ''دھوکا''، ''لاشے''، ''آخری بات'' اور ''خاک'' شامل ہیں۔

نظم ''ہئیت'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان مصائب میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وقت اسے موت کی طرف لے جا رہا ہے، موت کے آنے کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا آنا کیسا ہوگا۔ نزع کے عالم کی منظر کشی کی گئی ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

بدن میں گاڑ دے گی دانت اپنے
تو بستی دودھیا دھاگوں میں لپٹی
معا اک چیخ بن کر جی اٹھے گی
یہ اس کی آخری آواز ہوگی (۸۶)

(ہئیت)

نظم ''دھوکا'' میں شاعر نے زندگی کو دھوکا کہا ہے، اسلام نے بھی اس دنیا کی زندگی کو دھوکا قرار دیا ہے۔ دنیا کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کو بھی دھوکا کہا ہے جس کے دھوکے میں انسانی عقل پر گرد پڑ گئی ہے اور وہ اس دھوکے کا شکار ہو کر گمراہ ہو رہا ہے اور گمراہی انسان کو موت بھلا دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہر حد سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک نہ ایک دن موت اسے آدبوچتی ہے اور اس کی غفلت اس کے لیے ابدی زندگی میں نقصان کا باعث بنتی ہے۔ ''لاشے'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسانی فطرت ہے کہ وہ جانتا ہے کہ موت ایک نہ ایک دن آنی ہے لیکن وہ اس کی تیاری نہیں کرتا، بھولا رہتا ہے۔ شاعر ہر انسان سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ اس کی موت قریب ہے، اسے اس کے آنے کی ہرگز خبر نہ ہوگی، اس لیے چاہیے کہ موت کی تیاری کر لے۔ ''آخری بات'' میں شاعر کہتا ہے کہ نزع کے عالم میں انسان کی تمام قوتیں جواب دے جاتی ہیں، بس ہونٹ لرزتے ہیں جن پر آئی ہوئی بات سمجھ نہیں آتی، شاعر نے موت کی سختیوں کا ذکر اس نظم میں کیا ہے۔ ''خاک'' میں شاعر نے نیک شخص کی موت کا ذکر کیا ہے کہ جب نیک انسان کو قبر میں دفنایا جاتا ہے تو قبر اس سے پوچھتی ہے کہ تم کون ہو؟ جب وہ اپنا تعارف کراتا ہے تو قبر اسے خوش آمدید کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بہت عرصے بعد کوئی نیک روح آئی ہے۔ ''گھاس میں تتلیاں'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''کون اس کو روک سکتا ہے''، ''درانتی رقص کرتی ہے''، ''صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے'' اور ''مچھ ریکھا'' شامل ہیں۔ ''کون اس کو روک سکتا ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ موت کے جھونکے کا انتظار ہے کہ وہ آئے اور پیار سے چھو کے سہلائے مراد کہ موت آرام سے آئے۔ روح موت کے جھونکے کو کہے گی آ جا اور مجھے اس جسم سے آزاد کر دے۔ شاعر کہتا ہے کہ موت سے ڈرنے کا کیا فائدہ، اس نے جب آنا ہوگا تو اسے کوئی روک نہ پائے گا۔ شاعر نے نزع کے عالم کو بہت تکلیف دہ قرار دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ موت ایک صحرائی بدو ہے جو سرخ آنکھوں اور تیز لانبی برچھیوں سے لیس گھوڑے پر سوار آتا

ہے مراد موت کا جھونکا ہے جو بہت کٹھن اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ''درانتی رقص کرتی ہے'' میں شاعر درانتی سے مراد موت لے رہا ہے، شاعر کہتا ہے کہ اگر درانتی کو موت کہا جائے تو موت فائدے کی چیز ہے کیونکہ اگر موت نہ ہوگی تو نئی نسل کے لیے مسائل پیدا ہو جائیں گے جیسے اگر ایک فصل کی کٹائی نہ ہو تو دوسری فصل کیسے بوئی جا سکے گی۔ درانتی زمین سے ایک فصل کا خاتمہ کر کے دوسری نئی فصل کے لیے جگہ بناتی ہے۔ اسی طرح موت ایک انسانی نسل کا خاتمہ کر کے دوسری انسانی نسل جگہ اور سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ نظم ''صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ جو شخص اس دنیا سے چلا جاتا ہے، وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ شاعر نے چھوٹے بھائی کی موت پر یہ نظم لکھی ہے۔ ارمان نجمی لکھتے ہیں کہ: ''صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے'' میں چھوٹے بھائی کی موت کے ذاتی صدمہ کی داخلی واردات کا اظہار اس طرح ہوا ہے کہ صدا کے پس پردہ نوحہ گری دل کو چھو لیتی ہے۔ موت کی نقش گری بہت معنی خیز طریقہ سے کی گئی ہے۔'' (۸۷) نظم ''مجھ ریکھا'' میں شاعر نے ایک رشتہ دار کے اکلوتے بیٹے کی اچانک موت کو بیان کیا ہے۔ بچے کے جانے کے بعد والدین کی زندگی میں جو بڑا خلاء پیدا ہوا اور جو ہمیشہ کا دکھ پیدا ہوا، شاعر نے اس دکھ کو اس نظم میں بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے بہت منصوبے بناتا ہے، اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کئی سپنے دیکھتا ہے کہ اچانک موت آ جاتی ہے اور سب وہیں دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

مٹھی کھولو
دیکھو ہاتھ کی ریکھاؤں میں
کس نے دم توڑا ہے
کس نے رستہ روک لیا ہے؟
کس کا رستہ کون سی ریکھا کاٹ گئی ہے؟ (۸۸)
(مجھ ریکھا)

''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''خاک کا رزق تھا وہ'' اور ''موت'' شامل ہیں۔ ''خاک کا رزق تھا وہ'' میں شاعر نے انسان کے مرنے اور خاک میں مل کر خاک ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔ ''موت'' میں شاعر کہتا ہے کہ موت ایک ایسا دکھ ہے جس کی کوئی شکل صورت نہیں، کوئی نام نہیں ہے مراد کہ انسان کو بالکل نہیں معلوم کہ اس کی موت کب واقع ہونی ہے، اس لیے اسے چاہیے کہ ہر دم اس کی تیاری کر رکھے۔ شعری مجموعہ ''ہم آنکھیں ہیں'' میں موجود نظم ''حرف کی آنکھیں کھل جائیں گی'' میں شاعر کہتا ہے کہ موت جدائی کا باعث بنتی ہے۔ جب تک زندہ ہیں ایک دوسرے کا ساتھ ہے، موت آتے ہی جدائی کا بے

انت سفر شروع ہو جاتا ہے۔

وزیر آغا نے اہلیہ کی وفات کے صدمے کو بہت محسوس کیا۔ اہلیہ کی وفات کے بعد اُن کی زندگی میں ادھورا پن چھا گیا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگے، انہیں ہر خوبصورت شے بھی بدصورت اور بے ڈھنگی لگنے لگی۔ بڑھاپے میں زندگی کے ساتھی کے بچھڑ جانے سے ہر انسان کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے، وزیر آغا نے بھی اسے محسوس کیا اور اپنی شاعری میں اس کا بار بار اظہار کیا۔ اس موضوع پر وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں موجود نظموں میں ''ادھوری کہانی'' اور ''یاد'' شامل ہیں۔ ''ادھوری کہانی'' میں شاعر نے اپنے ادھورے پن کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس ادھورے پن کی وجہ اہلیہ کی وفات ہے جس نے الگ ہو کر شاعر کو ادھورا کر دیا ہے۔ شاعر نے اپنی اہلیہ سے اپنی محبت کی شدت کو بیان کیا ہے اور اس کی جدائی میں اپنے اندرونی کرب کو بیان کیا ہے۔ ''یاد'' میں شاعر کہتا ہے کہ اہلیہ کی وفات کے بعد جب بھی مجھے اس کی یاد آتی ہے تو آنسو بے اختیار ٹپکنے لگتے ہیں، دل غمگین ہو جاتا ہے۔ یاد کے ذریعے وہ گھر میں ہی جیسے آ جاتی ہے اور یاد کے جاتے ہی وہ بھی چلی جاتی ہے۔

''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''ببولا''، ''ساری نظمیں خاک ہوئی تھیں''، ''بے انت''، ''کٹائی کے دن ہیں'' اور ''مرے قلم کی روانی'' شامل ہیں۔ ''ببولا'' میں شاعر کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن انسان نے یہ دنیا چھوڑنی ہی ہے۔ یہ مشکلات بھری دنیا ختم ہونی ہی ہے۔ اہلیہ کی وفات کے بعد دونوں کی زندگی کو بے نور قرار دیا ہے کہ نہ اس کو قرار ہوگا اور نہ ہی شاعر کو قرار ہے۔ دونوں جدائی میں تڑپ رہے ہیں۔ وزیر آغا اپنی اہلیہ سے جدا ہو کر بے نور خلاء میں خود کو تصور کرتے ہیں اور اپنی اہلیہ کو بھی جدا ہونے پر بے نور خلاء میں تصور کرتے ہیں۔ ''ساری نظمیں خاک ہوئی تھیں'' میں شاعر کہتا ہے کہ اہلیہ کی وفات کے بعد ہر چیز، ہر موسم بدل گیا ہے۔ گھر میں بس غم اور اداسی کا بسیرا ہے۔ میری ساری دولت، عزت، شہرت اور میری تحریریں کسی کام کی نہیں رہیں۔ سب کچھ فضول اور بے مقصد ہو گیا ہے۔ اہلیہ کے ساتھ ہی سب کچھ خاک ہو گیا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

اب تو یوں لگتا ہے جیسے
موسم سارے، وقت پہ آنا
وقت پہ جانا بھول چکے ہیں (۸۹)
(ساری نظمیں خاک ہوئی تھیں)

نظم ''بے انت'' میں شاعر اپنی اہلیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے میری زندگی میں

آنے سے قبل میری زندگی میں خوشی نہ تھی۔آنسواور دکھ میرے ساتھی تھے،اس کے آنے سے میرے آنسواور دکھ خوشی کے آنسواور مسرت میں بدل گئے۔وہ مسرت اس کی وجہ سے مسکان میں بدل گئی لیکن اب میری اہلیہ اس دنیا سے جا چکی ہے اور وہ مسکان بن کر ستاروں کی دنیا میں پھیل گئی ہے۔''کٹائی کے دن ہیں''میں شاعر کہتا ہے کہ ابھی زندگی باقی ہے۔ہر طرح کی رنگینیاں موجود ہیں مگر نہ جانے کیوں میں ان خوشیوں سے لطف اندوز نہیں ہو پا رہا، مجھے ان سب رنگوں اور رعنائیوں سے نہ جانے کیوں لگاؤ نہیں رہا۔دراصل وزیر آغا کی اہلیہ کے انتقال کے بعد وہ بہت مایوس ہو گئے تھے،انہیں زندگی اور اس کی رنگینیاں بھی لطف نہیں دے رہی تھیں۔''مرے قلم کی روانی''وزیر آغا نے اپنی اہلیہ کی یاد میں لکھی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ تیری وجہ سے سارا گھر اور میری زندگی روشن تھی۔یہ زیور اب فضول ہیں،تو نے انہیں پہنا تھا تو ہی یہ قیمتی تھے۔ہر چیز اور ہر جگہ تیری وجہ سے روشن اور خوب صورت تھی،میرے قلم کا جادو بھی تیرے ہوتے ہوئے ہی تھا۔ذوالفقار احسن اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> وزیر آغا کی نظم''مرے قلم میں روانی''میں صفیہ آغا کی یاد اور ان کے قلم میں جو روانی تھی اُس کا محور و مرکز بھی انہوں نے اپنی شریکِ حیات کو گردانا ہے حتٰی کہ وہ کہتے ہیں کہ کہکشاں اگر فروزاں تھی تو فقط اُس کے دم سے،ستارہ صبح کا خوش تھا کہ اس کو تم نے اپنی پلکوں پر کمال نرمی سے سنبھال رکھا تھا،یہ زیورات،یہ گھر،یہ اَبر پارے،ستارے،املتاس کے پھول اگر خوش رنگ دلفریب تھے تو ان میں ان کا کوئی کمال نہ تھا،ان کو تم نے اتنی دلفریبی عطا کر دی تھی کہ یہ خوبصورت لگتے تھے۔(۹۰)

وزیر آغا کی شاعری میں کہیں کہیں''سردی''کے موسم کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور سردی کے موسم کی عمدہ منظر کشی کی ہے۔موسمِ سرما میں سردی کی وجہ سے زندگی کے آثار کم دکھائی دیتے ہیں کیونکہ زندگی حرارت کا نام ہے اور سردی حرارت کی دشمن ہے۔یہی وجہ ہے کہ درخت اور پودے ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں مناسب توانائی میسّر نہیں آ رہی ہوتی۔اسی طرح انسانی زندگی کو بھی سردی کا موسم متاثر کرتا ہے۔

''شام اور سائے''میں سردی کے موسم کو دو نظموں''آخر شب''اور''پت جھڑ''میں موضوع بنایا گیا ہے۔''آخر شب''میں شاعر کہتا ہے کہ سردی کی وجہ سے انسانی زندگی بھی سرد پڑ جاتی ہے۔پودوں پر بھی

موت واقع ہو جاتی ہے۔ پودوں کے پتے زرد ہو کر گر جاتے ہیں۔ انسانی جسم بھی سردی کے باعث بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ انسانی جسم سردی کی شدت کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ''پت جھڑ'' میں شاعر نے پت جھڑ کے موسم کی منظر کشی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس موسم میں ہر شے پر مردنی چھا جاتی ہے خاص طور پر درختوں اور پودوں پر۔ پت جھڑ کا موسم اداس اور خاموش ہوتا ہے۔ ہر کسی کو اس موسم میں حرارت اور زندگی کی تلاش ہوتی ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

پت جھڑ کی رت بھی کیسی ہے
ہر شے جیسے ہار چکی ہے (۹۱)

(پت جھڑ)

وزیر آغا کی شاعری میں ہوا کے عنوان پر کئی نظمیں موجود ہیں۔ وزیر آغا نے ہوا کے مختلف روپ اور انداز بیان کیے ہیں۔ ہوا کہیں تو تباہی و بربادی کا سامان بنتی ہے تو کہیں خوشیاں بکھیرتی ہے، کہیں زندگی کا استعارہ بنتی ہے تو کہیں سراسر موت۔ ''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''آوارہ'' اور ''زندگی'' شامل ہیں۔ ''آوارہ'' میں شاعر نے آوارہ شخص کے لیے ہوا کا استعارہ لیا ہے۔ آوارہ شخص اور ہوا کے مشترک خواص بیان کیے ہیں کہ کہیں یہ دونوں فائدہ پہنچاتے ہیں تو کہیں تباہی کرتے ہیں۔ آوارہ جس طرف لگ جائے، جو سوچ لے وہی کرتا ہے چاہے اس سے کسی کا بھلا ہو یا برا۔ اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے کسی بھی کام کا کوئی مقصد نہیں ہوتا، ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ وہ بالکل ہوا کی طرح ہوتے ہیں، کبھی کسی رخ تو کبھی کسی اور رخ منہ موڑ لیتے ہیں۔ اس نظم کا تجزیہ ناصر عباس نیر نے کچھ یوں کیا ہے:

> وزیر آغا نے یہ نظم ۱۹۵۴ء میں کہی، جب انہیں شعر کہتے ہوئے ایک عشرہ بھی نہیں گزرا تھا۔ وزیر آغا شعری اظہار کے ابتدائی سفر ہی میں فطرت اور اپنے باطن کے باہمی رشتے کو ایک خاص اور منفرد زاویے سے محسوس کرنے لگے تھے۔ اس نظم میں یہی زاویہ ہوا کی مزاجی کیفیات کو گرفت میں لینے سے سامنے آیا ہے۔ آشفتہ خاطری ہوا کی پہلی پہچان ہے۔ وزیر آغا بھی سب سے پہلے اسی وصف کو محسوس کرتے ہیں مگر یہ نظم محض ہوا کی سیمابیت کو ہی منکشف نہیں کرتی، یہ شاعر کے ایک خاص داخلی رجحان کی علامت بھی بن جاتی ہے۔ (۹۲)

نظم ''زندگی'' میں شاعر نے زندگی کو ایک سرد ہوا کا جھونکا کہا ہے، اشارہ روح کی طرف ہے

جسے ہوا کا جھونکا کہا جاتا ہے۔ جب تک یہ انسان یا کسی بھی جاندار میں موجود ہے، اُس پر زندگی کے آثار موجود ہیں۔ آپ کی شاعری کی کتاب ''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''ہوا کے جھونکے نے پر کھولے''، ''ہوا کہتی رہی آؤ'' اور ''ہوا اگر میرا روپ دھارے'' شامل ہیں۔ ''ہوا کے جھونکے نے پر کھولے'' میں شاعر کہتا ہے کہ روح جسم میں خود کو قیدی سمجھتی ہے، وہ جسم سے آزاد ہونا چاہتی ہے، جسم کی وجہ سے وہ اذیت کا شکار ہے۔ جب یہ روح جسم سے آزاد ہو جاتی ہے تو یہ خوش ہو جاتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے کہ شاعر نے ہوا کی آزادی کا ذکر کیا ہو۔ گاؤں کے ماحول میں ہوا آزاد ہوتی ہے جب کہ شہروں میں گنجان آبادی اور ماحولیاتی آلودگی کے سبب ہوا قید ہو جاتی ہے۔ ایک اور مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ انسان اگر اپنے ذہن کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لائے، سوچنا چھوڑ دے تو وہ قید ہے یعنی اس کی سوچ قید ہے۔ سوچ کی آزادی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ اس نظم کے بارے میں ناصر عباس نیر کچھ یوں کہتے ہیں:

> ۱۹۷۵ء میں وزیر آغا نے ''ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے'' کے نام سے ایک نظم لکھی یعنی لاہور سے واپس گاؤں آنے کے بعد، گاؤں آ کر وزیر آغا کو احساس ہوتا ہے کہ اب وہ دوبارہ فطرت سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور شہر کی غیر فطری رفتار سے انہیں رہائی مل گئی ہے۔ (۹۳)

نظم ''ہوا کہتی رہی کہ آؤ'' میں شاعر کہتا ہے کہ حالات کی سازگاری مجھے خوش ہونے پر اکساتی رہی لیکن میں اپنے غم نہ بھلا سکا۔ وجہ واقعہ کربلا کو کہا ہے چونکہ وزیر آغا اہل تشیع مسلک سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ہو ہر دم واقعہء کربلا کو قلب و ذہن میں رکھتے تھے۔ وہ اندوہ ناک واقعہ ان کو سازگار حالات میں بھی غمگین رکھتا تھا۔ یہاں ہوا سے مراد حالات کی سازگاری ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

ہوا کہتی رہی آؤ
مگر میں خشک چھاگل اپنے دانتوں میں دبائے
پیاس کی برہم سپہ سے لڑ رہا تھا، میں کہاں جاتا (۹۴)
(ہوا کہتی رہی کہ آؤ)

نظم کے اشعار پڑھ کر صاف سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اشعار واقعہ کربلا کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ہوا کہتی رہی آؤ'' میں ہوا کا بلاوا ایک جانب اور دوسری جانب خشک چھاگل کا دانتوں میں دبانا کہ ہاتھ کٹ چکے تھے، پیاس کی برہم سپہ

سے لڑنا اور سورج کے رتھ سے آتشیں تیروں کا آنا اور چھاگل سے
ہمک کر آب کا گرنا اور کسی بچے کا رونا اور پانی مانگنا، یہ سب استعارے
واقعہ کربلا کی طرف اشارے کرتے ہیں لیکن ان سے اور معنی بھی
اخذ کئے جا سکتے ہیں کہ جرعہ ءآب صفا صرف پیاس بجھانے کا ہی
استعارہ نہیں ہے بلکہ اس کی کثیر الابعادی جہتیں بھی ممکن ہیں جیسے
سکون یا عافیت اور ہاتھ کی ابھری رگوں میں قید، مجبوری اور کسمپرسی کا
مفہوم بھی مضمر ہوسکتا ہے۔(۹۵)

نظم ''ہوا اگر میرا روپ دھارے'' میں شاعر کہتا ہے انسانی جسم اسے برائیوں کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر اس کا ضمیر نہ جاگے تو وہ برائیوں کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے اور اگر ضمیر بیدار ہو جائے تو انسان کی زندگی بہتری کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔ یہاں ہوا سے مراد ضمیر کی آواز ہے، روح کی آواز ہے۔ ناصر عباس نیر نے اس نظم کے بارے میں کچھ یوں تجزیہ کیا ہے: ''نظم ''ہوا اگر میرا روپ دھارے'' یوں لگتا ہے جیسے اس نظم میں شاعر ایک بار پھر کسی المیے کی زد میں آیا ہے تو اس کی سائیکی نے ہوا کے مامتا بھرے ہمدردانہ روپ کو یاد کیا ہے۔''(۹۶)

''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''ناراض تھی شاید'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ہوا سے مراد اصل ہوا لیا ہے جو ماحولیاتی آلودگی کے باعث زمین پر رہنے والوں سے ناراض ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ آلودگی کے باعث آلودہ ہو کر بالخصوص شہروں کو بہت نقصان پہنچا رہی ہے کیونکہ شہروں میں آلودگی کی کثرت ہے۔ تازہ ہوا انسان کو اب شہروں میں تو بالکل میسر نہیں رہی۔ تازہ ہوا شہروں کے رہنے والوں سے ناراض ہے۔ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''ہوا بے ردا ہے'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ہوا کو تخریبی قوت قرار دیا ہے جو ہر شے کو تباہ کر دیتی ہے۔ انسان کے اپنے رویے کو طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان اپنا سب کچھ تباہ کر کے بعد میں سوچتا ہے کہ میں نے کیا کر دیا؟ انسان ضمیر کی آواز نہیں سنتا اور بعد میں پچھتاتا ہے۔

''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''ہوا سے کہنا'' اور ''عذاب'' شامل ہیں۔ ''ہوا سے کہنا'' میں شاعر نے ہوا سے مراد تخریبی قوت ہی لیا ہے۔ اگر ہوا سے مراد غربت لیا جائے تو شاعر کہتا ہے کہ اتنی غربت نہ ہو جائے کہ دنیا کے رہنے والے کپڑوں تک سے محروم ہو جائیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہ ہوگا۔ شاعر کہتا ہے کہ ہوا نے ہمیشہ زخم ہی دیئے ہیں لیکن اس مرتبہ تو حد ہی ہوگئی ہے اتنی شدید ہوا ہے کہ درختوں کی چھال تک اتر گئی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے درخت برہنہ ہو گئے ہوں۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

برہنگی سے نہیں ہے بڑھ کر عذاب کوئی

ہوا سے کہنا

خدارا اتنی نہ تیز آئے (۹۷)

(ہوا سے کہنا)

نظم ''عذاب'' میں شاعر کہتا ہے کہ ہوا نہ چلنے کے باعث تمام درخت اور پودے پریشان ہیں، سورج آگ برسا رہا ہے، گرمی نے جینا حرام کر دیا ہے۔ دھوپ سے بچ کر کہاں جائیں، کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں آرام وسکون ہو اور گرمی نہ ہو۔ شام کا انتظار کریں تو شام بھی تو گرمی کی ستائی ہوئی ہوگی، پورے دن کی گرمی کی وجہ سے شام بھی گرمی اور حبس کا شکار رہوگی۔ ''چنا ہم نے پہاڑی رستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''تجھے بھی یاد تو ہوگا'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ہوا کے مختلف انداز بیان کیے ہیں۔ کبھی ہوا چلے تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی صحن میں چل پھر رہا ہے، کبھی ہوا چلے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ خود سے سرگوشی کر رہی ہے، کبھی ہوا صبح کو نکھارتی ہے، صبح کے موسم کو خوشگوار بناتی ہے۔ ہوا کا ایک روپ طوفان اور آندھی بھی ہے جو ہر شے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ ''کاسۂ شام'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''ہوا تم سے کہے تو'' ہے۔ اس نظم میں شاعر جوانوں سے کہتا ہے کہ تمھارے رستے میں جتنی مرضی رکاوٹیں آئیں، تم ان رکاوٹوں کو پار کر کے آگے بڑھتے جانا، ان کے ڈر سے رُک نہ جانا۔ ساتھ ہی اپنی ضعیف العمری کا ذکر کیا ہے کہ میں اور مجھ جیسے دوسرے ضعیف لوگ اب اس دنیا کی دوڑ میں حصہ نہیں لے سکتے، اس لیے ہم خاموش ہیں۔ اس نظم میں ہوا سے مراد انسان کو زندگی میں آنے والی مختلف رکاوٹیں لیا گیا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

ہوا تم سے کہے رک جاؤ

تو ہرگز نہیں رکنا

ہوا سے کہنا پہلے خود رکے (۹۸)

(ہوا تم سے کہے تو)

ہوا کے موضوع پر وزیر آغا کی بہت سی نظمیں ہیں۔ ہوا کے موضوع پر وزیر آغا کی نظموں کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ناصر عباس نیر کچھ یوں کہتے ہیں:

> وزیر آغا کی نظموں میں ہوا کی علامت کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ تخلیقی عمل بنیادی طور پر اپنی ذات کی دریافت، سیاحت اور کھوج کا سفر ہے۔ ذات ایک گہری اور اندھیری گپھا ہے جسے علامتوں کی کرنوں

سے ہی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔علامتیں خارجی دنیا یعنی فطرت کے
مظاہر سے متعلق ہوتی ہیں،فطرت سے چونکہ انسانی ذہن کا تعلق بہت
پرانا ہے اور انسانی سوچ اور رویّوں کی تعمیر و تشکیل میں بھی فطرت نے
خاص کردار ادا کیا ہے اس لیے فطرت سے لی گئی علامتیں لاشعوری
تخلیقی دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہیں اور سیاحتِ ذات کے عمل میں سب سے
زیادہ معاون ثابت ہوتی ہیں۔(۹۹)

''تنہائی'' کے موضوع کو وزیر آغا نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔تنہائی میں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے ؟اس کی حالت کیا ہوتی ہے ؟ وزیر آغا نے ان سب سوالوں کے جوابات دیئے ہیں۔''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''بے کراں وسعتوں میں تنہا'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے اپنی تنہائی کو بیان کیا ہے اور تنہائی میں خود پر آنے والے مصائب و آلام کا ذکر کیا ہے۔شاعر نے خدا سے الگ ہونے کے دکھ کا ذکر بھی کیا ہے یوں شاعر نے دراصل انسان کی تنہائی کا ذکر کیا ہے۔انسان کا اپنے اصل سے الگ ہو جانے کے بعد دکھ اور پریشان رہنے کا ذکر کیا ہے ۔نظم میں وحدت الوجود کے تصور کی طرف بھی اشارہ ہے۔''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''کہاں گئی وہ بات'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان جب سے خدا سے الگ ہوا ہے، پریشان ہے۔شاعر کہتا ہے کہ انسان کو تنہائی میں خوب صورت مناظر بھی نہیں بھاتے۔شاعر نے اس دنیا میں آ کر انسان کی پریشانی کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں مثلاً انسان جو کہ ازل سے ابد کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔وہ پریشان ہے کہ یہ سب کیا ہے، کیوں اسے پابند کیا گیا ہے۔کیوں اسے الگ کر کے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

میں ایک اکیلی جان
انت، بے انت کی زنجیروں میں
جکڑا اک مہمان (۱۰۰)
(کہاں گئی وہ بات)

غرضیکہ وزیر آغا نے انسان سے متعلق بہت سے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر انسان کی اصلاح ،انسان کے ارتقاء،انسان کے مسائل اور انسان کی زندگی کے اہم امور کو زیر بحث لایا ہے۔وزیر آغا نے شاعری کے ذریعے انسان کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔انسان کو اپنی پہچان کرنے کا درس دیا ہے اور انسان کو اخلاقی اقدار کو اپنانے اور غیر اخلاقی رویّوں کی حوصلہ شکنی کرنے کی تلقین کی ہے۔یوں

معاشرے میں امن اور سکون قائم ہوسکتا ہے اور ایک بہترین انسانی معاشرہ جنم لے سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔انور سدید، ڈاکٹر، ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۳ء، ص ۲۷

۲۔سید احمد دہلوی، مئولف، مرتبہ: خورشید احمد خاں، فرہنگ آصفیہ، جلد دوم، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، لاہور، طبع سوم، سن ندارد، ص ۲۵۲

۳۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، آسان کلیات اقبال، مکتبہ دانیال، لاہور، سن ندارد، ص ۱۲۷

۴۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام اور سائے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع ثانی، ۱۹۸۵، ص ۲۱

۵۔ایضاً، ص ۳۹

۶۔رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء، ص ۲۷

۷۔رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن''، ص ۲۶

۸۔ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء، ص ۸۱

۹۔وزیر آغا، شام اور سائے، ص ۹۲

۱۰۔ایضاً، ص ۹۹

۱۱۔ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۴۸، ۴۹

۱۲۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، مکتبہ کاغذی پیرہن، مدیر: شاہد شیدائی، سرگودھا، طبع اول، ۲۰۰۱ء، ص ۲۹

۱۳۔ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۹۳

۱۴۔رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن، ص ۲۶

۱۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع ثانی، جنوری ۱۹۷۹، ص ۹۱

۱۶۔وزیر آغا، دیکھ دھنک پھیل گئی، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، مئی ۲۰۰۳ء، ص ۴۳

۱۷۔جمیل آذر، ''پہلی رنجش کے بعد'' مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: عابد خورشید، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۴۷

۱۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، یہ آواز کیا ہے، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸

۱۹۔ارمان نجمی، بیاضِ شب وروز، ص ۸۶
۲۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، گھاس میں تتلیاں، مکتبہ فکر وخیال، لاہور، طبع اوّل، جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۶
۲۱۔ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۱۱۳، ۱۱۴
۲۲۔ایضاً، ص ۹۴
۲۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، عجب اک مسکراہٹ، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، مارچ ۱۹۹۷ء، ص ۵۷
۲۴۔ارمان نجمی، بیاضِ شب وروز، ص ۹۱، ۹۲
۲۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ہوا تحریر کر مجھ کو، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۰
۲۶۔ارمان نجمی، بیاضِ شب وروز، ص ۱۱۰
۲۷۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چناہم نے پہاڑی راستہ، مکتبہ کاغذی پیرہن،، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۳۷
۲۸۔ایضاً، ص ۱۱۱
۲۹۔ارمان نجمی، بیاضِ شب وروز، ص ۱۰۸، ۱۰۹
۳۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، کاسۂ شام، کاغذی پیرہن، لاہور، اشاعت اوّل ۲۰۱۱ء، ص ۳۷
۳۱۔عبدالمجید، خواجہ، جامع الغات، جلد اوّل، اردو سائنس بورڈ، لاہور، طبع اوّل، مارچ ۱۹۸۹ء، ص ۹۶۸
۳۲۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، آسان کلیات اقبال، مکتبہ دانیال، لاہور، سن ندارد، ص ۲۶۹ تا ۲۹۶
۳۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، ص ۲۹
۳۴۔رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء، ص ۳۱، ۳۲
۳۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، ص ۶۰
۳۶۔صابر لودھی، ''گھاس میں تتلیاں (خصوصی مطالعہ)''مشمولہ سہ ماہی تجدید نو ڈاکٹر وزیر آغا نمبر، مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز، لاہور، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۱
۳۷۔ارمان نجمی، بیاضِ شب وروز، ص ۷۸، ۷۹
۳۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ہوا تحریر کر مجھ کو، ص ۳۴
۳۹۔ایضاً، ص ۶۶
۴۰۔ذوالفقار احسن، ''وزیر آغا کی نظم نگاری ''چٹکی بھر روشنی'' کے حوالے سے''مشمولہ سہ ماہی اسالیب ڈاکٹر وزیر آغا نمبر، مدیر: ذوالفقار احسن، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۲

۴۱۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چٹکی بھر روشنی،، مکتبہ کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶

۴۲۔وزیر آغا، ڈاکٹر، کاسۂ شام، ص ۳۹

۴۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، ص ۴۸

۴۴۔ناصر عباس نیر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۹۲

۴۵۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، آسان کلیات اقبال، مکتبہ دانیال، لاہور، سن ندارد، ص ۴۸۲

۴۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام اور سائے، ص ۷۸، ۷۹

۴۷۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چنا ہم نے پہاڑی راستہ، ص ۴۷

۴۸۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، آسان کلیات اقبال، ص ۲۹۴

۴۹۔ایضاً، ص ۳۷۹

۵۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع ثانی، جنوری ۱۹۷۹، ص ۱۰۷

۵۱۔سید قائم رضا نسیم امروہوی، سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی: مرتبین،، جامع نسیم اللغات اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، سن ندارد، ص ۱۰۵۸

۵۲۔فرحت ہاشمی، ڈاکٹر، حسن اخلاق، الہدیٰ انٹرنیشنل، اسلام آباد، طبع اوّل، فروری ۲۰۰۶ء، ص ۶۹۔۷۰

۵۳۔ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۲۲

۵۴۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۱۰۳

۵۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چنا ہم نے پہاڑی راستہ، ص ۲۵

۵۶۔فرحت ہاشمی، ڈاکٹر، حسن اخلاق، ص ۱۰۳

۵۷۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، آسان کلیات اقبال، ص ۱۹۶

۵۸۔سعد اللہ کلیم، ''ماں'' مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: شاہد شیدائی، ص ۱۴

۵۹۔سلیم آغا، ڈاکٹر، ''ماں'' ایضاً، ص ۱۸

۶۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، یہ آواز کیا ہے، ص ۲۴

۶۱۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۵۳

۶۲۔ناصر عباس نیر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۴۸

۶۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، عجب اک مسکراہٹ، ص ۵۸

۶۴۔عابد خورشید، ''سلوٹ'' مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: شاہد شیدائی، ص ۱۰۶

۶۵۔کمار پاشی، ''خدشہ'' ایضاً، ص ۳۱، ۳۲
۶۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام اور سائے، ص ۹۹
۶۷۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، ص ۲۳، ۲۴
۶۸۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۴۶
۶۹۔نعیم احمد، ڈاکٹر، ''ناموجود کے بھاری در پر'' مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: شاہد شیدائی، ص ۴۴، ۴۵
۷۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ہوا تحریر کر مجھ کو، ص ۵۰
۷۱۔وزیر آغا، ڈاکٹر، آدھی صدی کے بعد، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۱ء، ص ۱۴
۷۲۔ایضاً، ص ۴۰
۷۳۔ایضاً، ص ۷۲
۷۴۔ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا ہے، ص ۱۰۱
۷۵۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۶۵
۷۶۔رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن، ص ۴۴
۷۷۔بشیر احمد صدیقی، پروفیسر، جواہر اللغات، کتابستان پبلشنگ کمپنی، لاہور، سن ندارد، ص ۱۱۲
۷۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ہوا تحریر کر مجھ کو، ص ۸۲
۷۹۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چٹکی بھر روشنی، ص ۵۰
۸۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، عجب اک مسکراہٹ، ص ۱۰۰
۸۱۔صفدر رضا صفی، ''تھکن'' مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، ص ۱۲۳
۸۲۔وزیر آغا، ڈاکٹر، کاسۂ شام، ص ۳۵
۸۳۔ستیہ پال آنند، ''وزیر آغا کا پیٹر نیلیا'' مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، وزیر آغا کی یاد میں، مکتبہ کاغذی پیرہن، مدیر: شاہد شیدائی، لاہور، مارچ اپریل ۲۰۱۱ء، ص ۱۹، ۲۰
۸۴۔شان الحق حقی: مرتبہ، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، طبع چہارم، ۲۰۱۲ء، ص ۹۰۷
۸۵۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۴۷، ۴۸
۸۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چٹکی بھر روشنی، ص ۱۲
۸۷۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۵۵
۸۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، گھاس میں تتلیاں، ص ۱۰۴

۸۹۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چٹکی بھر روشنی، ص ۳۳

۹۰۔ذوالفقار احسن، ''وزیر آغا کی نظم نگاری ''چٹکی بھر روشنی'' کے حوالے سے''، مشمولہ سہ ماہی اسالیب، ص ۱۰۲

۹۱۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام اور سائے،، ص ۶۱

۹۲۔ناصر عباس نیر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۵۸

۹۳۔ایضاً، ص ۶۷

۹۴۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، ص ۴۹

۹۵۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۴۷

۹۶۔ناصر عباس نیر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۶۴، ۶۵

۹۷۔وزیر آغا، ڈاکٹر، اک کتھا انوکھی، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۹۰، ص ۵۶

۹۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، کاسۂ شام، ص ۵۷

۹۹۔ناصر عباس نیر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۷۷

۱۰۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، عجب اک مسکراہٹ، ص ۳۳

باب چہارم

وزیر آغا کی اردو نظم: موضوعات کی خارجی جہات کا تجزیہ

آگہی کی تلاش، تفہیم کی جستجو، جان لینے کی لگن، کھوجنے کی تڑپ اور اَن دیکھے کی کشش وزیر آغا کے ہاں بنیادی رویہ ہے۔ اس حوالے سے عالم وسماج کے عمل وردِّعمل کی پیچیدگیوں سے آگاہی حاصل کرنا وزیر آغا کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ اُن کے ہر مجموعہ میں اس موضوع پر نظمیں موجود ہیں۔ وزیر آغا نے انسان اور خاص طور پر غور وفکر کرنے والے انسان کا ذکر کیا ہے کہ وہ دنیا اور ورائے دنیا پر غور وفکر کر کے اس کے اسرار ورموز جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عنوان کو وزیر آغا نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ ایسا انسان جو تحقیقی ذہن کا حامل ہو، وہ معروض اور ماوراء کے اسرار جاننے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ رب کائنات نے بھی قرآن پاک میں بار بار تحقیق کرنے کی تلقین کی ہے۔ قرآن میں کئی جگہ ہے کہ زمین پر گھومو پھرو، کائنات پر غور وفکر کرو، تدبر کرو اور اس طرف توجہ دو۔ خالق کائنات خود انسان کو تحقیق وتدبر کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ اگر انسان اس عالمِ فانی پر غور وفکر کرے تو کئی راز جان سکتا ہے۔ آج تک دنیا میں جتنی ترقی ہوئی ہے، سب کی سب کائنات پر غور وفکر کرنے کا نتیجہ ہے۔

''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''بات'' اور ''چاپ'' شامل ہیں۔ ''بات'' میں شاعر کہتا ہے کہ میں کائنات کے تمام راز جان چکا ہوں جن سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ اسرار ورموز جاننے کے بعد وہ عام لوگوں کو اگر حقیقت بتانا چاہے تو لوگ اس حقیقت کو سننے کی تاب نہ لا سکیں گے، یہی وجہ ہے کہ اس نے یہ حقائق اپنے تک محدود رکھے ہیں۔ ''چاپ'' میں شاعر عالم کے بھیدوں کو جان کر اس کی حقیقت لوگوں تک پہنچانے کے لیے بولنا چاہتا ہے لیکن وہ اس خوف سے نہیں بول پا رہا کہ لوگ اس حقیقت کو جان کر نہ جانے کیسا ردِّعمل کریں گے۔ شاعر اس لیے تکلیف کی حالت میں ہے کیونکہ وہ بولنا چاہتا ہے لیکن بول نہیں پا رہا اور وہ اندر ہی اندر کڑھتا جا رہا ہے۔

''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''تکوین''، ''پیپر ویٹ''، ''اگر جی میں آئے'' اور ''چوٹی پر سے'' شامل ہیں۔ ''تکوین'' میں شاعر کہتا ہے کہ خدا نے اس جہان کی تخلیق کی، اس کو ازل اور ابد کی مسافت طے کرنی ہے لیکن انسان آج تک اس کے اسرار و رموز نہیں جان سکا۔ انسان ابھی تک اس کی تخلیق کی وجوہات اور اس تخلیق میں موجود مخلوقات کے بارے میں سوچ بچار کر رہا ہے جبکہ خدا نے اسے صرف کُن کہہ کر تخلیق کیا۔ انسان کے علم کو انتہائی ناقص قرار دیا۔ ''پیپر ویٹ'' میں شاعر نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ وہ کائنات کے اسرار سے کافی حد تک واقف ہو چکا ہے اور اس دنیا کے لوگوں کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے۔ ''اگر جی میں آئے'' میں شاعر کہتا ہے کہ میں ان رموز کا علم لایا ہوں، اپنی پیاس بجھا لو اور دل کو سکون دے لو۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ جہان کی تاریخ پڑھ کر انسان کی آنکھیں پرنم بھی ہو سکتی ہیں اور وہ دوبارہ ایک لمبی خاموشی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ نظم ''چوٹی پر سے'' میں شاعر کہتا ہے کہ وہ زندگی بھر کائنات کو جاننے کی تگ و دو اور جستجو میں رہا اور آج اسّی سال کی عمر کو پہنچنے کو ہے۔ اب اسے لگتا ہے کہ وہ کافی حد تک اسے جان چکا ہے۔ اسے اپنے اکثر سوالات کے جوابات مل چکے ہیں۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

کتنی اونچی چوٹی پر
وہ آ پہنچا ہے
جس سے آگے
نیلم سا آکاش کھلا ہے(۱)

(چوٹی پر سے)

''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر لکھی گئی نظموں میں ''پچاسیویں سالگرہ''، ''عجب اک آتشیں تلوار''، ''ASTRAL FEELINGS'' اور ''اک چلتی پھرتی پرچھائیں'' شامل ہیں۔ ''پچاسیویں سالگرہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ یہ وقت یا زمانے کی پکار ہمیں بہت کچھ سمجھا سکتی ہے، اگر ہم اس پر غور کریں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے اس پر کچھ غور کیا ہے۔ اس کے راز مکمل طور پر جاننا ناممکن ہے لیکن تلاش اور جستجو سے کافی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ ''عجب اک آتشیں تلوار'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، وہ کچھ کرنے کی ٹھان لے تو کر سکتا ہے۔ ساری کائنات رب نے اس کے لیے مسخر کر دی ہے۔ اگر وہ چاہے تو غور و فکر کے ذریعے اس کائنات کے سارے اسرار و رموز جان سکتا ہے۔ ''ASTRAL FEELINGS'' میں شاعر کہتا ہے کہ کائنات کے علم کی حدود متعین نہیں۔ یہ ایک لامحدود چیز ہے۔ انسان ساری عمر سیکھتا رہے، اسے مکمل طور پر کبھی نہیں سیکھ سکتا۔ فیصل ہاشمی اس نظم کے بارے میں کچھ یوں کہتے ہیں:

اس نظم میں شاعر ایک ایسے سفر پر روانہ ہوا ہے جہاں وہ اکیلا ہے، اس
کا کوئی ہم سفر نہیں، پہاڑ اس کے رستے میں بچھ گئے ہیں اور وہ کائنات
کی وسعتوں میں مظاہر کا نظارہ کرتا ہے۔ جیسے ہی وہ اس range کی
قید سے آزاد ہوتا ہے، وہ زماں کے حوالے سے کسی ایک لمحے میں اور
مکاں کے حوالے سے کسی ایک مقام پر موجود ہوتا ہے۔ (۲)

نظم ''اک چلتی پھرتی پرچھائیں'' میں شاعر کہتا ہے کہ مجھے زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے، میں تو زندگی کے بھید جاننا چاہتا ہوں۔ میری سوچ کا محور تو ہر وقت زمان و مکان کو جاننا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ:

مری نظریں افق کی لیک پر مرکوز ہیں
چمٹی ہوئی ہیں (۳)
(اک چلتی پھرتی پرچھائیں)

''یہ آواز کیا ہے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں صرف ایک نظم ''تھری سکور اینڈ ٹن'' شامل ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ میں کائنات کو جاننے کے لیے بے تاب ہوں۔ پوری زندگی میں یہ جاننے کے لیے بے قرار رہا، میں اب بہت کچھ جان چکا ہوں لیکن ابھی بھی میری پیاس بجھی نہیں ہے۔ اسے بجھانے کے لیے میں مزید تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ ''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر لکھی گئی نظموں میں نظم ''چلو ہم لوٹ چلتے ہیں'' اور ''اسرار'' شامل ہیں۔ ''چلو ہم لوٹ چلتے ہیں'' میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں جستجو و تلاش بہت کر چکے لیکن مکمل طور پر ہم زندگی کے اسرار و رموز نہیں جان سکے اور اب مزید جاننا مشکل لگتا ہے سو اب اس دنیا سے کوچ کرتے ہیں لیکن اس دنیا سے جانے کے لیے ہمیں بہت سے راز پتہ ہونے ضروری ہیں جو ہماری دوسری دنیا کے بارے میں رہنمائی کریں گے لیکن ایسے راز بتانے والے اور رہنما لوگ اب ختم ہو چکے ہیں یا اوجھل ہو چکے ہیں۔ ''اسرار'' میں شاعر کہتا ہے کہ کسی چیز کی تلاش اور جستجو مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ وہ میرے بدن میں پھیلی ہوئی ہے، مجھے اکساتی ہے کہ میں اس کی تلاش کروں۔ مجھے عجب بے چینی ہے اور اس راز جاننے کی بے حد آرزو ہے۔ میں اسے جانتا نہیں ہوں لیکن وہ مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ میں اسے تلاش کرنے پر مجبور ہوں۔ انسان راز جاننے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ ویسے بھی انسانی فطرت ہے کہ کوئی راز کیوں نہ ہو، انسان اسے جاننے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ انسان کو تلاش کی تڑپ چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ شاعر کچھ یوں کہتا ہے:

مگر کیسے نہ لاؤں، وہ مجھے

آرام کرنے ہی نہیں دیتی
میرے سارے بدن میں
ناچتی پھرتی ہے وہ ہر دم (۴)
(اسرار)

''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ تخلیق کا مرحلہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے تخلیق ہوتی ہے لیکن تخلیق کار دکھائی نہیں دیتا۔ تخلیق کار یعنی خدا دکھائی نہیں دیتا لیکن مخلوق کے ذریعے اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ فطری مناظر میں وہ دکھائی دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی ذات میں ڈوب کر اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔ میں فلسفے کی رو سے اُس تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن میں بھٹک گیا۔ وہ مجھے مختلف قدرتی و فطری مناظر میں ہر دَم خود کو دکھاتا رہا۔ شاعر کہتا ہے کہ لوگ قدرتی مناظر کا بغور مشاہدہ نہیں کرتے ورنہ انہیں وہاں خدا ضرور مل جائے۔ شاعر نے اس نظم میں صوفیانہ انداز میں ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جو خدا سے نا آشنا ہیں، جو خدا کو نہیں جانتے۔ اسی طرح انسان بہت سے دیگر اسرار و رموز سے بھی ناواقف ہے اور جاننے کی جستجو میں ہے اور کئی ایک کے بارے میں بہت کچھ جان بھی چکا ہے۔

''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''کون جانے''، ''کہیں تو کچھ ہے''، ''تحفہ چمکتے سال کا''، ''ٹوٹے ہوئے تارے نہیں تھے''، ''عجب اک مسکراہٹ'' اور ''بلیک ہول'' شامل ہیں۔ ''کون جانے'' میں شاعر کہتا ہے کہ ازل سے ابد کے درمیان کے وقت کا راز اَبھی تک جانا نہیں جا سکا۔ نہ جانے کیوں کائنات کو پیدا کیا گیا۔ ابتدا کے کچھ عرصوں کا علم انسان کے پاس موجود ہے، نہ جانے کب اس کا ازل سے ابد تک کا سارا علم انسان کو ہو سکے گا۔ نہ جانے کب اس کی انتہا ہو گی اور یہ اپنی مدت پوری کرے گی۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

کون جانے
دو کناروں، دو صداؤں
دو کڑے لمحوں میں حائل کون سا اسرار ہے (۵)
(کون جانے)

نظم ''کہیں تو کچھ ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کی کشمکش میں ہے۔ یہ عالَم اسے کبھی حقیقت محسوس ہوتا ہے تو کبھی خواب۔ انسان اپنی زندگی کے بڑھاپے کے ایّام

میں جبکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے، عجیب کشمکش میں ہوتا ہے کہ پتہ نہیں کہ میں جس عالَم میں ہوں کہ وہ حقیقی ہے یا خواب کا عالَم ہے۔ انسان اپنے وجود کے ہونے یا نہ ہونے کی کشمکش میں گرفتار رہتا ہے خاص طور پر تحقیق کرنے والا انسان۔ شاعر کائنات، انسان، زندگی اور وقت کی آگاہی چاہتا ہے اور انسانی ذہنی تناؤ اور کشمکش کا خاتمہ چاہتا ہے۔ ''تحفہ چمکتے سال کا'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسانی تاریخ کا آغاز پنہاں ہے پھر اس کے بعد کا کچھ حصہ معلوم ہے۔ وہ زمانہ اچھا تھا، پھر تحقیق کی لگن شروع ہوئی، تحقیق کے ذریعے سوچ میں وسعت آئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان تذبذب کا شکار ہے کیونکہ وہ جیون کے اسرار نہیں جان پارہا۔ حقیقت تک نہ پہنچ پانے پر گمراہ ہونے کا احساس ہورہا ہے۔ ''ٹوٹے ہوئے تارے نہیں تھے'' میں شاعر کہتا ہے کہ کاش انسان وہ راز جان سکتا لیکن انسان اپنی حدود میں قید ہے، اس کی سوچ محدود ہے، وہ اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ''عجب اک مسکراہٹ'' میں شاعر کے چہرے پر عجب سی ایک مسکراہٹ ہے کچھ جان لینے کی اور کچھ مزید جاننے کی جستجو کی۔ ''بلیک ہول'' میں شاعر انسان کے نہ جان پانے کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان جب اس زمان و مکان کے بارے میں سوچتا ہے تو خود کو ایک گہری کھائی میں گرا ہوا پاتا ہے اور اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ انسان آگہی کے لیے ایک نئی دنیا میں کھو جاتا ہے لیکن اس کے بارے میں جاننا مشکل کام ہے۔ انسان اس کے راز جانتا جانتا کئی بار بالکل اندھیرے میں چلا جاتا ہے، اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی ہوتی۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

اس کھائی کے اندر
جانے کس کھونٹی سے لٹکا رہ جاتا ہوں
بالکل اندھا ہو جاتا ہوں (٦)
(بلیک ہول)

نظم کی ان لائنوں سے واضح ہوتا ہے کہ وزیر آغا نے اس نظم میں انسان کے نہ جان پانے کا اظہار کیا ہے۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

> بلیک ہول میں بھی کائنات اور اس کے اسرار کے متعلق سوال اٹھایا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ کائنات کے عین درمیان ایک بلیک ہول ہے جس کے گرد پوری کائنات گھوم رہی ہے۔ یہ ایک منفی نہیں بلکہ مثبت تصوّر ہے جس کے نہ ہونے میں اس کا ہونا مضمر ہے۔ بلیک ہول تو مکان کی ایک قاش ہے جو اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے

لیے باہر کی طرف بھیجی ہے۔ زمان و مکان کی اس کشمکش میں کون سے
راز پوشیدہ ہیں ابھی ان کی تفہیم نہیں ہو سکی ہے لیکن شعری کردار کے
لیے بیداری اور خواب کی دنیا کے نقطہ اتصال و افتراق کی کشمکش سے
گرفت میں لینے والی کیفیات ایسے احساس کا در وا کرتی ہیں جہاں دید
و شنید ہی معدوم ہو جاتی ہے۔ (۷)

شعری مجموعہ ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''چٹکی بھر روشنی''، ''اگر گئے تم''، ''شپرک''، ''ساری عمر گنوادی ہم نے''، ''مسافر چلتے رہتے ہیں''، ''کہانی پر بھروسہ کرو'' اور ''اگر اپنے بدن پر'' شامل ہیں۔ ''چٹکی بھر روشنی'' میں شاعر کہتا ہے کہ میں کائنات کے راز جاننے کی کوشش میں مکمل طور پر کامیاب تو نہ ہو سکا کیونکہ یہ ایک بہت مشکل اور تقریباً ناممکن کام ہے کہ انسان اس کائنات کے تمام اسرار و رموز جان لے۔ میں نے یہ راز جاننے کی تگ و دو میں ایک حد تک کامیابی ضرور حاصل کر لی ہے، یہی بڑی بات ہے کہ میں کچھ نہ کچھ جان گیا ہوں۔ علی دانش اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہاں حیرت دو طرح کی ہے: اسرار کے ہالے کا نظارہ کرنے کی اور
بے حد خطرناک اور پریشان کن حالات میں منزل کو سر کرنے کے لیے
اپنے اندر پائی جانے والی جرأت پر۔ جب شام نے خود کو اکیلا اور
انوکھی مہم جوئی کا خواہش مند پایا، وہ اسرار کے ہالے کے اندر داخل
ہو گیا۔ یہ جہانِ اسرار، یہی جہانِ آب و گل تھا جس نے کبھی اپنے
وجود میں زندگی کے لیے راستہ ہموار کیا اور اس کا خیر مقدم کیا لیکن آج
اسی جہان میں اس کے بطن سے ایسے ایٹمی اسلحے کا ظہور ہوا جس نے
زندگی کی راہیں مسدود کر دیں۔ (۸)

نظم ''اگر گئے تم'' میں شاعر کہتا ہے کہ کائنات کے لامتناہی راز ہیں، انہیں ڈھونڈنے لگیں تو پوری زندگی گزر جائے گی لیکن ہم ان تمام اسرار سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اپنی استطاعت اور حد کے مطابق اس کائنات کے راز جاننے کی کوشش کرو، تمھیں لطف آئے گا۔ اگر اپنی حدود کو پار کرو گے تو پھر سوائے تھکن اور تاریکی کے کچھ نہ ملے گا۔ شاعر نصیحت کر رہا ہے کہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ان اسرار کو جاننے کی کوشش کرو جو انسان کے اختیار میں ہیں۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

پہاڑ کی بلندی سر کر لینے کے بعد یا کامیابی سے ہمکناری کے بعد تنہائی

اور درماندگی ہی ہاتھ آتی ہے۔اسی لیے وہ مخاطبین کو اس تھکن سے
محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔مگر خود تھکن سے چور ہونے کے باوجود وہ
زندگی کے گھمسان سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ آخری
سانسوں تک وقت کی بساط پر قدم جمائے رہنا چاہتے ہیں(۹)

نظم ''شپرک'' میں شاعر کہتا ہے کہ رات کی خاموشی میں انسان غور وفکر کرے تو اس کی تخلیقی قوت نکھرنے لگتی ہے، اسے انجانے اسرار کھلنے کا احساس ہوتا ہے۔وہ بہت سے نئے جذبات سے آشنا ہوتا ہے۔اسے رات کے وقت آسمان پر بہت سے اشارے ملتے ہیں جو بظاہر بے آواز ہوتے ہیں لیکن بغور جائزہ لیا جائے تو وہ چیخ چیخ کر پکار رہے ہوتے ہیں۔''ساری عمر گنوادی ہم نے'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اس راز کو ابھی تک نہیں جان سکا کہ یہ عالَم حقیقت ہے یا کسی اور عالَم کا عکس ہے، کیا ہم حقیقت میں زندگی بسر کر رہے ہیں یا ہم عکس ہیں، خواب ہیں؟ نظم ''مسافر چلتے رہتے ہیں'' میں شاعر کہتا ہے کہ علم کا پیاسا، جستجو و تحقیق کرنے والا شخص ہر وقت اپنی جستجو کے سفر میں رہتا ہے۔انسان کو تحقیق و جستجو کرنے کا درس دیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ انسان ہر وقت تلاش و تگ و دو کرے۔کبوتروں کی طرح کسی ایک مقام کا نہ ہو کے رہ جائے بلکہ گھومے پھرے اور نئی نئی چیزیں دیکھ کر ان پر تحقیق کرے۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

یہ موسمی آبی پرندے ہیں
جنہیں میلے پروں کے ساتھ اڑنا ہے
انہیں رکنا نہیں آتا (۱۰)

(مسافر چلتے رہتے ہیں)

نظم ''کہانی پر بھروسہ کرو'' میں شاعر کہتا ہے کہ تم کائنات کے تخلیق کار کی بجائے کائنات پر اپنی توجہ مرکوز کرو۔تم اس دنیا، اس کی تخلیق پر غور وفکر کرو، تمھیں خود بخود سب کچھ سمجھ آجائے گا۔''اگر اپنے بدن پر'' میں شاعر کہتا ہے کہ تقلید کو چھوڑو اور تحقیق کرو۔رکے رہنے کی مخالفت کی ہے، جستجو کرتے رہنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ اگر انسان کسی ایک جگہ آکر اس جگہ کو اپنی سوچوں کا محور بنالے، انسان میں تحقیق کی جستجو اور تجسس ختم ہو جائے تو پھر انسان ایک جگہ ٹھہر جاتا ہے۔وہ بہت سے علوم سے ناواقف رہ جاتا ہے۔بہت سے معانی اس کی نظر سے چھپ جائیں گے، وہ بہت سا علم حاصل کرنے سے قاصر رہ جائے گا۔

نظم ''ہم آنکھیں ہیں'' جو کہ وزیر آغا کی شعری کتاب ''ہم آنکھیں ہیں'' میں موجود ہے، اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ جس انسان کے قلب و ذہن میں کچھ پا لینے کی خواہش جنم لے لے، وہ انسان حیاتِ

جاودانی کا مشاہدہ کر کے اس کے اسرار جاننے کی جستجو میں محو ہو جاتا ہے، جستجو کرنے سے وہ بہت سے اسرار جان بھی لیتا ہے جن کو جان لینے کے بعد اس کو کافی حد تک تشفی ہوتی ہے۔ اسی مجموعہ کی ایک اور نظم ''دم سادھے چپ چاپ کھڑے ہیں'' میں شاعر کہتا ہے کہ کائنات وحیات بہت وسیع وعریض ہے، غور وفکر کے بنا انسان کچھ نہیں جان سکتا۔ جو تدبّر کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے، اس کے اسرار ورموز کیا کیا ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اسرار جاننے کے بعد دوسروں کو بتانا کافی مشکل ہوتا ہے، انسان کی حالت عجب ہو جاتی ہے، اسے چپ سی لگ جاتی ہے۔ اسی مجموعہ کی نظم ''ہم خالی کوزے آنکھوں کے'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کا علم بہت کم ہے، اگر غور وفکر نہ کرے تو انسان کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ انسان میں جستجو کی بھی بہت کمی ہو گئی ہے اور جذبات بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ کچھ پانے اور حاصل کرنے کی تمنا بھی باقی نہیں رہی۔ ایک اور نظم ''لوگوں کی باتوں سے ہمیں کیا لینا ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ اگر لوگ کائنات اور زندگی کے اسرار سے واقف ہوتے تو ان کی سوچ میں وسعت ہوتی، ایسی وسیع سوچ کے حامل لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

شعری مجموعہ ''کاسہء شام'' میں اس عنوان پر لکھی گئی نظموں میں ''پھر یوں ہوا'' اور ''بگولا'' شامل ہیں۔ ''پھر یوں ہوا'' میں شاعر نے کہا ہے کہ انسان جب تحقیق کرنی شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے در کھلتے چلے جاتے ہیں یوں وہ کائنات کے بھید جانتا چلا جاتا ہے۔ ''بگولا'' میں شاعر کہتا ہے کہ کائنات کے اسرار ورموز جاننے کے دوران ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں کچھ سمجھ نہیں آتا۔ انسان تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان اس حالت پر پہنچ کر اپنے سوالات کا جواب کس سے پوچھے، وہ خود سوال بن جاتا ہے۔ شاعر نے نظم میں کچھ یوں کہا ہے:

کس سے پوچھتے کہ ہم خود بھی
اپنی ہی ٹھوکروں کی زد پر تھے (۱۱)
(بگولا)

وزیر آغا کی شاعری کا ایک اہم موضوع ''وقت'' ہے۔ اُنہوں نے وقت، آگہی، پھیلاؤ اور بھید کو موضوع بنایا ہے۔ جو وقت کی قدر نہیں کرتا، وقت بھی پھر اس کی قدر نہیں کرتا مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ جو وقت ضائع کر دیتے ہیں، ان کی زندگی ایک ناکام زندگی بن کر رہ جاتی ہے۔ نور اللغات میں لفظ ''وقت'' سے مراد زمانہ، عرصہ، ہنگام، موسم، فصل، فرصت، مہلت وغیرہ لیا گیا ہے۔ (۱۲) یہ ایسا عنوان ہے جسے بہت سے شعرا نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اس عنوان پر کئی نظمیں لکھ کر غلام مسلمان قوم کو محنت پر اُبھارا ہے۔ بے شک جو شخص وقت کا شعور نہیں رکھتا، وہ کامیاب نہیں ہو پائے گا۔

''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''سر پھرا'' اور ''چمکتا لمحہ'' شامل ہیں۔ ''سر پھرا'' میں شاعر کہتا ہے کہ وقت بہت قیمتی شے ہے، اکثر لوگ جوانی کو بے کار اور فضول کاموں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ شاعر اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے تو اسے اپنا ماضی بھی ایک سر پھرے انسان کا سا لگتا ہے جو زمانے سے ہٹ کر کام کرتا ہے۔ شاعر ماضی کو یاد کر کے دکھی ہو رہا ہے کہ اس نے کیسی زندگی گزاری، کاش وہ اپنے وقت کو مفید سرگرمیوں اور کاموں پر صرف کرتا۔ ''چمکتا لمحہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ اپنے قیمتی وقت کی قدر کر لو کیونکہ موت اٹل ہے، کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ دنیا میں آنے سے قبل ہی موت کے دن کا تعین ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر ایک دن وہ لمحہ آ پہنچتا ہے، انسان اس لمحے میں ختم ہو جاتا ہے لیکن وقت پھر بھی چلتا رہتا ہے، کبھی نہیں تھمتا، ہماری زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن وقت نہیں۔ ہماری زندگی کا عرصہ اور وقت ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ ہم اسے قیمتی جانتے ہوئے اس کی قدر کریں، اس میں کچھ ایسا کام کر جائیں کہ رہتی دنیا تک ہمارا نام قائم رہے۔ ''دن کا زرد پہاڑ'' کی نظم ''ڈولتی ساعت'' میں بھی شاعر نے انسانی زندگی کے انتہائی مختصر ہونے کو موضوع بنایا ہے۔

'' نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''واپسی'' اور '' نشر گاہ'' شامل ہیں۔ ''واپسی'' میں شاعر کہتا ہے کہ جب انسان بڑھاپے میں پہنچ جاتا ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے قیمتی سال ضائع کر دیئے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کا ضمیر ساری زندگی مردہ رہتا ہے۔ شاعر سوالیہ انداز میں کہہ رہا ہے کہ ضمیر جو غافل ہو چکا ہو، وہ زندگی کے آخری لمحات میں بیدار ہو سکتا ہے؟ اور پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اب ضمیر جاگ نہیں سکتا کیونکہ یہ بہت زنگ آلود ہو چکا ہے۔ بس ایک آواز سی پیدا ہو رہی ہے جو اس کے جاگنے کا سبب بن سکتی ہے لیکن یہ تو اتنا آلودہ ہو چکا ہے کہ اس ایک آواز سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ شاعر کہتا ہے کہ جس انسان کی ساری زندگی غفلت میں کٹ جائے، جس نے ساری زندگی بے ضمیر گزاری ہو، آخری زندگی میں اس کا ضمیر اتنا آلودہ ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی بیدار نہیں ہو پاتا۔ شاعر نے اس نظم کے ذریعے ہمیں اپنے وقت کی قدر کرنے کی نصیحت کی ہے۔ اپنے اندر کی آواز سننے کی تلقین کی ہے۔ ''نشر گاہ'' میں شاعر نے وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس دلایا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وقت اپنے ہونے کا اعلان کر رہا ہے، اس کی آواز سنو۔ اپنے وقت کو قیمتی بنا لو، زندگی کا ہر لمحہ بہت قیمتی اور نایاب ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

عجب سلسلہ ہے
کروڑوں برس کی مسافت پہ پھیلا ہوا سارا عالم

صداؤں کی، لہروں کی اک چیختی نشر گہہ بن چکا تھا
فقط اپنے ہونے کا اعلان کرتا چلا جا رہا تھا (۱۳)
(نشر گاہ)

ان اشعار میں شاعر نے وقت کی قدر کرنے کا درس دیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> وہ جس اعلان کو نشر کرتا ہے اس سے ساری کائنات تو بیدار ہو جاتی ہے لیکن وہ خود ابھی لاعلمی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے اور شاید ہمیشہ ڈوبا رہے۔ زندہ کائنات میں ایک ذی روح شخص کا پرزہ بن جانا اور آزادی و انفرادیت کے احساس تک سے محروم ہو جانا اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے اور اسی المیے کو اُبھارنے کے لیے وزیر آغا نے یہ نظم تخلیق کی ہے۔ (۱۴)

انور سدید نے اپنے انداز میں اس نظم کو سمجھا ہے لیکن وزیر آغا خود اس نظم کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> کائنات کا شہری (کائنات کا مسافر) بننے کے بعد مجھے ایک اسرار کا سامنا تھا جو ایک ساؤنڈ بیریئر کی طرح میرے سامنے ابھر آیا تھا۔ میں اس بیریئر کو عبور کرنا چاہتا تھا مگر کر نہیں پا رہا تھا۔ مثلاً میری نظم ''نشر گاہ'' میں اس احساس نے یہ شکل اختیار کی کہ پوری کائنات ایک نشر گاہ ہے جو ہر دم بھید بھرے پیغامات پہنچا رہی ہے، مگر ان پیغامات کو وصول کرنے والا شاید کوئی نہیں ۔۔۔ تو کیا کائنات، ان سب پیغامات کو صرف اپنے تک پہنچانے کے لیے نشر کر رہی ہے۔ (۱۵)

''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''شام کے ستارے سے'' اور ''کتنا بڑا یہ دروازہ ہے'' شامل ہیں۔ ''شام کے ستارے سے'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسانی زندگی عارضی ہے بلکہ یہ ساری کائنات ہی عارضی و فانی ہے۔ انسان کی زندگی کی مدت بہت کم ہے۔ قرآن کے مطابق بھی یہ دنیاوی زندگی ایک لمحہ کے برابر ہے۔ شاعر نے زندگی کی بے ثباتی بیان کرتے ہوئے وقت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ اس دنیا میں ملے ہوئے وقت کی قدر کر لو تا کہ تمھاری ہمیشہ کی زندگی بہتر ہو سکے اور دنیا میں بھی بہتری آ سکے۔ ''کتنا بڑا یہ دروازہ ہے'' میں شاعر نے دنیا کو ایک بڑے دروازے سے تشبیہ دی ہے۔ انسان آتا ہے اور کچھ عرصہ گزار کر واپس چلا جاتا ہے۔ آتا ہے تو خوشیاں منائی جاتی ہیں اور جب انسان اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو سب غمگین

ہوتے ہیں اور خالی پن کا احساس ہوتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کے عارضی اور فانی ہونے کو موضوع بناتے ہوئے شاعر نے ہمیں وقت کی اہمیت کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کی تلقین کی ہے۔

''یہ آواز کیا ہے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''۱۹۹۵'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ وقت کہاں رک سکتا ہے۔ شاعر نئے سال کو کہہ رہا ہے تم نے آنا ہی ہے تو آجاؤ۔ تمھیں آنے سے کون روک سکتا ہے۔ شاعر نے وقت کے تیزی سے گزرنے کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے کہ وقت تو گزرتا ہی جا رہا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس کا استعمال کیسے کرتے ہیں۔ اس کی قدر کریں گے تو یہ ہماری بھی قدر کرے گا اور اگر اسے ضائع کر دیں گے تو یہ ہمیں بھی ضائع کر دے گا۔ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں نظم ''اکھڑ گئے سو اکھڑ گئے'' شامل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ جانے والوں کو لوگ بھلا دیتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد ایسے لگتا ہے کہ جیسے وہ آیا ہی نہ ہو۔ شاعر کہتا ہے جو شخص اس دنیا سے چلا جاتا ہے وہ کبھی لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ اگر کئی برسوں بعد آ بھی جائے جو کہ ممکن نہیں ہے تو ایک اجنبی دنیا اس کو دیکھنے کو ملے گی۔ اس کی واقف کوئی چیز بھی اسے نہ ملے گی کیونکہ وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ شاعر نے کہا ہے کہ جو اس دنیا سے چلا جاتا ہے کچھ عرصے بعد اس کا دنیا سے نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں ملے وقت کی قدر کر لو تا کہ مرنے کے بعد بھی تمھارا نام زندہ رہے اور ابدی زندگی کے لیے بھی ایسے اعمال کر جاؤ کہ وہاں بھی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''دعوت شیراز'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے وقت کی قدر کرنے کی نصیحت کی ہے۔ وقت کے گزرنے کا احساس دلایا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسانی زندگی موت کی طرف رواں دواں ہے۔ ہر لمحہ زندگی کم ہو رہی ہے۔ وقت انسان سے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ میری قدر کر لو، مجھے ضائع مت کرو۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور انسانی عمر کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ساری نظم میں شاعر نے انسان کو وقت کی قدر و اہمیت بتاتے ہوئے اسے قیمتی بنانے کی نصیحت کی ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

عمر کی ساعتیں
کن کالے پہاڑوں میں
گھرے شہر کی جانب ہیں رواں
کس کو خبر (۱۶)

(دعوت شیراز)

''گھاس میں تتلیاں'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''دستک'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہہ رہا ہے کہ وقت کا ہر لمحہ ہمیں دستک دے رہا ہے، ہمیں وقت بہت کچھ سکھاتا ہے۔ اگر ہم وقت کی دستک سنیں تو ہم

زندگی کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔گزرا ہوا زمانہ ہماری اصلاح کرتا ہے۔قرآن میں بھی ہمیں گزری ہوئی اقوام کے قصے سنا کر سبق اور عبرت دلائی گئی ہے۔یوں شاعر نے پوری نظم میں وقت کی قدر کرنے کی نصیحت کی ہے تا کہ ہماری دنیاوی وابدی زندگی بہتر گزر سکے۔اس نظم کا ناصر عباس نیّر نے کچھ یوں تجزیہ کیا ہے:

> شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ شاعر کی ذات صدیوں سے دستک دیے جا رہی ہے،مگر دروازہ ہے کہ کھلنے کا نام ہی نہیں لیتا چنانچہ وہ اپنی ہی بے نتیجہ سی دستک کی آواز میں غرق ہوتی جا رہی ہے۔یہاں ایک یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا شاعر کی دستک کسی ایسے گھر کے دروازے پر تو نہیں دی گئی جس کے مکین کو دستک دینے والے کی کوئی پروا ہی نہیں۔اس سوال کا جواب اسی نظم میں موجود ہے۔اصلاً دستک اور دستک دینے والے میں دوئی موجود ہی نہیں۔چنانچہ ایک تو شاعر کی ذات خود دستک ہے۔دوسرے شاعر یہ دستک کہیں اور نہیں خود اپنے ذات کے دروازے پر دے رہا ہے اور خود کو زندہ،بیدار اور تخلیقی طور پر فعّال رکھنے کی کوشش میں ہے۔(۱۷)

مجموعۂ نظم ''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں''۱۹۹۶''اور''میرا تھن''شامل ہیں۔''۱۹۹۶''میں شاعر نے وقت کے تیزی سے گزرنے کا بیان کیا ہے۔شاعر کو لگتا ہے کہ نیا سال اتنی جلدی شروع ہو گیا،زمانہ اتنا تیزی سے بدل رہا ہے اور وقت بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے،یقین ہی نہیں آ رہا۔وقت کے تیزی سے گزرنے کا بیان ہے اور اس کی قدر کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ وقت جتنی تیزی سے گزر رہا ہے اتنی ہی جلدی انسان کی عمر کم ہو رہی ہے۔یوں وقت آگے نہیں جا رہا بلکہ ہمارے لیے کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔''میرا تھن''میں شاعر کہتا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ قیمتی اور نایاب ہے۔کسی بھی لمحے کو غیر اہم نہ سمجھو۔اس لیے زندگی کے ہر لمحے کی قدر کرو اور اسے با مقصد کام میں صرف کرو۔فضول کاموں پر ضائع نہ کرو۔جس طرح دوڑ کے آخری مرحلے میں دوڑ میں حصہ لینے والے کے لیے ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔اگر وہ دورانِ دوڑ اپنے پیچھے آنے والوں کو مڑ کر دیکھنا چاہے تو شاید اسی ایک لمحے میں کوئی دوسرا اس سے آگے نکل جائے۔اس لیے اس آخری مرحلے میں اپنے حریف کو ذرا موقع نہیں دیتا۔شاعر کہتا ہے کہ ہمارے لیے زندگی کا ہر لمحہ اسی لمحہ کی طرح اہم اور قیمتی ہے۔

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ''میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام''اک بے انت

وجود' ہے۔اس نظم میں شاعر نے وقت کے وجود کا ذکر کیا ہے جو لاکھوں اربوں سال کے عرصے پر محیط ہے۔شاعر کہتا ہے کہ میں وقت کے اس وجود کا ایک معمولی سا حصہ ہوں۔میں اس کی ساری حقیقت سے آگاہ ہو گیا ہوں۔میں نے وقت کے سارے ادوار کا بغور جائزہ لے لیا ہے۔مجھے اب اس کے متعلق ہر بات کا علم ہو گیا ہے لیکن وقت کو اس بات کی کوئی پروا نہیں۔اس کی نظر میں میری کوئی اوقات نہیں۔شاعر کہتا ہے کہ ہمارے لیے وقت اہم ہے لیکن ہم وقت کے لیے کوئی اہمیت یا حیثیت نہیں رکھتے۔''ہم آنکھیں ہیں'' کی نظم ''عجب سفر تھا'' میں شاعر نے وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس دلایا ہے اور انسان کا وقت کی قدر نہ کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔شاعر نے کہا ہے کہ زندگی بہت مختصر ہے، وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے اور اکثر انسان اس وقت کو ضائع کر رہے ہیں۔روح اور جسم کے بندھن کے بارے میں کہا ہے کہ یہ بندھن کبھی بھی ٹوٹ سکتا ہے۔شعری مجموعہ ''کاسہء شام'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''دو چہرے'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ وقت کے دو چہرے ہیں، ایک چہرہ خوشی کا اور دوسرا غمی کا یعنی وقت کسی کے لیے خوشیاں لاتا ہے تو اسی وقت کسی اور پر غم لاتا ہے۔حالات جیسے بھی ہوں، ہمیں وقت کی قدر کرنی چاہیے، وقت ہمارے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

ہر لمحے کے دو چہرے ہیں
اک وہ جس کی پیشانی پر
نور کا قشقہ روشن ہے
دوسرا چہرہ بجھا ہوا ہے(۱۸)

(دو چہرے)

محنت کے بغیر انسان کچھ نہیں کر سکتا۔اس دنیا میں محنت ہر کام کی شرط ہے، بغیر محنت کے ایک تنکا تک ہلایا نہیں جا سکتا۔اس دنیا نے جس نے بڑا نام کمایا ہے صرف اور صرف محنت کی بدولت ہی کمایا ہے۔جدید شعرا نے اس موضوع کو کثرت سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔جدید شاعری کی ابتدا کرنے والے الطاف حسین حالی نے محنت کی عظمت پر بہت سی نظمیں لکھیں یہاں تک کہ ''مسدس مدّ و جزر اسلام'' میں بھی حالی نے ہمارے آباء و اجداد کی محنت کی مثالیں ہمارے سامنے رکھیں اور ہمیں محنت پر اُکسایا۔اس کے بعد اقبال نے مسلمانوں کو محنت کرنے پر آمادہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے کاہلی اور سستی کو اپنے اندر سے ختم کیا اور محنت و بہادری کو اپنا شعار بنا کر انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کی۔وزیر آغا کی شاعری میں بھی جا بجا محنت کا درس دیا گیا ہے۔ظفر اللغات میں لفظ ''محنت'' سے مراد رنج، تکلیف، مشقت، مزدوری، کام کاج وغیرہ لیا گیا

ہے۔(۱۹)

''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''پرانی بات''، ''اکیلا''، ''ننھے مزدور'' اور ''نارسائی'' ہیں۔ ''پرانی بات'' میں شاعر نے اپنی قوم کو نرم مزاج قرار دیا ہے جو آرام دہی کو اپنا چکی ہے۔ شاعر نے خود کو اس قوم سے الگ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ میں محنت کرتے کرتے کچھ وقت آرام کے لیے اگر رُکا ہوں تو میری قوم برا مان گئی ہے۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں ان جیسا نہیں ہوں۔ میں دوبارہ محنت کے لیے پُر دم ہوں اور یہاں سے جا رہا ہوں۔ میرا اِس نرم مزاج اور کاہل قوم کے ساتھ گزارا ممکن نہیں ہے۔ ''اکیلا'' میں شاعر کہہ رہا ہے کہ میں اکیلا ہوں حالات کی بہتری چاہنے والا اور اس کے لیے محنت کر رہا ہوں۔ اس راہ میں بہت مشکلات ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ محنت کرنے سے ہر مشکل کام کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔ شاعر نے دوسرے لوگوں کو بھی محنت پر اُکسایا ہے کہ محنت ہی وہ رستہ ہے جس کی بدولت انسان اپنے اہداف حاصل کر سکتا ہے۔ ''ننھے مزدور'' میں پرندوں کو ننھے مزدور کہا ہے، وہ صبح ہوتے ہی اپنے گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور رزق کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ رزق تلاش کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور شام کو واپس اپنے گھونسلوں میں آ جاتے ہیں، انہیں اپنے کل کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ شاعر نے اس نظم میں دو نصیحتیں کی ہیں، ایک یہ کہ انسان بھی پرندوں کی طرح درویشانہ زندگی گزارے، کل کی فکر چھوڑ دے اور دوسری نصیحت یہ کی ہے کہ انسان صبح سویرے اٹھے اور اپنے رزق کی تلاش کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، کاہلی اور سستی کو دور بھگائے، محنت کو اپنا شعار بنائے۔ نظم ''نارسائی'' میں شاعر نے انسان کو روزانہ محنت کرنے کا درس دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جیسے رات روزانہ اپنی تیاری کے ساتھ آتی ہے، اپنے وقت مقررہ تک رہتی ہے، ویسے ہی انسان کو روزانہ اپنا کام اپنے مقررہ وقت پر کرنا چاہیے۔ انسان کو محنت کرنے اور وقت کی پابندی کرنے کا درس دیا ہے۔

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' اور ''رک جاؤں تو'' شامل ہیں۔ ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ میں نے محنت اور جدوجہد کی بدولت زندگی اور کائنات کے کئی راز جان لیے ہیں۔ میں نے زندگی گزارنے کے لیے مشکل راستہ اختیار کیا ہے جس کی بنا پر مجھ پر زندگی کے بہت سے راز منکشف ہوئے ہیں۔ میں نے اس مشکل رستے پر چل کر بہت کچھ سیکھا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ سخت محنت اور لگن سے مشکل سے مشکل کام کیا اور سیکھا جا سکتا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

چنا ہم نے پہاڑی راستہ
اور سمت کی بھاری سلاسل توڑ کر

سمتوں کی نیرنگی سے ہم واقف ہوئے (۲۰)

(چنا ہم نے پہاڑی راستہ)

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے زندگی کے سفر کے لیے مشکل راستہ چنا ہے۔ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں: ''پہاڑی راستے کی صعوبتوں سے گزر کر ہی شعری کردار نے کامیابی حاصل کی اور اپنے امکانات کو بروئے کار لا کر اپنی جستجو کا سفر جاری رکھا۔''(۲۱)

نظم ''رک جاؤں تو'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کی سرشت اور فطرت میں رکنا نہیں ہے، وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ رک جاؤں تو دل مطمئن نہیں ہوتا کیونکہ چلتے رہنا میری عادت ہے۔محنت کرتے رہنا زندگی کی علامت ہے۔ٹھہرنا موت کی علامت ہے لیکن شاعر کہتا ہے کہ میں جس منزل پر پہنچ گیا ہوں۔یہاں سے آگے چلنا چاہوں تو پھسلن ہوتی ہے جس سے گرنے کا اندیشہ ہے۔انسان ایک حد تک سوچ سکتا ہے۔اس کی سوچ محدود ہے۔خالق نے اسے ایک حد سے آگے سوچنے کی صلاحیت نہیں دی۔اگر دی ہوتی تو وہ مزید اسرار و رموز جان سکتا۔خلاصہ یہ کہ شاعر نے انسان کی محنت اور جستجو کرنے کی فطرت کو موضوع بنایا ہے۔''کاسۂ شام'' کی نظم ''خاک شفا'' میں شاعر کہتا ہے کہ محنت کے بل پر انسان دنیا میں کامیاب اور نامور ہوتا ہے۔ایک ایسے شخص کا بیان کیا ہے جو قیمتی ہے لیکن وہ کسی فضول سی جگہ پر تھا لیکن اب اس کی قدر ہونی شروع ہو گئی ہے۔وہ بہت بے قدری دیکھنے کے بعد اب اپنی قدر سے اوروں کو اپنی شناخت کرا چکا ہے۔اُس نے بڑی محنت سے یہ مقام پایا ہے۔شاعر نے محنت کی عظمت کو موضوع بنایا ہے کہ محنت اور لگن انسان کو ضرور کامیاب و کامران کراتی ہیں۔

''اہل علم و دانش کی خاموشی'' بھی وزیر آغا کی شاعری کا اہم موضوع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے عالموں کو اپنا علم عام کرنے کی تلقین کی ہے کیونکہ ایسے علم کا کوئی فائدہ نہیں جو اپنے تک محدود رہے۔ایسے علم کی مثال کھڑے پانی کی سی ہے جو بدبو دینے لگتا ہے۔علم کو دوسروں تک پہنچانے کی نصیحت کی گئی ہے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فیض یاب ہو سکیں۔حضورؐ کا فرمان ہے کہ:''علم کی طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔'' وزیر آغا کا کہنا ہے کہ عالم اس لیے خاموش ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ایسے ایسے اسرار و رموز سے واقف ہو جاتا ہے جو جاننے کے بعد انسان کائنات کی حقیقت جان لیتا ہے اور یہ سب حقائق جاننے کے بعد انسان کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔وہ دوسروں کو بتانا چاہتا ہے لیکن بتا نہیں پاتا۔اقبال ''بانگ درا'' عالم کے بارے میں کہتا ہے کہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(طلوع اسلام)

وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''انجام'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ کوئی عظیم شخص اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔موت اٹل ہے،کوئی اس سے بچ نہیں سکتا لیکن کسی اچھے انسان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی ہے۔اس کا خلاء کبھی پر نہیں ہو سکتا۔لوگ اس کی یاد میں نوحہ کناں ہوتے ہیں لیکن اب وہ قیامت تک واپس نہیں آ سکتا۔جاتے جاتے وہ دنیا کو بہت کچھ دے جاتا ہے۔وزیر آغا نے عالم کی خوبی یہ بیان کی ہے کہ اس کی موت سارے عالم کی موت کے برابر ہوتی ہے۔ایک عالم کے چلے جانے سے ایک بہت بڑا نقصان ہو جاتا ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔نظم ''عرفان'' جو کہ آپ کی شعری کتاب ''دن کا زرد پہاڑ'' میں شامل ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان علم کے سمندر میں کود پڑے تو ایک نہ ایک دن خود سمندر بن جاتا ہے۔یہاں عالم کو علم کا سمندر قرار دیا گیا ہے۔ناصر عباس نیر نے اس نظم کا تجزیہ کچھ یوں کیا ہے:

> شاعر بجرے میں بیٹھ کر کافی دیر سمندر کی مضطرب اور پُر اسرار دنیا پر غور کرتا رہتا ہے اور ایک مقام ایسا آتا ہے کہ شاعر کا ذہن سمندر کے پُر اسرار آہنگ کو محسوس کرنے لگتا ہے۔وہ سمندر کے ساتھ اپنی ذات کی یکتائی کا راز پانے لگتا ہے۔خود آشنائی اور بے خودی کی ملی جلی کیفیت میں ڈوبا شاعر بجرے پر سمندر کی سیاحت کا ارادہ تج دیتا ہے۔(۲۲)

شعری مجموعہ ''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں نظم ''اک نقش پیارا'' شامل ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ ایک عالم علم حاصل کر کے آگے علم پہنچاتا ہے جس سے معاشرے میں بہتری آتی ہے۔عالم بہت سے علم کے پیاسوں کی پیاس بجھاتا ہے۔کسی بھی قوم یا معاشرہ کے لیے عالموں کی حیثیت مسلّم ہے۔عالم کسی بھی قوم کے رہنما ہوتے ہیں،وہ اپنے علم کے ذریعے قوم کو سدھارتے اور سمجھاتے ہیں۔قوم کی رہنمائی کر کے قوم کو ترقی کی طرف گامزن کرتے ہیں۔

شاعر عالموں کی کمی کے باعث کچھ یوں کہتا ہے:

سمندر سے مشکیزہ بھر کر وہ بادل پکارا
کہاں ہیں پہاڑوں کی سوکھی چٹانیں
درختوں کے اکڑے ہوئے خشک ڈھانچے
تڑختی ہوئی شور کھیتوں کی مٹی؟ (۲۳)

(اک نقش پیارا)

''دیکھ دھنک پھیل گئی''میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''جی مانے تو چپکے سے'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے کہا ہے کہ دنیا میں اہل نظر مراد عالم بہت کم ہیں۔شاعر نے خود کو اہل نظر قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ مجھ سے علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ، میں تمھیں علم سکھانے کو تیار ہوں۔شاعر کہتا ہے کہ ہر انسان نے دنیا سے چلے جانا ہے۔یہ سچ ہے کہ ایک عالم کا اس دنیا سے چلے جانا بہت بڑا غم ہے لیکن دنیا میں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دکھ ہیں۔شاعر نے اہل علم لوگوں کی کمی اور ان کی موت سے ہونے وای مزید کمی کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان سے استفادہ کرنے کا بھی کہا ہے اور ان اہل نظر لوگوں کے جانے کے بعد مسلسل نوحہ کرنے کی بجائے دنیا کے دیگر مسائل پر غور وفکر کرنے کی نصیحت کی ہے۔

''ہوا تحریر کر مجھ کو''میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''ہوا تحریر کر مجھ کو''،''ترسیل''،''جھیلیں''،''چلو بھر پانی''اور''خوشبو'' شامل ہیں۔''ہوا تحریر کر مجھ کو''میں شاعر کہتا ہے کہ میں نے ساری زندگی علم حاصل کرنے میں صرف کر دی ہے۔میں نے علم کے ذریعے کائنات کے کئی راز جان لیے ہیں۔شاعر ایسے لوگوں سے مخاطب ہے جو ابھی کم علم ہیں کہ وہ اس سے علم حاصل کر کے اپنے علم کی پیاس بجھا لیں۔دراصل شاعر کم علم والوں کو نصیحت کر رہا ہے کہ وہ اپنے علم میں اضافے کے لیے اہل علم ونظر لوگوں کی تلاش کریں اور ان سے استفادہ کر کے اپنے علم میں اضافہ کریں اور کائنات کے اسرار ورموز جانیں۔''ترسیل''میں شاعر کہتا ہے کہ میں نے ساری زندگی علم وادب کے حصول کے لیے وقف کر دی ہے اور اس کے نتیجے میں مجھے کچھ نہ کچھ علم حاصل ہو گیا ہے۔شاعر اپنے علم کے ذریعے لوگوں کو خواب غفلت سے جگانا چاہتا ہے۔جو کچھ اس کی نظروں نے دیکھ لیا ہے اوروں کو دکھانا چاہتا ہے،وہ اپنے علم کو سینے میں لے کر مرنا نہیں چاہتا بلکہ اپنا علم دوسروں تک پہنچانا اور منتقل کرنا چاہتا ہے۔

شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

خموشی،راستہ مت روک میرا
کہ میں برکھا کی بھیگی چاپ بننا چاہتا ہوں
وہ بھیگی چاپ جو دستک میں ڈھل کر
مقفّل بستیوں کو نیند سے بیدار کرتی ہے (۲۴)

(ترسیل)

ایک اور نظم ''جھیلیں''میں شاعر کہتا ہے کہ ایک عالم بہت سے لوگوں کی پیاس بجھاتا ہے اور

جب خود پیاسا ہو جاتا ہے تو آسمان کی طرف رجوع کرتا ہے۔ آسمان اس کی پیاس بجھاتا ہے لیکن سب اپنی اپنی پیاس بجھ جانے کے بعد الگ ہو جاتے ہیں۔ شاعر نے عالم کو طالب علموں کی علم کی پیاس بجھانے والا قرار دیا ہے۔ عالم کو سمندر اور طالب علموں کو جھیلیں کہا ہے۔ طالب علم عالم سے علم لیتے ہیں جیسے سمندر سے بخارات بن کر پانی بادل بنتا ہے اور وہی بادل برس کر جھیلوں کی پیاس بجھاتا ہے یعنی جھیلوں کو بھرتا ہے۔ یوں سمندر ہی جھیلوں کی پیاس بجھانے کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح عالم علم کے پیاسوں کی پیاس بجھانے کا سبب بنتا ہے۔ ''چلّو بھر پانی'' میں شاعر ایک ایسے انسان کا ذکر کر رہا ہے جو کچھ علم جانتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ بہت عالم فاضل ہے کیونکہ اس کے اردگرد کوئی اس جتنا پڑھا لکھا نہیں ہے لیکن جب وہ عالموں کی دنیا میں پہنچتا ہے تو انتہائی شرمندہ ہوتا ہے کہ وہ خود کو کیا سمجھتا رہا حالانکہ اس کا علم تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ شاعر نے اس نظم میں بھی اہل علم و دانش لوگوں کی عظمت کو سراہا ہے۔ ''خوشبو'' میں شاعر اہل علم لوگوں سے کہتا ہے کہ علم حاصل کر کے دوسروں تک پہنچاؤ، اسے اپنے سینے میں قید نہ رکھو۔ ایسا عالم جو اپنا علم دوسروں تک نہ پہنچائے، اس کا علم خوشبو کی بجائے بدبو بن جاتا ہے۔ خوشبودار علم اس عالم کا ہے جو علم سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔ رکا ہوا اور ٹھہرا ہوا پانی بھی بدبودار ہو جاتا ہے، ایسے ہی رکا ہوا اور ٹھہرا ہوا علم بدبودار ہو جاتا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

ہوا خوشبو کا آنچل اوڑھ کر چلتی رہے
تو خود بھی خوشبو ہے
رکے تو سوکھتے جوہڑ کی کیچڑ میں دھنسا
اک چیتھڑا ہے (۲۵)

(خوشبو)

اس عنوان پر مشتمل نظم ''آزادی'' وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''گھاس میں تتلیاں'' میں موجود ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ عالم خاموش طبع ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لب کھلے تو اس پر جاہل لوگ ٹوٹ پڑیں گے کیونکہ عالم کی بات سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کم عقل اور کم علم لوگ عالم کی بات کو سمجھ نہیں سکتے بلکہ وہ اس کو منفی انداز میں لے کر اہلِ علم کا جینا دشوار کر دیتے ہیں۔ اس لیے اکثر اوقات اہلِ علم و نظر لوگ خاموش رہتے ہیں۔ وہ کسی بڑے ہنگامے اور فساد سے بچنے کے لیے اپنے لب نہیں کھولتے۔ ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں''، ''کہو وہ بات کیا ہوئی'' اور ''کتنی بار بلایا میں نے'' شامل ہیں۔ ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں'' میں وزیر آغا نے کہا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں مسلسل علم سیکھا ہے۔ اب میں اس علم کی بدولت بہت کچھ جان چکا ہوں۔ میں نے تخلیق و تحقیق کے سفر میں پرانے علوم کا مطالعہ کیا۔ تحقیق

کے ذریعے ستاروں تک پہنچا، نظام افلاک سمجھا۔ طویل عرصہ تعلیم کے حصول میں لگایا۔ ازل سے ابد تک کے بارے میں علم حاصل کیا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ سارا تعلیمی سفر میں نے پیدل طے کیا ہے۔ پیدل سفر طے کرنے کے دو فائدے ہیں۔ ایک انسان فطرت کے مناظر سے اپنی جستجو میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان سفر کے ہر ایک پہلو پر تحقیق کر کے تخلیق کرتا ہے۔ انسان پیدل چلتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر اپنی مرضی سے اپنی رفتار کم اور زیادہ کر کے تحقیق کر سکتا ہے۔ شاعر نے ماضی کے عظیم مسلمانوں (جن میں سائنس دان، فلاسفر، عالم دین اور دیگر علوم کے عالم موجود تھے) کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے ان کے طرز عمل پر ساری زندگی عمل کرتے ہوئے علم حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بہت سے کائناتی اسرار و رموز جان گیا ہوں اور ہر طالب علم کو یہی رستہ اختیار کرنے کا درس دیتا ہوں۔ شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

سفر ہم نے کیا ہے
یہ تم جانتے ہو
مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں
تمھیں اس کی خبر شاید نہیں ہے (۲۶)
(مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں)

شاعر نے زندگی بھر محنت کر کے علم حاصل کیا ہے۔ پروین طاہر نے اس نظم کے بارے میں کچھ یوں تجزیہ کیا ہے:

> یہ سفر جس کے لیے پیدل کا راستہ اختیار کیا گیا ہے محض مہکتے سبزہ زاروں، جنگلوں، سمندروں اور صحراؤں کا سفر نہیں، یہ علم، جستجو، تحقیق او رتخلیق کا سفر بھی ہے جہاں مسافر، شاعر کا طبعی وجود نہیں، وہ اس کے اندر کا انسان ہے، اس کا ہم زاد ہے۔ پیدل چلنے کے عمل میں دو طرح کے محرک کار فرما ہوتے ہیں: اول تو سفر کا سارا کریڈٹ سفر کرنے والے کی ذاتی توانائی اور ذوق و شوق کو جاتا ہے اور دوسرے پیدل چلنے میں سارے مناظر کا بغور تفصیلی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ آپ جس منظر یا مقام پر رکنا چاہیں، رک سکتے ہیں کیونکہ آپ کو اپنی رفتار اور خواہش، دونوں پر اختیار ہے اور پھر یہ سفر تو علم و آگہی اور جستجو کا سفر ہے۔ (۲۷)

نظم ''کہو وہ بات کیا ہوئی'' میں شاعر کہتا ہے کہ عالم اپنے علم کو لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے

لیکن ساتھ ہی اسے اس بات کا خوف بھی ہوتا ہے کہ لوگ نہ جانے حقیقی علم جان کر کیا ردّعمل کریں گے۔ دراصل کائنات کے حقائق اتنے تلخ ہیں کہ اچانک ان کا کسی شخص پر انکشاف اسے ٹھیک ٹھاک دھچکا پہنچا سکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عالم یہی سوچ کر خاموش رہتا ہے اور چاہتے ہوئے بھی وہ اپنا علم دوسروں تک پہنچا نہیں سکتا۔ وہ سارے اسرار و رموز اپنے دل میں ہی دبائے رکھتا ہے۔ اسی لیے وہ سخت تکلیف میں رہتا ہے۔ ''کتنی بار بلایا میں نے'' میں شاعر کہتا ہے کہ عالم اپنے دل کی باتیں کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ جو کائناتی اسرار جان گیا ہے، دوسرے بھی وہ جان جائیں لیکن الفاظ اس کے لب تک آ کر رک جاتے ہیں۔ اس کے اندر شور بپا رہتا ہے۔ اس کا علم باہر نکلنے کو بے تاب ہوتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کی بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا یا لوگ وہ سب حقائق برداشت نہیں کر پائیں گے۔ یہ سب سوچ کر وہ اپنے ہونٹ بند رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بھی کئی ایسے حقائق جانتا ہوں لیکن میری بات سمجھنے والا کوئی موجود ہی نہیں ہے ورنہ بات تو کئی بار میرے لبوں تک آئی ہے۔

''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''وہ آزاد کیسے ہوئی'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ جب انسان کائنات کے اسرار و رموز اور اس کی تخلیق کی وجہ جان جاتا ہے، جب اس کی حقیقی آنکھ کھلتی ہے تو اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے کیونکہ یہ سب راز بہت ہی ہلا دینے والے ہیں۔ انسان کو جب اپنی اور کائنات کی تخلیق کا علم ہو جاتا ہے تو وہ اصل انسانیت کو سمجھ پاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں اس درجے پر پہنچا تو میری حالت بھی ایسی ہو گئی تھی، مجھ پر بھی خاموشی طاری ہو گئی تھی، میری زبان بھی گنگ ہو گئی تھی لیکن اب کسی حادثے یا واقعے نے مجھے اس گہری خاموشی سے نکالا ہے۔ میں پھر بولنے اور سننے لگا ہوں، اب میں اپنا علم لوگوں تک پہنچا رہا ہوں۔ ''کاسہ شام'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں نظم ''چلو آرام کرتے ہیں'' شامل ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ عالم شخص کو چاہیے کہ وہ اپنا علم دوسروں تک پہنچائے تا کہ دوسرے لوگ اس سے فیض یاب ہو سکیں۔ ایسے علم کا کوئی فائدہ نہیں جو اپنے تک محدود رکھا جائے۔ شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

وہ سب کچھ عام کرنا ہے
جسے ہم نے چھپا کر
دل کے اہراموں میں اپنے
بند رکھا ہے (۲۸)

(چلو آرام کرتے ہیں)

وزیر آغا کی شاعری کا ایک اہم موضوع ''صنعتی ترقی کے انسان اور ماحول پر پڑنے والے

اثرات'' ہے۔انہوں نے صنعتی ترقی کو انسان کے لیے بہت نقصان دہ قرار دیا ہے۔اسے حسن اور اخلاقی اقدار کا قاتل گردانا ہے۔ڈاکٹر ساجد امجد کے بقول:''صنعتی معاشرے کی مصروفیت نے ہمیں بہت سی روحانی قدروں سے بے بہرہ کر دیا ہے۔اب وہ قدریں معاشرہ سے اٹھتی جا رہی ہیں جو ایک مذہبی معاشرے میں ہوتی ہیں۔(۲۹) اس ترقی نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے۔انسان کو دولت سے اس حد تک جوڑ کے رکھ دیا ہے کہ اب انسان دوسرے انسان کو پیسے سے تولتا ہے۔اخلاقی اقدار کی پستی کی وجہ صنعتی ترقی کو کہا گیا ہے۔ڈاکٹر انور سدید وزیر آغا کی نظموں میں موجود اس عنوان کے بارے میں کچھ یوں رائے دیتے ہیں:''وزیر آغا کی نظموں کا مطالعہ کریں تو یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ بیسویں صدی کی میکانکی زندگی انسان کو جس مشینی عمل سے گزار رہی ہے اور اس کا شدید ردِ عمل ان کے ہاں موجود ہے۔''(۳۰) اقبال نے بھی صنعتی ترقی کو انسانی زوال کا سبب قرار دیا ہے جس کے شور اور دھوئیں نے انسان کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے،انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے۔انور مسعود صنعتی ترقی پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

صنعتی پیشرفت کے صدقے
موسم خوشگوار پایا ہے
شہر میں اب دھوئیں کی برکت ہے
ایسا لگتا ہے ابر چھایا ہے(۳۱)

مجموعہ نظم ''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''جب اور اب'' اور ''بازگشت'' شامل ہیں۔''جب اور اب'' میں شاعر کہتا ہے کہ ایک وقت تھا کہ دنیا میں امن وسکون تھا۔اس لیے ہر انسان کا دل پرسکون اور خوش حال تھا۔اب دنیا میں امن نہیں رہا،اس لیے دل بے سکون ہے۔اس بدامنی کی وجہ شاعر نے صنعتی ترقی کو قرار دیا ہے۔شاعر کے نزدیک صنعتی ترقی نے دنیا سے امن کو بدامنی میں بدل کے رکھ دیا ہے۔شاعر کچھ یوں کہتا ہے:

اور اب دنیا
لاکھوں آوازوں کا اک گہوارہ ہے
ہر جانب اک شور بپا ہے
دل کی اب آواز کوئی سنتا ہی نہیں(۳۲)

(جب اور اب)

نظم ''بازگشت'' میں شاعر نے کسی جنگ کا ذکر کیا ہے جس نے ہر طرف تباہی و بربادی پھیلائی تھی۔شاعر کہتا ہے کہ یہ سب تباہی و بربادی صنعتی ترقی کی وجہ سے ہوئی۔انسان نے مہلک اور خطرناک قسم

کے ہتھیار بنا کر دنیا کا امن تباہ کر دیا ہے۔ صنعتی ترقی نے انسان کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔

''دن کا زرد پہاڑ'' کے نام سے آپ کی شعری کتاب میں موجود نظم ''کوہ ندا'' میں شاعر نے کہا ہے کہ آج کا انسان دنیا دار ہو گیا ہے۔ صنعتی ترقی کے شور شرابے پر تنقید کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے ک انسان صبح سویرے اپنے خالق کی آواز نہیں سنتا، اپنے خالق کے حکم پر اس کے ذکر کے لیے نہیں جاگتا لیکن اپنے روزگار اور دنیا کمانے کے لیے وقت پر جاگ جاتا ہے۔ شاعر نے آج کے انسان کی مادیت پرستی پر گہری چوٹ کی ہے۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''''کوہ ندا'''' تلاش معاش یا رزق کی ازلی مجبوری اور صنعتی ترقی کے نتیجے میں انسان کی بے توقیری کے ساتھ ساتھ روحانی رشتوں کی شکستگی کی تصویریں دکھاتا ہے جن کا مشاہدہ ہم روز ہی کرتے رہتے ہیں لیکن اس طرح کی موثر اور المناک تمثیلوں کے امتزاج سے ان کا اظہار ہمارے بس میں نہیں۔ (۳۳)

اسی مجموعہ کی ایک نظم ''ترغیب'' میں شاعر نے فطرتی مناظر کی عکاسی کی ہے۔ جنگلات کے کٹاؤ اور آلودگی کے مسئلہ کو بیان کیا ہے اور ان سب کی وجہ صنعتی ترقی کو ٹھہرایا ہے۔ صنعتوں کے دھوئیں سے فضا آلودہ ہو رہی ہے، ان صنعتوں سے خارج ہونے والے فاضل مادّے سے پانی آلودہ ہو رہا ہے۔ لوگ دیہاتوں سے نقل مکانی کر کے اچھے روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کر رہے ہیں جن سے شہروں میں جنگلات کا کٹاؤ عام سی بات بن کے رہ گیا ہے، غرضیکہ صنعتی ترقی آلودگی اور جنگلات کے کٹاؤ کا باعث بن رہی ہے جو کہ انسان کی صحت کے لیے بہت مُضر ہے۔ اس مجموعہ کی نظم ''المیّہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ قدرتی مناظر کے لگاؤ نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے اور انسان فطری مناظر کے مشاہدے سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اب آلودگی کے باعث تر و تازہ ہوا نایاب ہو گئی ہے، اب یہ تازہ ہوا صرف قدرتی مناظر والے علاقوں میں پائی جاتی ہے جو اِن فطری علاقوں میں جا کر ان مناظر کا غور و فکر سے مشاہدہ کرے، وہ بہت سے راز جان لیتا ہے۔ اس نظم میں بھی صنعتوں کے باعث شہروں میں آلودگی پھیل جانے کا ذکر ہے جس کی وجہ سے شہر تر و تازہ ہوا سے عاری ہو گئے ہیں۔ ایک اور نظم ''ڈھلوان'' میں صنعتی ترقی کا ردّ کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے کہ صنعتی ترقی نے انسان کے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور اس کے کان بھی اتنا شور سنتے ہوئے بھی بے حس ہو گئے ہیں اور اس کی زبان کو بھی صنعتی ترقی نے پیسے کا لالچ دے کر گنگ اور خاموش کر دیا ہے۔ نظم ''پیش گوئی'' میں شاعر کو مستقبل انتہائی بھیانک دکھائی دے رہا ہے اور اس کی وجہ ایٹمی توانائی کا پھیلاؤ اور صنعتی ترقی ہے۔ نظم ''اگنی کنڈ'' میں شاعر نے کہا ہے کہ ماحولیاتی آلودگی کے باعث آسمان

بھی آگ برسا رہا ہے۔

''گھاس میں تتلیاں'' کی نظم ''الاؤ'' میں شاعر کہتا ہے کہ زمین نے انسان کو مختلف آفتوں سے محفوظ رکھا اور آرام وسکون عطا کیا۔ انسان بہت بہادر تھا لیکن وقت اور حالات نے انسان کو کمزور سے کمزور تر بنا دیا۔ انسان آہستہ آہستہ معاشرتی و معاشی مسائل میں گھرتا چلا گیا۔ انسان اپنی اصل سے ہٹتا گیا، زمانے کے دکھوں نے اسے بالکل بدل کے رکھ دیا، اسے اندر سے توڑ دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دوبارہ اپنی اصلیت کی طرف جاؤ، خود کو سمیٹو۔ دوبارہ امن بحال کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کے باہر آوازیں جتنی بڑھی ہیں، وہ اتنا ہی اندر سے خاموش ہو گیا ہے، اگر انسان چاہے تو وہ اپنے ماضی کی طرح دوبارہ امن لا سکتا ہے، آبادی کے دباؤ میں کمی کر سکتا ہے اور دیگر انسانی مسائل کو بھی ختم کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اپنی اندر کی قوت کو جگاؤ جو تمھیں ان مسائل سے نکالے۔ ساری دنیا کے مسائل ایک سے ہیں، مل جل کر ان پر قابو پاؤ۔ سب سے بڑا انسانی مسئلہ جو اس نظم میں بیان کیا گیا ہے وہ صنعتی ترقی کے باعث آنے والا انقلاب ہے جس نے انسان کو انسان سے اور قدرت سے دور کر کے رکھ دیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اگر انسان دوبارہ اسی قدرتی ماحول کو اپنا لے تو اس کے اکثر مسائل کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ناصر عباس نیّر اس نظم کے بارے میں کچھ یوں کہتے ہیں:

> نظم ''الاؤ'' میں شاعر نے انسان سے اس کی آواز کے چھن جانے کا ذکر کیا تھا۔ انسان کے باہر آوازوں کا شور جتنا بڑھتا گیا ہے، انسان سے اس کی آواز اتنی ہی دور ہوتی چلی گئی ہے۔ بیسویں صدی میں تو آوازیں بہت شدید اونچی ہو گئی ہیں اور غالباً اسی وجہ سے انسان کے داخل اور خارج کا فاصلہ بھی بڑھا ہے۔ (۳۴)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صنعتی ترقی کے شور نے انسان سے اخلاقی اقدار کو چھین لیا ہے۔ ناصر عباس نیّر مزید لکھتے ہیں کہ:

> اس نظم میں آج کے عالمی انسانی مسائل، آبادی کا دباؤ، فطرت کی رسوائی و پامالی، ماحولیاتی آلودگی وغیرہ ایک خاص شعری اسلوب میں پیش ہوئے ہیں ان مسائل نے انسان کے جذبہ وسوچ کے پختہ نظام کو متاثر کیا ہے۔ ان مسائل سے نمٹتے ہوئے انسانی سماج تہذیب و معاشرت کی ایک نئی سمت میں سفر پیما ہو سکتا ہے مگر اس کے لیے انسان کو اپنے گزشتہ تخلیقی تجربات سے حاصل کی ہوئی ساری شکتی بروئے کار

لانا ہوگی۔(۳۵)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیر آغا نے اس نظم میں اپنے دور کے معاشرتی مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ارمان نجمی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''الاؤ'' کا کینوس زیادہ وسیع ہے اور اس کی تہ میں گہرا تاریخی شعور کار
فرما ہے گرچہ یہاں انسان سے براہ راست خطاب ہے لیکن اس
میں کہیں بھی خطیبانہ آہنگ یا طوفانی گھن گرج نہیں ہے بلکہ اک خود
سوزی کی کیفیت ایک حساس اور دردمند دوست کا دکھ بھرا سوال ہے:

کہاں تم نے کھودی اپنی صدا
بولتے کیوں نہیں ہو

لیکن وہ فطرت سے دور ہو کر اپنی پہچان ہی کھو چکا ہے اس کا جواب کیا
دے گا۔سچ تو یہ ہے کہ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے کہ اس نے
وہ صدا کہاں کھودی ہے جو ہمیشہ سچائی کی طرف بلاتی ہے۔(۳۶)

''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''اک کف بھری پھنکار''، ''نار ہوا اور ناری''، ''بگھی'' اور ''دکھ'' شامل ہیں۔''اک کف بھری پھنکار'' میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔شاعر دو زمانوں میں بٹ گیا ہے۔پہلا زمانہ وہ جب شاعر گھوڑے پر سفر کرتا تھا اور اب دنیا کی ترقی کی وجہ سے گھوڑے کی جگہ بگھی نے لے لی ہے۔دنیا کی ترقی شاعر کو ناپسند ہے، اسے پرانا سادہ زمانہ پسند ہے۔شاعر نئی ایجادات پر پریشان اور پُرنم ہے۔''نار، ہوا اور ناری'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان آلودگی کے ذریعے ہوا کی موت کی وجہ بن رہا ہے اور یہ آلودگی صنعتی ترقی کی پیداوار ہے۔صنعتوں اور فیکٹریوں نے آلودگی کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔مٹی، ہوا اور پانی تینوں آلودہ کر دیئے ہیں۔انسانی صحت کو تازہ ہوا، صاف پانی اور زمینی صفائی سے محروم کر دیا ہے۔''بگھی'' میں شاعر نے دنیا کو بگھی قرار دیا ہے جس پر ہم سب سوار ہیں۔شاعر کہتا ہے اب یہ بگھی خستہ حال ہو چکی ہے، لڑکھڑا رہی ہے۔زمین کے ساتھ انسان کے برے رویہ مراد صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ زمین کی قسمت میں قدرتی حادثات پر شاعر نے دکھ کا اظہار کیا ہے۔انسان نے صنعتی ترقی کرتے ہوئے دنیا کی خوب صورتی اور حسن کے خاتمے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے حسن میں روز بروز کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔شاعر کہتا ہے:

اس بگھی کے

گھسے پٹے جثّے سے نکلتی
ٹھنڈی آہیں
گرم آہیں
ہم عاجز کب سن سکتے ہیں (۳۷)
(بگھی)

''دکھ'' میں شاعر نے زمینی فضائی آلودگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ دکھ یعنی صنعتوں سے نکلنے والا دھواں آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ دھواں انسانی مسائل کو بڑھا رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان نے اپنی معیشت مستحکم کرنے کے لیے اپنے لیے دکھوں کے دروازے کھول لیے ہیں۔

''یہ آواز کیا ہے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''یہ آواز کیا ہے''، ''اور اب سنا ہے'' اور ''تم اگاؤ دھویں کے مرغولے'' شامل ہیں۔ ''یہ آواز کیا ہے'' میں شاعر نے صنعتی ترقی کی وجہ سے صنعتوں میں پیدا ہونے والے شور کے بارے میں پوچھا ہے کہ یہ آواز کیا ہے؟ جس نے انسانی زندگی کو بہت سے مصائب و مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس صنعتی ترقی کی وجہ سے پیدا ہونے والے شور نے زمین پر آلودگی پھیلا رکھی ہے۔ زمین انسان سے سوال کر رہی ہے کہ تم اس آواز کو کیوں سن نہیں پا رہے، یہ آواز زہر آلود ہے، یہ تمھاری قاتل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زمین جو کہ ہر طرف سے آلودگی کا شکار ہے، اندر ہی اندر غصے سے بھر رہی ہے، اندر ہی اندر کڑھتی جا رہی ہے اور چیخ چیخ کر انسان کو پکار کر کہہ رہی ہے کہ کہاں ہو تم سب اور کیوں میری پکار نہیں سنتے۔ علی محمد فرشی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> اس نظم کا موضوع صنعتی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی Pollution ہے جو نہ صرف زمین کی ظاہری خوبصورتی کو متاثر کر رہی ہے بلکہ جس نے اوزون کی تہ میں شگاف ڈال کر زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اس نظم کا دوسرا کردار انسان ہے جو اس زمین پر دائمی سزا کاٹ رہا ہے۔ ایسی سخت سزا جو اس کی موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوگی۔ (۳۸)

نظم ''اور اب سنا ہے'' میں شاعر نے صنعتی آلودگی کے پھیلاؤ کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے زمینی ماحول خراب ہو رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زمین انسانی صنعتی ترقی سے بیزار ہے۔ وہ انسانی سلوک کو دیکھ کر ختم ہو جانا چاہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ زمین پر آلودگی اور اس آلودگی کا سبب بننے والی صنعتوں پر کڑی چوٹ کی گئی ہے۔

نظم ''تم اگاؤ دھوئیں کے مرغولے'' میں شاعر کہتا ہے کہ زمیں انسان سے اس طرح ناراض ہے جس طرح ایک ماں اپنے بچے سے ناراض ہوتی ہے۔ زمیں کہتی ہے کہ رعد، ہوا اور سُموں نے مجھ پر ظلم ڈھائے ہیں۔ ان سب نے مجھے اپنا دشمن سمجھ کر روندا۔ شعاعوں اور زلزلوں نے بھی مجھے شروع سے تنگ کر رکھا ہے۔ زمین مزید کہتی ہے کہ اب انسان بھی میرے دشمن بن گئے ہیں۔ ایٹمی توانائی اور صنعتی ترقی کے نام پر انہوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی ہے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں کر کے میرا حسن ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں اظہار کیا ہے:

اور اب آ گئے ہو تم سارے
گولیوں اور بموں کے بیج لیے
ہل کدالوں سے لیس ہو کر
آ گئے ہو
تو جوت لو مجھ کو
اور اگاؤ دھویں کے مرغولے (۳۹)
(تم اگاؤ دھوئیں کے مرغولے)

نظم کے یہ اشعار زمین کا دکھ ہمیں سنا رہے ہیں۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

''تم اگاؤ دھوئیں کے مرغولے'' میں زمین براہِ راست اپنے باشندوں سے مخاطب ہے جیسے روٹھی ہوئی ماں اپنے بچوں پر غصہ اتارتی ہے لیکن ممتا کا دامن نہیں چھوڑتی ہے۔ زمین اپنے دکھ کو زبان دے کر کہہ رہی ہے کہ میں تو پہلے سے ہی پریشان حال ہوں اور ہر طرح سے ستم گروں کا ہدف ہوں اور اب تم بھی میری جان کے درپے ہو گئے ہو تو کر لو اپنی من مانی۔ (۴۰)

شعری مجموعہ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''چلو ان کچے رستوں پر چلیں''، ''پروجیکٹر''، ''کیسی یہ مخلوق ہے''، ''تیز تر روشنی''، ''ایک منظر''، ''گم آندھی'' اور ''چلو ہم بھی وہاں پہنچیں'' شامل ہیں۔ ''چلو ان کچے رستوں پر چلیں'' میں شاعر گاؤں کی جانب جانے کی خواہش کرتا ہے جہاں امن و سکون ہے، شور شرابہ اور آلودگی نہیں ہے۔ شہروں کے مسائل کی وجہ سے شہر سے بے زاری کا اظہار کیا گیا ہے۔ شاعر شہری زندگی سے اکتایا ہوا ہے۔ وزیر آغا نے صنعتی ترقی کی وجہ سے شہروں کی حالت زار پر آنسو بہائے ہیں، اسی لیے وہ شہری زندگی سے متنفر ہیں۔ ''پروجیکٹر'' میں شاعر نے سائنسی ترقی پر طنز کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ

سائنسی ترقی نے جہاں انسان کو بہت سے فائدے پہچائے ہیں، وہیں اس نے انسان کو بہت سے نقصانات بھی عطا کیے ہیں۔شاعر نے ایک سائنسی ایجاد پروجیکٹر کو موضوع بنا کر سائنسی ایجادات کے فوائد ونقصانات سے آگاہ کیا ہے۔''کیسی یہ مخلوق ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ یہ انسان کیسی مخلوق ہے جس نے ہر حسین شے کو تباہ کر دیا ہے۔جنگلات جو کہ فطرتی حسن کا باعث ہیں، انہیں کاٹ ڈالا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ یہ مخلوق گمراہ ہوگئی ہے، راہ راست سے بھٹک گئی ہے، محنت کرنے سے کترانے لگی ہے، فرقوں میں بٹ گئی ہے۔زمین جو کہ پہلے ہی قدرتی آفات کی زد میں تھی، اب انسان نے بھی اسے تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔''تیز تر روشنی'' میں شاعر کہتا ہے کہ رات کا لطف دینے والا منظر اب دکھائی نہیں دیتا۔سائنسی ایجادات اور ترقی نے رات کے وقت مصنوعی روشنی کے ذریعے رات کے اصل منظر کو ہم سے چھین لیا ہے۔اب تو ہم رات دیکھنے سے بھی محروم ہوگئے ہیں۔دراصل شاعر نے سائنسی ترقی میں ضرورت سے زیادہ ترقی اور نقصان دہ اشیاء بنانے پر تنقید کی ہے۔سائنس نے بہت سی ایسی اشیا تخلیق کر لی ہیں جنہوں نے دنیا کے قدرتی رنگ اور لطف کا خاتمہ کر دیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ:

اس تیز ہوتی روشنی میں
مشعلیں بن کر جلے
تو رات کو بھی دیکھنا
دشوار تر ہوتا گیا(۴۱)

(تیز تر روشنی)

نظم ''ایک منظر'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان نے گاڑی بنائی اور اس کے ذریعے آلودگی پھیلنے لگی۔فضا میں دھوئیں اور گرد کی تہہ جم گئی اور اس سے انسان بہت سے مسائل کا شکار ہوا۔شاعر نے صنعتی اور سائنسی ترقی کے مضر اثرات پر تنقید کی ہے۔''گم آندھی'' میں شاعر نے آلودگی کے مسئلے کی نشان دہی کی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ دور جدید کا اہم مسئلہ آلودگی ہے جس نے انسان کا جینا دشوار کر دیا ہے۔اس سے قبل انسان پر فضا اور خوش گوار موسم میں سکھ سے رہتا تھا۔اب اس آلودگی نے انسان کے سانس کو روک رکھا ہے۔دراصل شاعر نے صنعتی ترقی کے انقلاب کے منفی پہلوؤں کی نشان دہی کر کے ہماری توجہ اس کی طرف دلائی ہے۔''چلو ہم بھی وہاں پہنچیں'' میں شاعر کہتا ہے کہ صنعتی ترقی کے شور نے انسان کو خاموش کر کے رکھ دیا ہے۔ہر طرف اونچی اونچی عمارات نظر آتی ہیں۔انسان معاشی ترقی کے حصول کی خاطر شب و روز بھاگ رہا ہے۔صنعتی ترقی کے نقصانات پر اس نظم میں بحث کی گئی ہے۔

''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر لکھی گئی نظموں میں ''دھوکا''، ''بتا اے شہر''، ''کوئی نہیں تھا''

اور ''شہر میں آتے ہی'' شامل ہیں۔ ''دھوکا'' میں شاعر کہتا ہے کہ مغربی تہذیب دھوکا ہے، اس تہذیب نے انسان کی عقل پر پردہ ڈال رکھا ہے اور انسان اس دھوکے کا شکار ہو کر گمراہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مغربی تہذیب صنعتی ترقی کے ذریعے پھلی پھولی ہے یعنی صنعتی ترقی نے ایسی ایسی ایجادات کیں جس سے مغربی تہذیب پروان چڑھی اور اس کے سحر میں انسان اخلاقی لحاظ سے پست سے پست ہوتا چلا گیا۔ ''بتا اے شہر'' میں شاعر نے شہروں میں بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ شہروں کی آبادی بڑھنے کی وجہ صنعتی ترقی ہے جس نے ہر انسان میں پیسے کی دوڑ پیدا کر دی ہے۔ لوگ بہتر طرز انداز کی زندگی کی خاطر مشین بن گئے ہیں۔ اخلاقیات روز بروز گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ ہر رشتے کو پیسے میں تولا جانے لگا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

بتا اے شہر
تیری نیم روشن، تنگ
بل کھاتی ہوئی گلیوں میں
یہ کیسا تعفّن بھر گیا ہے (۴۲)

(بتا اے شہر)

ایک اور نظم ''کوئی نہیں تھا'' میں شاعر کہتا ہے کہ ہر طرف خوفناک آوازوں کا کہرام مچا ہوا ہے۔ ہر کوئی ان آوازوں کے خوف سے اپنے اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس کے خلاف آواز بلند کرے۔ ہر کوئی بزدل اور ڈرپوک بن کر اپنی اپنی زندگی میں مگن ہے اور یہ صنعتی شور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ''شہر میں آتے ہی'' میں شاعر کہتا ہے کہ شہر میں آلودگی، دھواں اور شور شرابہ انسانی صحت کے دشمن ہیں۔ بظاہر رونق والی زندگی لیکن باطن میں زہریلی آب و ہوا کی حامل زندگی ہے۔ شاعر اس لیے شہری زندگی کو ناپسند کرتا ہے اور صنعتی ترقی پر خوش ہونے کی بجائے پریشان اور نالاں ہے۔

''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''اک کتھا انوکھی''، ''چرنوبل'' اور ''صحرا کی بارش'' شامل ہیں۔ ''اک کتھا انوکھی'' میں شاعر نے کہا ہے کہ صنعتی ترقی کے دَور کے انسان نے فطرت کو پامال کر کے رکھ دیا ہے یوں انسان فطرت اور قدرت سے دور تو ہو ہی رہا ہے، اپنے اندر مراد اخلاقی اقدار سے بھی دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ صنعتی دَور نے انسان کو آرام و سکون سے دور کر دیا ہے۔ انسان مشین بن کر رہ گیا ہے۔ صنعتی ترقی سے انسان کے اندر اور باہر کا فاصلہ بڑھا۔ انسان معاشی حالات کو بہتر کرنے کے چکر میں اخلاقی حالت کو تباہ کر بیٹھا ہے۔ انسان جمع تفریق کے چکر میں مبتلا ہو گیا ہے۔ پیسہ اس کے لیے ہر چیز بن چکا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان چاہے تو امن قائم کر سکتا ہے لیکن اس کی خواہشات نے اسے امن قائم کرنے سے روکا ہوا ہے۔ اس کے

نتیجے میں دنیا بدامنی کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔ناصر عباس نیّر نے اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں لکھا ہے:

''اک کتھا انوکھی'' (۱۹۹۰ء) میں وزیر آغا نے ''اندر'' اور ''باہر'' کی خلیج کے کشادہ ہو جانے سے انسانوں کو ملنے والے کرب کو موضوع بنایا ہے۔انہوں نے ایک اساطیری کردار کی مدد سے جدید انسان کی شکستگی کو پیش کیا ہے۔اسطورہ کے مطابق ایک دیوتا کائنات میں امن وآشتی قائم کر کے ایک پرسکون مقام پر ایک غار میں لمبی نیند سو جاتا ہے مگر جلد ہی امن عامہ تباہ ہو جاتا ہے۔سب ذی روح دیوتا کو جگانے جاتے ہیں اور اسے تباہی و غارت گری کی داستانیں سناتے ہیں،مگر وہ داخلی اطمینان میں مست،آنکھیں نہیں کھولتا۔بالآخر اس کا نیند کا خمار اتر جاتا ہے اور اپنے پیچھے انسانوں پر ٹوٹنے والی قیامت کا سن کر تڑپ اٹھتا ہے۔(۴۳)

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وزیر آغا نے معاشرتی انتشار اور بد امنی کو اس نظم کا موضوع بنایا ہے۔ناصر عباس نیّر مزید لکھتے ہیں کہ:

صنعتی ذہن نے فطرت کو دھات میں بدل دیا ہے۔قدیم زمانے کا انسان مصوری اور سنگ تراشی میں فطرت کے خام مواد کو کچھ اس طور استعمال کرتا تھا کہ فطرت کا جمال خود اجاگر ہو جاتا تھا اور یوں انسان فطرت سے ایک نئی سطح پر وابستہ ہونے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔مگر صنعتی انسان نے فطرت کو رسوا اور پامال کیا ہے۔اس طرح وہ فطرت سے دور تو ہوا ہی تھا اپنے ''اندر'' سے بھی کٹ گیا ہے۔(۴۴)

ناصر عباس نیر نے انسانی صنعتی ترقی کو ترقی کی بجائے اخلاقی زوال کہا ہے۔ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

اس نظم کی ابتدا تہذیبی ارتقا کی پہلی منزل یعنی جنگل کی تہذیب کے حوالے سے ہوتی ہے۔اس وقت اس کی ضروریات محدود تھیں اور فطرت سے اس کا رشتہ بہت مضبوط تھا بلکہ ان کے درمیان خاموش

مفاہمت بھی تھی۔فطرت کی گود میں اسے زندگی کی تمام آسائشیں میسر
تھیں۔اس کے بعد زرعی دور سے گزرتی ہوئی تہذیبی زندگی کی ہ رشتہ
تصویریں دکھائی گئی ہیں۔گویا یہ وہ دور تھا جب باہر اور اندر میں ایک
توازن قائم ہو چکا تھا اور انسان کے وجود میں اس توازن کے طفیل ہم
آہنگی تھی۔لیکن صنعتی تہذیب کے پاؤں پڑتے ہی یہ دنیا رفتہ رفتہ سمٹتی
گئی، یہاں تک کہ ست جگ کا خاتمہ ہو گیا اور کل جگ آ گیا۔(۴۵)

نظم ''چرنوبل'' میں شاعر کہتا ہے کہ ایٹمی توانائی نے زمین اور اس پر رہنے والوں پر مضر اثرات مرتّب کیے ہیں۔جہاں اس ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جاتا ہے وہاں کی ہوا زہر آلود ہو جاتی ہے۔وہاں زندگی کے اثرات باقی نہیں رہتے اور وہاں جاندار سانس نہیں لے سکتے۔شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

ہوا اب خشک بو ہے
قہر ہے
یہ خوب رو پاگل ہوا
اب زہر ہے(۴۶)
(چرنوبل)

نظم کی یہ سطور واضح کرتی ہیں کہ صنعتی ترقی نے فضا کو آلودہ کر رکھا ہے۔ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

''چرنوبل''اس جوہری حادثہ کی یاد دلاتی ہے جو اسی نام کے شہر
میں، چند سال قبل پیش آیا تھا۔یہاں اس کے سیاسی مضمرات سے کوئی
بحث نہیں بلکہ اس کے انسانی پہلو کو زیرِ غور لایا گیا ہے یعنی اس تاب
کاری کے مضر اثرات کی تجسیم کی گئی ہے جو ارض و سما کی وسعتوں میں
پھیل کر لامحدود ہو جاتی ہے اور جس کا زہر آئندہ نسلوں کے رگ و پے کو
بھی نہیں بخشتا۔(۴۷)

ایک اور نظم ''صحرا کی بارش'' میں شاعر کہتا ہے کہ صنعتی دور کا آغاز کرنے والے انسانیت کے دشمن تھے۔اس دَور کے شروع ہونے کے بعد دنیا اخلاقی اقدار سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔انسان کو مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔شاعر کو ایسے شخص کی تلاش ہے جو دنیا کو بچا لے، جو دنیا والوں کے مسائل حل کرے، انسان کو دوبارہ

امن والے دور میں لے جائے۔

''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''چرنوبل دس سال بعد'' اور ''بادل'' شامل ہیں۔ ''چرنوبل دس سال بعد'' میں شاعر کہتا ہے کہ وہ شہر جو صنعتی اور ایٹمی دور کی تباہی کا شکار ہوا، اب دس سال بعد وہاں لوگ آباد ہونے شروع ہو گئے ہیں لیکن ابھی بھی شاید وہاں بچوں کو لانے کی پابندی ہے کیونکہ وہاں کے حالات اتنے اچھے ابھی نہیں ہوئے۔ شاعر نے ایٹمی و صنعتی ترقی کو ترقی نہیں انسانی زندگی کی تنزلی قرار دیا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اڑتی تتلی کی علامت کے ذریعے ساری انسانیت کے مستقبل کا سوال اٹھایا ہے۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

> ''چرنوبل دس سال بعد'' اس موضوع پر آپ کی دوسری نظم ہے۔ اس نظم میں پوری انسانیت کے مستقبل کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ جس طرح کی تخریب کاری چرنوبل کا مقدر بنی اور تاب کاری نے جس طرح ہر ذی روح، نباتات، حیوانات سمیت، کو آزار پہنچایا، اس کی مٹی کے رگ وریشہ میں زندگی کو توانائی سے ہمکنار کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے؟ افسردہ تتلی کی علامت کے ذریعہ اس حقیقت کا بھیانک رخ دکھایا گیا ہے جو ساری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سوالیہ نشان کی صورت استادہ ہے۔ (۴۸)

نظم ''بادل'' میں شاعر کہتا ہے کہ صنعتی دور نے آلودگی اور جنگلات کی کٹائی جیسے مسائل کو جنم دیا ہے۔ شاعر اس ترقی پر سخت تنقید کر رہا ہے۔ نظم میں موجود گہرے بادل سے مراد دھوئیں کا بادل لیا گیا ہے جو صنعتی ترقی نے پیدا کر رکھا ہے۔

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''کوئی امکان نہیں ہے''، ''رک جاؤ تم'' اور ''بھوت'' شامل ہیں۔ ''کوئی امکان نہیں ہے'' میں شاعر کہتا ہے کہ جدید صنعتی دور نے اخلاقی اقدار کا وہ حال کیا ہے کہ اب دوبارہ دنیا میں اخلاقیات کی واپسی کا امکان مشکل ہے۔ نظم ''رک جاؤ تم'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان ترقی کرتا کرتا اُس مقام پر پہنچ چکا ہے جس سے آگے اب کچھ نظر آ رہا ہے تو بس تباہی ہی تباہی۔ اب انسان کو سوچنا چاہیے کہ اسے آگے کیا کرنا ہے کہ دنیا تباہ ہونے سے بچ جائے اور پھر اس پر فوری عمل درآمد شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ ''بھوت'' میں شاعر نے فضائی آلودگی کی طرف اشارہ کیا ہے جو صنعتی دور کی پیداوار ہے۔ فضائی آلودگی کو بھوت قرار دیا ہے جو زمین پر زندگی کے آثار آہستہ آہستہ کم کرتی چلی جا رہی

ہے۔شاعر کہتا ہے کہ:

جوگرم، بوجھل، مہیب سانسوں
کی برچھیوں سے
زمین کا پنڈا جلا رہے ہیں
دیا زمین کا بجھا رہے ہیں (۴۹)
(بھوت)

شعری مجموعہ ''ہم آنکھیں ہیں'' میں اس عنوان پر نظم ''مجھ کو اچھی لگتی ہیں'' ہے۔اس نظم نے شاعر نے کہا ہے کہ مجھے خاموشی اچھی لگتی ہے۔شور غل سے بے زاری کا اظہار کیا گیا ہے، شاعر صنعتی ترقی سے پیدا ہونے والے شور غل سے تنگ اور پریشان ہے۔اسے خاموشی اور امن کا دور یاد آتا ہے، وہ اسی دور میں رہنا چاہتا ہے۔اس ترقی یافتہ دور کو شاعر انسان کی ظاہری ترقی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس ترقی کے باطن میں انسان کے لیے نقصان ہی نقصان ہے۔اسی مجموعہ کی ایک اور نظم ''کہا تھا اس نے'' میں شاعر کہتا ہے کہ صنعتی ترقی کی بدولت فضا آلودہ ہو چکی ہے اور اس فضائی آلودگی نے قیامت سے پہلے قیامت برپا کر دی ہے۔نظم ''نئی صدی'' میں بھی صنعتی ترقی کی مخالفت کی گئی ہے۔کہا گیا ہے کہ فضائی آلودگی نے زمین کے حسن کو پامال کر دیا ہے، زمین کے دکھوں میں انسان نے صنعتی ترقی کے ذریعے بیش بہا اضافہ کر دیا ہے۔شاعر صنعتوں کے خلاف ہے اور دوبارہ اسی امن کے دور میں جانا چاہتا ہے جب ماحول صاف ستھرا اور ہوا تر و تازہ تھی جو انسان کی صحت کے لیے بہت فائدہ مند تھی۔

''کاسہء شام'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''نو ہی برس میں'' اور ''نیلام'' شامل ہیں۔''نو ہی برس میں'' میں شاعر کہتا ہے کہ صنعتی اور ایٹمی ترقی نے دنیا میں تباہی تو پہلے بھی پھیلا رکھی تھی لیکن اکیسویں صدی میں اس تباہی و بربادی میں بہت تیزی آئی ہے۔شاعر امن کا خواہاں ہے جو ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔''نیلام'' میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا کے حالات دیکھ کر دل دکھی اور غمگین ہے۔دنیا کے حالات سے شاعر کا دل پریشان ہو چکا ہے کیونکہ دنیا سے امن رخصت ہو چکا ہے۔آئے روز نئے نئے حادثات اور مسائل پیدا ہو رہے ہیں جو سب دنیا کی بظاہر ترقی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔شاعر نے صنعتی اور سائنسی ترقی کو دنیا کی ترقی نہیں بلکہ زوال قرار دیا ہے۔

وزیر آغا کی شاعری کا ایک اہم موضوع ''معاشرتی مسائل کی وجہ سے انسان کی حالت زار'' ہے۔معاشرتی مسائل کی نشان دہی کر کے ان کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور ان مسائل کے خاتمے کے لیے

تدابیر بتائی گئی ہیں۔ وزیر آغا نے انسانی مسائل کو محسوس کیا ہے اور ان کے سدّ باب کے لیے انسان کی توجّہ دلائی ہے۔ اقبال نے بھی قومی بدحالی کی وجوہات اپنی شاعری میں بیان کی ہیں جو معاشرتی مسائل کا سبب بنتی ہیں۔ اس عنوان پر ''بال جبریل'' سے اقبال کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی (۵۰)
(ایک نوجوان کے نام)

شعری مجموعہ ''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''فرازِ کوہ''، ''تہذیب''، ''جنگل''، ''بلیک آؤٹ''، ''شب یلدا'' اور ''فن کار سے'' شامل ہیں۔ ''فرازِ کوہ'' میں شاعر کہہ رہا ہے کہ جب میں نے اپنے ملک کا بغور جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ میرے ملک کی عوام فرقوں میں بٹ چکی ہے اور مجھے میری قوم مُردہ دکھائی دی۔ ان میں بہت اکڑ اور غرور ہے۔ یہ مغرب کی روشنی کو اپنی منزل بنا چکی ہے اور اپنے اسلاف کو بھول چکہ ہے۔ ہر کوئی دنیا کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ہر کسی کو صرف اور صرف اپنی فکر ہے اور پھر بھی ہر کوئی پریشان اور اداس ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب تک میں نے بغور جائزہ نہ لیا تھا مجھے ان سب باتوں کا دیگر لوگوں کی طرح پتہ نہ تھا۔ شاعر نے ہمارے زوال کی وجہ جاننے کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے جو کہ یقیناً معاشرتی انتشار اور دین سے دوری ہے۔ شاعر نے کچھ یوں اظہار کیا ہے:

نیزوں کی طرح اکڑے ہوئے آہنی شجر
مغرب سے آفتابی شعاعوں کی برچھیاں
مشرق میں سہما سہما ہوا مضمحل قمر
ہر سمت اک کشاکش پیہم میں مبتلا
جنگل کے پیڑ شہر کے باسی اداس گھر (۵۱)
(فرازِ کوہ)

''تہذیب'' میں شاعر کہتا ہے کہ کسی بھی قوم کی تہذیب اتار چڑھاؤ سے بنتی ہے۔ زوال قوم کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ زوال قوم کے مناظر دکھانے کے بعد قوم کی بحالی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ دراصل شاعر بتانا یہ چاہتا ہے کہ ہماری قوم اس وقت زوال کے دور سے گزر رہی ہے۔ نہ جانے کب یہ دور ختم ہوگا اور کب دوبارہ ہم مستحکم ہوں گے۔ فی الحال ہماری قوم ہر سطح پر زوال کا شکار ہے۔ معاشرتی مسائل کی ہر طرف بھرمار ہے۔ ''جنگل'' میں شاعر کہتا ہے کہ میں ایک ایسی جگہ رہ رہا ہوں جو جنگل جیسی ہے جہاں ہر طرف خطرات

ہیں۔شاعر اپنے معاشرے کے بارے میں بیان کر رہا ہے کہ یہاں کے لوگ بھٹکے ہوئے ہیں۔انہیں کوئی رستہ نہیں مل رہا۔ ہر کوئی بے سمت چل رہا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ ان حالات میں مجھے کوئی سمجھ نہیں آ رہا۔ میں بھی اس جنگل میں بے سمت ہو گیا ہوں۔ میں راستہ تلاش کرنے کی بہت کوشش کر کے اب تھک ہار کے آسمان کی طرف نظر لگائے بیٹھا ہوں کہ اب اوپر والا ہی اس قوم کی مدد کرے، اس قوم کو گمراہی سے نکال کر راہ راست پر لائے۔''بلیک آؤٹ'' میں شاعر کہتا ہے کہ ہر طرف تاریکی اور خاموشی ہے۔کوئی ظلم کے خلاف نہیں بولتا۔ ہر طرف ظلم کا بازار گرم ہے اور کوئی اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا۔ ہر کوئی خاموش تماشائی بنا بیٹھا ہے۔شاعر نے عوام کی بے حسی کو بیان کیا ہے۔نظم ''شب یلدا'' میں شاعر کہتا ہے کہ نا جانے کب معاشرتی مسائل اور معاشرتی زوال کا خاتمہ ہو گا۔تاریک دور کو شاعر نے شب یلدا قرار دیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ نہ جانے کب یہ تاریکی ختم ہو گی اور روشنی ہو گی۔ مجھے اُس وقت کا انتظار ہے جب ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو جائے گی اور اندھیرا و تاریکی کا خاتمہ ہو جائے گا۔''فنکار سے'' میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارا معاشرہ زوال کا شکار ہے خاص طور پر شہروں میں حالات کافی ناساز ہیں البتہ دیہاتوں میں حالات نسبتاً بہتر ہیں۔شہروں میں تو بالکل انسان کی قدر ختم ہو چکی ہے۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

شہر کے باہر الھڑ جھونکے، خوشبوئیں اور رنگ
شہر کے اندر گھپ اندھیارا اور جلتے شمشان
تم تنہا تھے، تم تنہا ہو یہاں تمھارا کون
کون ایسا ہے اس جگ میں تم کرو گے جس پر مان (۵۲)
(فنکار سے)

''دن کا زرد پہاڑ'' کی نظم ''روایت'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اسلاف کی روایات کو ترک کر کے تباہی و بربادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔اسلاف کی روایات کو ترک کرنا شاعر کے نزدیک معاشرتی مسائل کو جنم دے رہا ہے۔زمانے کی تیزی سے تبدیلی پرانی روایات کا خاتمہ کرتی چلی جا رہی ہے اور انسان روز بروز بد سے بدتر حالات کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ناصر عباس نیّر نے اس نظم کا تجزیہ ایک اور زاویے سے کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ ایک مشرقی عورت کی تصویر ہے جس کی مدد سے شاعر نے روایت
کے باب میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔مشرقی عورت ہنوز پردے اور
حجاب کی پابند ہے۔گزشتہ دو ایک صدیوں کی مغرب میں شروع

ہونے والی آزادیٔ نسواں کی تحریکوں نے مشرقی عورت کو بھی قدیم
پابندیوں سے آزادی پانے کی ترغیب دی ہے۔تاہم ابھی وہ اپنے
وجود پر لپٹے ہوئے بھاری کپڑوں میں سے صرف آنکھوں پر سے کپڑا
ہٹانے میں کامیاب ہوئی ہے۔(۵۳)

اسی مجموعہ کی ایک نظم ''شب خون کے بعد'' میں شاعر نے انسان کی بے حسی کو معاشرتی مسئلہ قرار دیا ہے۔آج کے انسان کے سامنے کتنا ہی بڑا حادثہ کیوں نہ ہو جائے، وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا اور اپنی زندگی میں مست رہتا ہے۔

''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''نہ جانے کیوں نہ آئی''، ''چہرہ'' اور ''TITANIC'' شامل ہیں۔''نہ جانے کیوں نہ آئی'' میں شاعر کہتا ہے کہ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ظلم کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہیں ہے۔ظالموں نے کمزوروں کی آواز بند کر رکھی ہے۔کمزور بے چارے ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں۔اس نظم میں شاعر نے عوام کو سمجھایا ہے کہ ظالموں سے ڈر ڈر کر جینے سے ان کا مسئلہ حل نہ ہوگا۔ان کا سامنا کریں، ان سے اپنے حقوق لینے کے لیے ڈٹ جائیں۔ایک ہو کر ان کا مقابلہ کریں۔شاعر نے بتایا ہے کہ عوام ظالموں کے ہاتھوں پس چکی ہے۔وہ طاقتور ہیں اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر عوام پر حکمرانی کر رہے ہیں۔شاعر کہہ رہا ہے کہ ظالموں کے خلاف اٹھنے والی آواز کا ہر کسی کو انتظار ہے جو ابھی تک کہیں سے سنائی نہیں دے رہی۔ڈاکٹر فرحت ہاشمی اپنی کتاب ''حسن اخلاق'' میں ایک حدیث کچھ یوں بیان کرتی ہیں: ''سیدنا انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہے یا مظلوم۔صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! ہم مظلوم کی مدد تو کر سکتے ہیں لیکن ظالم کی مدد کس طرح سے کریں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ظلم سے اس کا ہاتھ پکڑ لو۔''(۵۴)

نظم ''چہرہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ جب میں اپنے معاشرے کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے اس میں کئی برائیاں نظر آتی ہیں۔رنگ بدلتے لوگ یعنی منافق لوگ، اوپر سے کچھ اندر سے کچھ۔منافقت، دھوکہ اور فرقہ واریت ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ہر طرف برائی ہی برائی نظر آتی ہے۔ڈھونڈنے پہ انسان نہیں ملتا۔معاشرہ بگڑ چکا ہے، زوال کا شکار ہے۔ہر انسان کے چہرے پر ہزار چہرے سجے ہیں۔اس کا اصل چہرہ معلوم نہیں کون سا ہے۔منافقت پر گہری چوٹ کی گئی ہے۔شاعر کہتا ہے:

ایک ہجوم دکھائی دیتا ہے
بے چہرہ لوگوں کا ایک ہجوم
جو بل کھاتا، لہراتا، کتنے

رنگ بدلتا پھرتا ہے (۵۵)

(چہرہ)

نظم ''TITANIC'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسانوں اور خاص طور پر مسلمانوں کی بنیادیں کھوکھلی ہوچکی ہیں لیکن یہ عمارت کی چھت پر زندگی کی مستیوں میں مدہوش ہیں ۔انسانوں کے مذہبی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی زوال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شعری کتاب ''یہ آواز کیا ہے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''ہم رو رو کر ہلکان ہوئے'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کا زوال اس کے اس طرز عمل سے نظر آتا ہے کہ وہ دوسروں کے غم دیکھ کر ہنستا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ انسان پر جب تک خود کوئی مصیبت نہ آئے تب تک وہ دوسروں کے غم سمجھ نہیں سکتا۔انسان کا یہی رویہ اسے زوال کی طرف لے جارہا ہے۔شعری کتاب ''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''چلو اک بار پھر ہم'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ میری قوم مردہ اور بے حس ہوچکی ہے، اس پر محنت کرنا ہوگی۔محنت اور کوشش سے یہ دوبارہ زندہ ہوسکتی ہے۔اس لیے شاعر کہتا ہے کہ اس قوم کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے دوبارہ اس میں جوش اور ولولہ پیدا کرنا ہوگا، اس کی بے حسی کا خاتمہ کرنا ہوگا۔شاعر کہتا ہے کہ:

چلو کوشش تو کر دیکھیں
عجب کیا ہے کہ بے حس خاک
خاک پا میں ڈھل جائے
ہمارے پیچھے پیچھے چل پڑے (۵۶)

(چلو اک بار پھر ہم)

''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''انگیٹھی'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے کہا ہے کہ دنیا سے امن، خوشی اور خوب صورتی ختم ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ معاشرتی انتشار اور زوال انسانیت ہے۔شعری مجموعہ ''گھاس میں تتلیاں'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''پوسٹ مارٹم'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے کہا ہے کہ انسان تنزلی کی بدترین سطح پر پہنچ چکا ہے۔اس نے اپنے رویّے سے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''ہیروئن'' اور ''چپ اور چاپ'' شامل ہیں۔''ہیروئن'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان درندہ صفت ہوگیا ہے۔وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہزاروں، لاکھوں اپنے جیسے انسانوں کی زندگیوں سے کھیلتا ہے۔شاعر نے ہیروئن کا کاروبار کرنے والے سنگدل

لوگوں پر کڑی تنقید کی ہے۔شاعر نے انہیں معاشرے کا دشمن اور قاتل کہا ہے۔ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

''ہیروئن'' یہ ایک نشہ آور دوا ہے جس کی لت پڑ جائے تو چھوٹے نہیں چھوٹتی اور یہ شراب کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ انسان کو خانہ خرابی کی آگ میں جھونک کر جسم وجاں، گھر بار، عزت وآبرو سب کچھ کو راکھ میں تبدیل کر دیتی ہے۔اس دوا کا غلط استعمال مغربی دنیا اور اس کی تہذیب کی آوردہ لعنتوں کی بدولت ہمارے معاشرہ کو بھی گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔نئی شاعری داخلیت کے حصار میں رہتے ہوئے بھی اجتماعی زندگی کی المناکیوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتی۔(۵۷)

نظم ''چپ اور چاپ'' میں شاعر کہتا ہے کہ معاشرہ تاریکی اور خاموشی میں ڈوبا ہوا ہے۔اس معاشرے پر بڑے بڑے حادثات بے اثر ہو گئے ہیں اور اس کی خاموشی کو ختم کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔یہاں کے عوام ظلم وستم سے تنگ ہیں۔اس لیے نجات کے لیے سوچتے ہیں لیکن پھر بھی خاموش ہیں، ہمت نہیں کر پا رہے۔شاعر نے لوگوں کے ذہنی سناٹے سے نجات پانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

گھنی، گہری، کراں اندر کراں چپ
مسلسل سوچتی، انکار کرتی (۵۸)

(چپ اور چاپ)

شعری کتاب ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''بندھن'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا کا امن، خوشی اور اچھے دن کہاں گئے جب سب مل جل کر پیار محبت سے رہا کرتے تھے۔اب تو ہر طرف خوف، بے یقینی اور ظلم کا بازار گرم ہے۔ہر کوئی پریشان اور ہراساں ہے۔ظالم معاشرے میں اپنا رعب جمائے ہوئے ہیں۔طاقتور اور ظالم کا ہر طرف راج ہے۔کمزور اور عام انسان ظلم سے پس رہا ہے۔

وزیر آغا نے مغربی تہذیب پر سخت چوٹ کی اور اخلاقی اقدار کے فقدان کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔اس کا آغاز بہت پہلے اقبال اور اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں کر دیا تھا۔اکبر مغربی تہذیب کی پیروی کے سخت خلاف لکھتا رہا۔اقبال نے بھی اپنی شاعری میں مغربی تہذیب پر سخت چوٹ کی ہے اور مسلمانوں کو

سمجھایا ہے کہ یہ سراب ہے، دھوکا ہے۔ اقبال مغربی تہذیب سے نوجوان نسل کو روکتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ یہ تہذیب اخلاقی اقدار کے زوال کا باعث ہے۔ اقبال بانگ درا کی نظم ''طلوع اسلام'' میں کچھ یوں کہتے ہیں:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے(۵۹)
(طلوع اسلام)

بانگ درا میں ہی اقبال ایک جگہ کچھ یوں مغربی تہذیب پر چوٹ کرتے ہیں:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے(۶۰)
(ظریفانہ)

شعری مجموعہ ''بال جبریل'' میں اقبال اس عنوان پر کچھ یوں کہتے ہیں:

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری (غزل۱۴)

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک (غزل۴۶)
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات(۶۱)
(لینن)

ضرب کلیم میں اقبال نے اس عنوان پر کچھ یوں کہا ہے:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف (مغربی تہذیب)

فروغ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ ''مازاغ'' (غزل)

اک شور ہے کہ مغرب میں اجالا نہیں ممکن

افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش (شعاع امید)

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے

یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی (یورپ اور یہود)

فکر عرب کو دے کر فرنگی تخیلات

اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو (ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام)

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو

مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے (۶۲)

(گلہ)

ارمغان حجاز میں اقبال کچھ یوں کہتے ہیں

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (۶۳)

(ابلیس کی مجلس شوری)

وزیر آغا اپنے دور میں دوبارہ نوجوان نسل کو مغربی تہذیب کا دلدادہ دیکھ کر غمزدہ ہو گئے اور انہوں نے اپنی شاعری میں نوجوانوں کو اس تہذیب کے نقصانات سے آگاہ کر کے معاشرتی اصلاح کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر نوجوان اس تہذیب کی طرف مائل ہو گئے تو معاشرے میں اخلاقی فقدان جنم لے گا جو نسل در نسل چلتا رہے گا اور یہی اخلاقی زوال دوبارہ ہمارے قومی اور ملکی زوال کا باعث بنے گا۔

''دیکھ دھنک پھیل گئی ''میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''شام اک سرخ کھلونا'' اور ''برسوں پہلے'' شامل ہیں۔ ''شام اک سرخ کھلونا'' میں شاعر نے شام مشرقی تہذیب اور رات مغربی تہذیب کو قرار دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مغربی تہذیب اندھیرا ہے، اس نے مشرقی تہذیب کا خاتمہ کر کے رکھ دیا ہے۔ جس طرح رات شام کا خاتمہ کرتی ہے ویسے ہی مغربی تہذیب، مشرقی تہذیب کا خاتمہ کر رہی ہے۔ اُس نے آنکھوں کو چندھیا دینے والی رونقیں دکھائی ہیں لیکن سمجھ دار شخص مغربی تہذیب کے عام ہونے پر پریشان ہے۔ ''برسوں پہلے'' میں شاعر کہتا ہے کہ برسوں پہلے معاشرتی زوال کا شک دل میں پیدا ہوا تھا لیکن ایک عرصے تک یہ زوال نہ آیا لیکن اب وہ زوال آ چکا ہے۔ اخلاقی اقدار کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دولت کی ہوس عام ہو گئی ہے۔ شاعر کا برسوں پہلے کا خدشہ اب حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔ مغربی ترقی نے اخلاقیات کو شدید متاثر کیا ہے۔ ''یہ آواز کیا ہے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''بہترویں سالگرہ پر'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اخلاقی

اقدار اور اصولوں کی پامالی کا نوحہ بیان کیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں اخلاقیات کا شدید فقدان ہو چکا ہے۔آگے آگے حالات بد سے بدتر ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ماضی میں لوگ اخلاقی اقدار کی پاسداری کرتے تھے،اب دنیا سے یہ چیز ختم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔جس دور میں شاعر نے اس دنیا میں آنکھ کھولی،وہ دور اخلاقی اقدار کی پاسداری کے لحاظ سے بہتر تھا۔شاعر اُس دور کو یاد کر رہا ہے۔اُن لوگوں کی باتیں اس کے کانوں میں رس گھول رہی ہیں۔اُن لوگوں کے اچھے اخلاق شاعر کو یاد آرہے ہیں۔وہ لوگ بہت اچھے تھے،آجکل کی نسل ان کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہے۔اب جو لوگ اس دنیا سے جارہے ہیں،یہ بھی کچھ بہتر ہیں،آگے آگے بدترین نسل آتی چلی جارہی ہے۔

''چٹکی بھر روشنی''میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام''روشنی سے بات کر کے دیکھ لی'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے اپنے اسلاف کے رستے کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔جدید مغربی تہذیب کی دھوکہ دینے والی زندگی کو دیکھ لیا جو سراب سے زیادہ کچھ نہیں نکلی۔جس میں بے چینی اور فریب ہی فریب ہے۔اب ہم دوبارہ مشرقی روایات کی طرف منہ موڑتے ہیں لیکن اب یہاں بھی کچھ خاص رہنمائی نہیں مل رہی۔مشرقی تہذیب بھی مادّہ پرستی کا شکار نظر آتی ہے۔ہمارے دینی علماء جنہوں نے ہماری اصلاح کرنی تھی،وہ خود فرقوں میں بٹ چکے ہیں۔مغربی تہذیب نے ہمیں مختلف گروہوں میں بانٹا ہی ہے لیکن اب مشرقی تہذیب بھی دنیا پرستی کی وجہ سے فرقوں میں بٹ گئی ہے اور اصلاحِ انسانیت پر خاموش ہے۔

شعری مجموعہ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ''میں اس عنوان پر مشتمل نظم''کہاں سے تم آئے ہو بھائی'' ہے۔اس نظم میں شاعر نئی نسل سے ناامید دکھائی دیتا ہے۔شاعر کی نسل تک دنیا کے حالات قدرے بہتر تھے،لوگوں میں اخلاق پایا جاتا تھا لیکن اب نئی نسل اخلاقی اقدار سے عاری ہے۔شاعر سوچ رہا ہے کہ نہ جان کب تک نئی نسل بگاڑ کا شکار رہے گی اور نہ جانے کب دنیا میں دوبارہ وہ پہلے والا امن،پیار و محبت قائم ہوگا۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

آنے والوں سے چل کر ملیں
ان سے پوچھیں
کہاں سے تم آئے ہو بھائی
ارادہ ہے کب تک یہاں ٹھہرنے کا؟(۶۴)
(کہاں سے تم آئے ہو بھائی)

وزیر آغا نے''کاہلی اور بے حسی''کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔وہ اپنی قوم کو دیکھ کر مایوس

نظر آتے ہیں، اُنہیں محسوس ہو رہا ہے کہ قوم کاہلی کا شکار ہو کر دوبارہ زوال کی جانب رواں دواں ہے۔ ہمارے قائدین نے بہت مشکل سے قوم کو کاہلی اور بے حسی سے نکالا تھا۔ علامہ اقبال اور قائداعظم نے قوم میں محنت اور لگن پیدا کر کے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ اس بارے میں قائداعظم کا مشہور قول یاد آتا ہے کہ ''کام، کام اور صرف کام۔'' اب دوبارہ قوم کاہلی اور بے حسی کا شکار ہو چکی ہے، وہ حالات کو سمجھ چکے ہیں اور قوم کو دوبارہ زوال سے بچانے کے لیے اُسے کاہلی اور بے حسی چھوڑنے کی نصیحت کر رہے ہیں۔ وزیر آغا نے اپنی شاعری میں اس موضوع کو کئی جگہ بیان کیا ہے اور اس کے ذریعے معاشرتی اصلاح کی ایک موثر کوشش کی ہے۔

''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''یہ لوگ'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کمزور، ضعیف، کاہل اور نرم مزاج لوگوں کو کہتا ہے کہ تمھاری مثال زرد پتوں جیسی ہے جس کی زمانے کو کوئی ضرورت نہیں، زمانہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا، یہ لوگ نہایت کمزور اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ زمانہ بہادر اور قوّی لوگوں کو پسند کرتا ہے، یہی لوگ زمانہ ساز ہوتے ہیں۔ شاعر کاہل لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ تم میری بات سنو اور خود کو بدلو۔ اپنی سُستی چھوڑو اور زمانے کے قابل بن جاؤ تا کہ زمانہ تمھیں پسند کرنے لگے۔ ''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''دھوپ'' اور ''وہ اک تازہ شے'' شامل ہیں۔ ''دھوپ'' میں شاعر ہمیں دھوپ کے ذریعے کاہلی اور سُستی چھوڑنے کی نصیحت کر رہا ہے۔ محنت کرنے پر اُبھار رہا ہے، دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر رہا ہے جیسے سورج اور اس کی دھوپ انسانوں اور دیگر جانوروں کو فائدہ دیتے ہیں۔ سورج اپنے وقت مقررہ پر اپنے کام پر آجاتا ہے اور اپنا فرض نبھاتا ہے اور اپنے وقت مقررہ پر غروب ہو جاتا ہے۔ انسانوں کو درس دیا گیا ہے کہ وہ بھی سورج نکلتے ہی اپنے کام کاج پر نکل جائیں اور شام تک محنت مزدوری کریں اور شام کو کام کاج سے فارغ ہو کر آرام کریں نہ کہ پورا دن کاہلی اور سُستی میں گزار دیں۔ شاعر کہتا ہے کہ:

کہا میں نے
اپنے برفاب گھر کے مقفل کواڑوں کو تو کھول کر
اس سمندر کو تک
جو خنک تیرگی کی سیہ باڑ کو پار کر کے
تیرے گھر کی دہلیز تک آ گیا ہے (۶۵)

(دھوپ)

نظم ''وہ اک تازہ شے'' میں شاعر کہتا ہے کہ اب ہم میں جوش، ولولہ، ہمت اور حوصلہ باقی نہیں رہا۔ زندگی کے آثار باقی نہیں رہے۔ ہم ایک کاہل اور سُست قوم بن چکے ہیں جو زوال کی جانب تیزی

سے گامزن ہے، دراصل شاعر نے ہمیں کاہلی اور سُستی چھوڑنے اور محنت کرنے پر اکسایا ہے۔ ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''وقت ٹھہرا ہوا ہے'' اور ''کیسے نادان ہو تم'' شامل ہیں۔ ''وقت ٹھہرا ہوا ہے'' میں شاعر نے سب کو لاش قرار دیا ہے کیونکہ سُستی اور کاہلی ہمارے اندر آ چکی ہے اور یہ مُردوں کی نشانی ہوتی ہے۔ زندگی حرارت اور محنت کا نام ہے، جو اَب ہمیں پسند یا گوارا نہیں، اس لیے ہم مردہ لاشیں ہیں اور ہمارے لیے وقت ٹھہرا ہوا ہے۔ وقت کے چلنے کا احساس تو تب ہو جب ہم زندگی اصل معنوں میں گزاریں۔

''کیسے نادان ہو تم'' میں شاعر بے حس، نادان، کاہل اور سست لوگوں کو سمجھاتا ہے جو عقل سے عاری ہیں یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں ان لوگوں تک علم پہنچانا چاہتا ہوں لیکن یہ علم کی روشنی کے طالب ہی نہیں ہیں۔ علم کی ضرورت اُن کو ہوتی ہے جو اس کی قدر جانتے ہوں۔ اَنجان اور ناسمجھ لوگوں کو اس کی قدر کہاں ہے۔ ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''تیرگی'' ہے۔ اِس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ موجودہ دور محنت کا ہے، سُستی اور کاہلی کے شکار لوگ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ شاعر نے سُست اور کاہل لوگوں سے کہا ہے کہ تم ایسی جگہ بھاگ جاؤ جہاں سُستی اور کاہلی کا دور ہو کیونکہ اس جگہ تو تم اب زیادہ عرصہ نہیں چل سکو گے۔ ''کاسۂ شام'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''آخری چوٹی سے پہلے'' اور ''زمانے کو رستہ دکھانے لگا ہے'' شامل ہیں۔ نظم ''آخری چوٹی سے پہلے'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان خواہشات کا پجاری بنا ہوا ہے۔ ایک کے بعد ایک دوسری خواہش اور ہر نئی خواہش پہلی خواہش سے بڑی۔ خواہشات نے انسان کو کاہل اور بے حس بنا رکھا ہے۔ انسان کو زندہ لاش بنا کر رکھ دیا ہے۔ نظم ''زمانے کو رستہ دکھانے لگا ہے'' میں شاعر نے ایسے شخص کا ذکر کیا ہے جو اپنی نالائقی اور کاہلی کی وجہ سے لوگوں یہاں تک کہ اپنے عزیزوں میں بھی بدنام ہو جائے اور سب اسے نکمّا اور نالائق قرار دے دیں اور اچانک اس میں انقلاب آ جائے اور وہ آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگے یہاں تک اس میں بہتری آ جائے کہ وہ خود مُصلح بن جائے۔ محنت کی عظمت اور کاہلی کے نقصانات سے آگاہ کیا گیا ہے۔

وزیر آغا نے اپنی شاعری میں ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی نصیحت بار بار کی ہے اور اسے بہت بہادری کا کام کہا ہے اور مزید اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ آجکل ایسے بہادر لوگ نایاب ہیں جو ظلم کے خلاف آواز بلند کریں، جو ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق بلند کریں۔ اُنہوں نے بتایا ہے کہ اگر ظلم کے سامنے جھکے رہو گے تو ذلیل ہوتے رہو گے اور ظالم روز بروز اپنے ظلم میں اضافہ کرتا رہے گا۔ اسلام نے بھی جابر و ظالم حکمران کے آگے کلمۂ حق بیان کرنے کو جہاد قرار دیا ہے۔

''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''دھرتی کی آواز'' ہے۔ اس نظم میں شاعر

صاحب اقتدار لوگوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ غریب و نادار عوام کے مسائل حل کرو، اپنے آپ میں مگن نہ رہو، خود غرضی چھوڑ و اور اپنے اردگرد کے غریب لوگوں پر توجہ دو۔ اگر ایسا کرو گے تو فلاح پاؤ گے۔ دعائیں حاصل کرو گے۔ اگر غرباء کا خیال نہ رکھو گے اور یونہی خود غرضی کرتے رہو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ عوام کو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی نصیحت کی ہے۔ ظالم اور جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے پر ابھارا گیا ہے۔ ''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''دیواریں'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے غریب اور پسی ہوئی عوام کو دیواروں سے مستعار لیا ہے کیونکہ وہ صاحبِ اقتدار لوگوں کے ظلم خاموشی سے سہتے رہتے ہیں لیکن اگر وہ خاموشی توڑ دیں اور ظالم حکمرانوں کے خلاف متحد ہو کر کھڑے ہو جائیں تو انہیں ظلم سے نجات مل سکتی ہے۔ شاعر نے عوام کو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی نصیحت کی ہے۔ ''یہ آواز کیا ہے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''اک بھاری آواز'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا درس دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ سچی آواز ازل سے ابد تک موجود رہے گی۔ یہ کوئی الگ قسم کی آواز نہیں ہے، عام آوازوں کی طرح ایک آواز ہے، اِس سچی آواز سے دنیا میں امن ہوا تھا۔ لوگ جب سچ بولتے تھے تو دنیا میں مسائل کم تھے۔ اب دوبارہ اس سچی آواز نے سر اٹھانا شروع کر دیا ہے، یہ اِس دور کی ضرورت ہے۔ امن کے لیے اس آواز کا اٹھنا ناگزیر ہے۔ ظلم کے خلاف حق کی آواز بلند ہوتی شاعر کو دکھائی دے رہی ہے اور شاعر کا کہنا ہے کہ دنیا میں امن کے لیے حق کی آواز کا بلند ہونا بے حد ضروری ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

اس بھاری آواز کے تن سے
چھوٹی چھوٹی نرم صدائیں
انکھووں کی صورت پھوٹی تھیں (۶۶)

(اک بھاری آواز)

وزیر آغا کی شاعری کا ایک اہم موضوع ''اسلاف کی پیروی'' بھی ہے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ اسلاف کے راستے سے ہٹ جانے اور سُستی و کاہلی کو اپنا شعار بنانے کو کہا ہے اور دوبارہ دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لیے اسلاف کی پیروی کرنے کی نصیحت کی ہے۔ اس موضوع کو اقبال کے علاوہ دیگر کئی شعرا نے بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ وزیر آغا کی شاعری میں اس موضوع کا ہونا بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ حالی و اقبال نے اس موضوع کو اپنی شاعری میں استعمال کر کے برصغیر کے مسلمانوں کو جوش و ولولہ عطا کیا اور وہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر دوبارہ چلتے ہوئے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وزیر آغا نے آج پھر مسلمانوں کو اسی عیب کو اپناتے ہوئے دیکھ کر کہ مسلمان اپنے

اسلاف کی راہ سے ہٹتے جا رہے ہیں، اپنی شاعری میں اس موضوع کو استعمال کیا ہے۔

''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''سر راہ'' اور ''نئی پود'' شامل ہیں۔ نظم ''سر راہ'' میں شاعر نے مسلمانوں کے ماضی کے کارنامے بیان کیے ہیں جس کی وجہ سے وہ پوری دنیا میں مشہور ہوئے اور اب اپنے اسلاف کی راہ کو چھوڑ کر زوال کا شکار ہیں۔ ہر میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ آج مسلمان اپنے اصل مقصد کو بُھلا بیٹھے ہیں اِسی لیے اُن کے لیے فضا ساز گار نہیں رہی۔ شاعر نے کہا ہے:

آج اس وادیٔ پرنور کی ہر شے ہے اداس
مضمحل چاند بجھے پیڑ ستارے بے دم (۶۷)

(سر راہ)

نظم ''نئی پود'' میں شاعر کہتا ہے کہ ہم نے مشرقی تہذیب کو چھوڑ دیا ہے، ہمارے بزرگ مشرقی تہذیب کے متوالے تھے، نئی نسل مغربی تہذیب کی دلدادہ ہے۔ اس نے اپنے اسلاف کی راہ چھوڑ کر خود کو زوال کو اپنا مقدّر بنا دیا ہے۔ ہمارے بزرگ امن، خوشحالی سے اپنی زندگیاں گزار گئے ہیں۔ نئی نسل اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے رُسوا ہو رہی ہے۔ اِن پر خزاں کا موسم آیا ہوا ہے۔ یہ نسل مغربی تہذیب کی ظاہری کشش سے متاثر ہے، اس کے باطنی نقصانات سے بالکل آگاہ نہیں ہے۔ ''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''سفر کا دوسرا مرحلہ'' اور ''کہانی'' شامل ہیں۔ ''سفر کا دوسرا مرحلہ'' میں شاعر کہتا ہے کہ ہم ماضی کے مسلمانوں جیسے نہیں رہے لیکن شاعر نے اس نظم میں اِسے اپنی قسمت میں لکھا سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ ہماری قسمت میں ہی یہ زوال کا زمانہ دیکھنا لکھا ہوا تھا۔ بہر حال شاعر نے اِس نظم کے ذریعے مسلمانوں کی زبوں حالی کو بیان کیا ہے اور اپنے اسلاف کے راستے کو اپنانے کو ہی مسلمانوں کی نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ''کہانی'' میں شاعر نے ماضی بعید کی بات کی ہے کہ جب دنیا میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ شاعر نے نبی ﷺ کا ذکر کیا ہے کہ وہ دینِ اسلام لے کر آئے اور دنیا میں اَمن کا دور شروع ہوا لیکن اب دوبارہ انسان جہالت اور گمراہی میں پڑ چکا ہے لیکن اگر آج کا انسان نبی ﷺ کی تعلیمات کے مطابق دوبارہ زندگی گزارنا شروع کر دے تو حالات پھر سے ساز گار ہو سکتے ہیں۔

وزیر آغا نے دنیاوی حالات کے پیشِ نظر ''رہنما کی ضرورت'' محسوس کی جو آئے اور آ کر دنیا میں امن و خوشحالی پیدا کرے۔ جو دنیا کو آلودگی سے پاک کرے اور دوبارہ فطرت سے دنیا کا رشتہ جوڑے۔ دنیا اپنی تباہی و بربادی کے دہانے پر آن کھڑی ہوئی ہے اور اب ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو اسے اس تباہی سے بچا کر دوبارہ پُر امن بنائے اور یہاں ہونے والے خون کے کھیل کو بند کرے۔

''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''اب اتنی دور تو مت جاؤ'' ہے۔ اِس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ نیک لوگ تو بہت دیکھے ہیں لیکن رہنما نظر نہیں آتا جو لوگوں کو راہ راست کی طرف لائے۔ اُنہیں سمجھائے کہ تم بھٹک چکے ہو۔ اِس برائی کی راہ چھوڑ کر راہ راست پر آ جاؤ۔ آج کل نیک اور نورانی چہرے والے لوگ تو بہت مل جاتے ہیں لیکن ایک مُصلح کی ضرورت ہے جو اس بے سمت قوم کی سمت متعین کر کے دے۔ ''کاسۂ شام'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''نشاۃ الثانیہ'' ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ کاش میری قوم زوال سے نکل سکے اور دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے، اِس کے مسائل کا خاتمہ ہو۔ کوئی ایسا رہنما اسے میّسر آئے جو اُسے دوبارہ متّحد کر کے اور اِس میں جوش پیدا کر کے اِسے ترقی کی راہ پر چلا سکے۔ نظم میں شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

لاکھوں سوکھی آنکھوں میں
پھر جھانک کے تکتے
پھولوں کے جنگل اگ آتے (۶۸)

(نشاۃ الثانیہ)

وزیر آغا نے ''دنیاداری'' کو اپنی شاعری کا اہم موضوع بناتے ہوئے آج کے مشینی انسان اور پیسے کے پجاری انسان کو سمجھانے کو کوشش کی ہے کہ یہی سب کچھ نہیں ہے، یہ سب تو سراب ہے، حقیقت میں انسان کا اس دنیا میں آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ اپنے اصل مقصد کو پہچانو اور اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔ وزیر آغا نے آج کے مشینی اور لالچی انسان پر سخت طنز اور کڑی تنقید کی ہے۔

''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''گنتے جاؤ''، ''آخر ایک دن'' اور ''اب دن کی باتیں کرتے ہیں'' شامل ہیں۔ ''گنتے جاؤ'' میں شاعر کہتا ہے کہ اب انسان نوٹ بنانے والی ایک مشین بن چکا ہے۔ اسے پیسہ کمانے کے علاوہ کوئی ہوش نہیں۔ وہ اپنی اقدار کو بھول چکا ہے، اپنے اسلاف کے رستے سے ہٹ گیا ہے۔ دنیاداری پر سخت چوٹ کی گئی ہے۔ شاعر نے طنزیہ انداز میں کچھ یوں کہا ہے:

گنتے جاؤ
گن گن کر تم مزے اڑاؤ
گنتے جاؤ (۶۹)

(گنتے جاؤ)

نظم ''اب دن کی باتیں کرتے ہیں'' میں شاعر نے انسان کا دنیاداری میں محو ہونے کا ذکر کیا

ہے۔دن کولوگ روزی کی تلاش میں نکلتے ہیں،اخبار پرافسوس ناک خبریں پڑھنے کوملتی ہیں۔شاعر کہتا ہے کہ پیسہ کمانے کی محبت میں انسان نے دن رات ایک کیا ہوا ہے۔دن کو بھی اسے پیسہ کمانے کی فکر لگی ہوتی ہے اور رات کو بھی وہ اسی فکر کا شکار دکھائی دیتا ہے۔نظم ''آخر اک دن'' میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کے لیے کرنسی خوشی کا سامان بنتی ہے۔کرنسی مختلف جگہوں کی زینت بنتی ہے۔بُرے دھندوں والوں کے ہاتھ بھی لگتی ہے،بُرے لوگ اس کے ذریعے خود پر لاکھوں گناہ سوار کر لیتے ہیں۔وہ معصوم انسانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں اور یوں یہ خوب صورت کرنسی کالا دھن بن جاتی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ انسان دنیا کمانے کے لیے کسی بھی حد سے گزر جاتا ہے۔

وزیر آغا کی شاعری میں دنیاوی کاموں میں انسان کے الجھنے اور گرفتار ہونے کو موضوع بنا کر انسان کو سمجھایا ہے کہ وہ سب کچھ دولت وشہرت کو نہ سمجھ بیٹھے بلکہ اپنے عزیز واقارب اور دیگر رشتوں کو بھی اپنی زندگی میں جگہ دے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اس دنیا میں آنے کے حقیقی مقصد یعنی اللہ کی عبادت کو بھی زندگی میں شامل کرے۔وزیر آغا نے اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ آج کا انسان مشین بن چکا ہے اور وہ دنیا سے کٹ چکا ہے،اس میں اخلاقی اقدار کا فقدان پیدا ہو چکا ہے۔

''شام اور سائے ''میں وزیر آغا کے اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''تعاقب'' اور ''ندامت'' شامل ہیں۔''تعاقب'' میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا کے معاملات میں اُلجھ کر انسان اپنے عزیزوں کو بھول جاتا ہے۔''ندامت'' میں شاعر کو اپنے عزیزوں کو وقت نہ دے پانے پر ندامت ہے۔''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''اک ڈری ہوئی آواز'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کے اردگرد بہت سے خطرات،مشکلات اور مسائل ہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے کاموں میں،اپنی زندگی میں محو رہتا ہے۔اِنسان اپنی روزی روٹی کے لیے تمام خدشات کے باوجود دنیا کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

رات کو جب تاروں کی آنکھیں
گھورنے لگتیں
میں اپنے بستر میں دبکا
آنے والی سبز رتوں کے منظر تکتا (۷۰)
(اک ڈری ہوئی آواز)

وزیر آغا کی شاعری میں فطرتی مناظر اور فطرت سے لگاؤ بہت زیادہ ہے۔اِس کی وجہ اُن کی فطرت سے محبت اور لگاؤ ہے۔اُن کی بیشتر زندگی گاؤں میں گزری اور انہوں نے گاؤں میں زراعت کا پیشہ اپنایا

جس نے اُنہیں فطرت سے اور قریب کر دیا۔ اِس کے علاوہ آپ نے کئی فطرتی مناظر والے علاقوں کی سیّاحت کی۔ جس نے آپ کو فطرت سے قریب کیا اور اِن سب وجوہات کی بنا پر اُن کی شاعری میں فطرتی مناظر اور فطرتی رعنائیوں کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ انگریزی شاعر ورڈزورتھ اور اردو و فارسی کے عظیم شاعر علامہ اقبال کی شاعری میں بھی فطرت سے لگاؤ واضح نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری میں فطرت سے لگاؤ کو صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ کی نظم ''ہمالہ'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ اِسی طرح وزیر آغا کی نظموں میں بھی فطرتی رعنائیاں اور مناظر بہت سی جگہوں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

''چٹکی بھر روشنی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''کار سے اترو'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انسان کو فطرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان دنیاوی ترقی کے حصول کی خاطر فطرتی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونا بھول گیا ہے۔ وہ اب کار میں بیٹھ کر سفر کرتا ہے اور سفر کا مقصد حصول دنیا ہوتا ہے۔ شاعر ایسے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے کار سے اتر کر فطری مناظر کا مشاہدہ کرو، تمھیں ان میں لطف ملے گا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب اور مال و دولت، آرام و آسائش بھری زندگی کا رد کیا گیا ہے۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

تم کیوں ربڑ کے بوٹ کی نوک سے
ٹھوکر مار کے ان خوشیوں کو
بڑی بڑی خوشیوں کے پیچھے
دوڑ رہے ہو
کار سے اترو (۱۷)

(کار سے اترو)

''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم ''بن باس'' کے نام سے ہے۔ اس نظم میں دو بھائیوں کا ذکر ہے جن میں جدائی ہو گئی۔ اُن میں سے ایک بھائی آزاد فضاؤں میں چلا گیا، اس نے فطری مناظر سے دوستی کر لی۔ شاعر نے دراصل اِس نظم میں ہمیں فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے کا درس دیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ کچھ انسان فطرتی مناظر کی قدر کو جان لیتے ہیں اور اُن سے لطف اندوز ہو کر زندگی گزارتے ہیں جبکہ اُنہی کے دوسرے بھائی فطرتی مناظر کے لُطف سے محروم رہ کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ انہیں اِتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اپنے کام چھوڑ کر فطرتی مناظر کے حُسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔

نظمیہ مجموعہ ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظموں میں ''بچپن پھر سے

لوٹ آیا'' اور ''تجارتی ہوا'' شامل ہیں۔ ''بچپن پھر سے لوٹ آیا'' میں شاعر نے دنیا کے تیزی سے ترقی کرنے کو بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ لوگ دنیا میں پڑ کر قدرتی مناظر کے لطف سے محروم ہو رہے ہیں جبکہ میں نے اِس کی اہمیت کو جان لیا ہے۔ میں اَب قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا ہوں۔ شاعر دنیا والوں سے کہتا ہے کہ تم بھی میرے ہمسفر بن جاؤ، آؤ مل جُل کر قدرت کی اس کاری گری سے لطف اندوز ہوں اور قدرت کے اسرار جانیں۔ ''تجارتی ہوا'' میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں تجارت کا دور عام ہو چکا ہے۔ مجھے اس تجارتی ترقی کا حصہ نہیں بننا۔ یہ ترقی معاشی فائدے ضرور دے رہی ہے لیکن اخلاقی اور قدرتی مناظر سے دوری کے نقصانات کا باعث بھی بن رہی ہے۔ شاعر قدرتی مناظر کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ آرام دہ زندگی سے بچنا چاہتا ہے جو انسان کو بہت سے روحانی فوائد سے دور کر دیتی ہے۔ شاعر کو گاؤں کی زندگی عزیز ہے، اُسے ساحلی شہر سے دلچسپی نہیں۔ شاعر کہتا ہے مجھے دنیاداری نہ سکھاؤ، میں فطری مناظر کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا عادی ہوں، مجھے شہروں کی آلودگی سے بچاؤ۔ نظم ''ان کی باتیں'' جو کہ وزیر آغا کی شعری کتاب ''ہم آنکھیں ہیں'' میں موجود ہے، اِس نظم میں شاعر نے فطرت سے انسان کا لگاؤ نہ ہونا بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ فطرتی مناظر انسان سے باتیں کرتے ہیں اگر انسان محسوس کرے اور بغور رمشاہدہ کرے تو لیکن انسان کے پاس فطرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے وقت نہیں ہے۔

''خدمت خلق'' جیسا عظیم موضوع اردو ادب کے اکثر شعرا اور نثر نگاروں نے اپنی شاعری اور نثر میں کسی نہ کسی انداز سے بیان کیا ہے۔ وزیر آغا کی شاعری میں بھی اِس موضوع پر نظمیں موجود ہیں۔ انسان کے مقام اور اس کی خدمت میں عظمت کا بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے انسانوں کے غموں کو اپنا غم سمجھنے اور اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔

''شام اور سائے'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''مشورہ'' ہے۔ اِس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ دوسروں کے غم محسوس کر کے دیکھو، اِس طرح تمھیں انسان کے دکھوں اور غموں کا اندازہ ہوگا اور تم اُن کی مدد کرو گے۔ شاعر یہ مشورہ دے رہا ہے کہ دنیا میں ہونے والے خوفناک واقعات کو خود پر بیت کر دیکھو۔ اگر وہ واقعہ تمھارے ساتھ ہوا ہوتا تو تمھاری حالت کیسی ہوتی یا تمھیں کیسا محسوس ہوتا۔ شاعر کا مقصد ہمیں خدمت خلق پر اُبھارنا اور اُکسانا ہے۔ جب ہم دوسروں کے دکھوں کو سمجھیں گے محسوس کریں گے، تبھی ہم ان کی مدد کر سکیں گے۔ ''نردبان'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''اک سیال سونے کا ساگر'' ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ایک ایسے انسان کا ذکر کیا ہے جو کمزور ہونے کے باوجود لوگوں کی خدمت کر کے لوگوں کو خوشیاں عطا کرتا ہے۔ شاعر

نے اُس شخص کے ذریعے ہمیں خدمت خلق کرنے کا درس دیا ہے تا کہ ہم بھی لوگوں کی خوشیوں کا باعث بن سکیں۔شاعر نے خدمت خلق سے سرشار شخص کے بارے میں کچھ یوں کہا ہے:

بجھے ہوئے تاریک بدن کو
کندن روپ کی شوبھا دے کر
پلکوں کی نوکوں پر رکتا
گالوں پر سرخی پھیلاتا (۷۲)

(اک سیال سونے کا ساگر)

وزیر آغا کی نظموں میں نیک لوگوں کی صفات بیان کر کے ان کا مقام بیان کیا گیا ہے کہ وہ عزّت کی زندگی جیتے ہیں اور اُن کی وفات سے معاشرے میں ایک بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کی موت بھی بہت سہانی ہوتی ہے۔وزیر آغا نے اپنی شاعری میں نیک لوگوں کا ذکر کر کے گناہ گاروں کو سمجھایا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر لیں تا کہ وہ دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکیں۔

''ہوا تحریر کر مجھ کو'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''کس نے دیکھا ہے'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو نیک اور اچھے اعمال کر رہے ہیں۔دنیا آہستہ آہستہ ایسے لوگوں سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے۔''چنا ہم نے پہاڑی راستہ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''مقدس'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ نیک شخص کی ہمارے معاشرے میں عزت ہے، اُس کی وفات کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کس قدر گناہ گار ہیں جب ہم اپنی زندگی کا کسی ایسے شخص کی زندگی سے موازنہ کرتے ہیں۔نیک آدمی کی وفات گناہ گاروں پر عجب کیفیت طاری کر دیتی ہے۔شاعر نے نظم میں کچھ یوں کہا ہے:

آج انھیں جب دفن کیا
تو ہم نے سوچا
ہم پاپی انسانوں سے
کس درجہ وہ افضل تھے (۷۳)

(مقدس)

وزیر آغا کی شاعری میں ان کی زندگی کے تمام اہم واقعات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔اُن کی زندگی کے دوران ہونے والی جنگوں نے اُن کی نفسیات پر جو اثرات مرتّب کیے، وہ ان کی شاعری میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔وزیر آغا جنگ کے مخالف اور امن کے داعی تھے۔اُن کے نزدیک جنگ دوریاں بڑھاتی ہے اور امن

دنیا کو آپس میں جوڑتا ہے۔

شعری مجموعہ ''دن کا زرد پہاڑ'' کی نظم ''جنگ کی ایک رات'' میں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا منظر کھینچا گیا ہے۔ جنگ کے خوف سے لوگوں کی کیفیات بیان کی گئی ہیں۔ لوگ خندقیں کھود کر شام ہوتے ہی اپنے خاندان کے ہمراہ خندقوں میں اپنی جان بچانے کے لیے چھپ جاتے تھے۔ جہاز اُنہیں کسی آفت سے کم نہ لگتے تھے۔ ''عجب اک مسکراہٹ'' کی نظم ''ستمبر'' میں اُنہوں نے جنگ کی ہولناکیاں اور جنگ کے بعد ہونے والے نقصانات کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ستمبر آتے ہی ہمیں ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ یاد آجاتی ہے جب ظلم و بربریت کا بازار گرم ہوا، کئی اموات ہوئیں۔ شاعر ستمبر کے مہینے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ستمبر تیری وجہ سے دو ہمسایہ ممالک کے تعلقات خراب ہوئے اور اب تک ان کے تعلقات بہتر نہ ہو سکے۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے داغ ابھی تک ہمارے سینوں سے دھل نہیں سکے۔ ارمان نجمی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ یوں کہتے ہیں:

> اس مہینہ کی آمد سے شعری کردار ان المناک اور جان گداز یادوں کے نرغے میں گھر جاتا ہے جو اسے اب بھی غم زدہ کر دیتی ہیں۔ اس جنگ کے نتیجہ میں شکست و فتح سے قطع نظر دو پڑوسیوں کے درمیان جو خلیج حائل ہوئی اسے اب تک پاٹا نہیں جا سکا ہے لیکن بربادی اور لاحاصلی کے جان لیوا احساس سے کوئی کسی طرح بچ سکتا ہے۔ (۷۴)

وزیر آغا نے اپنی زندگی کے دوران آنے والے دنیاوی اور ملکی قدرتی حادثات پر گہرے دکھ کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ جس سے اُن کے دوسروں کے بارے میں نرم دلی کا ثبوت ملتا ہے یعنی وہ سنگ دل نہیں بلکہ دردِ دل رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے ساری دنیا کے ساتھ ہمدردی کے جذبات کو اپنی شاعری میں بیان کیا۔ قدرتی حادثہ خواہ کہیں بھی رونما ہوا، اُنہوں نے اس پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔

''چٹکی بھر روشنی'' کی نظم ''لرزتی گونج نیلے پانیوں کی'' سونامی کے سیلاب پر لکھی گئی ہے۔ سیلاب کے آنے کے خوفناک مناظر دکھائے گئے ہیں کہ کیسے انسان پر مصیبتوں کا نزول ہوا۔ سیلاب کے بعد ساحلِ سمندر کا منظر دکھایا گیا ہے کہ کیسے لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سونامی کے واقعے پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے۔ سمندر اور پانی کو موت کی علامت قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پانی جو کہ انسان کی زندگی کی علامت ہے جب جوش اور غصّے میں آتا ہے تو ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ذوالفقار احسن اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سونامی کے سیلاب پر کہی گئی ایک نظم ''گونج نیلے پانیوں کی'' قابل ذکر ہے۔اس نظم میں وہ پورا منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور یہاں سمندر کو موت کی علامت کے طور پر لاتے ہیں۔اس مجموعہ (چٹکی بھر روشنی) میں موت کا سمبل بہت شدت کے ساتھ آیا ہے۔کہیں موت سمندر کے روپ میں ،کہیں دھند،کہیں صدا،کہیں سناٹا،کہیں ملبہ،اور کہیں روشنی کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔(۷۵)

انسان اس دنیا میں کتنی بھی زندگی گزار لے،ایک نہ ایک دن اسے اس دنیا سے جانا ہی پڑتا ہے۔اس عارضی زندگی کے لیے انسان بہت پریشان رہتا ہے اور اس کی بہتری کے لیے تگ و دو کرتا رہتا ہے۔وزیر آغا نے اپنی شاعری میں اس موضوع کو استعمال کیا ہے اور سمجھایا ہے کہ اس عارضی زندگی کی بہتری کے لیے ہر وقت لگے رہنا اور اس کے لیے پریشان ہونا کوئی عقلمندی نہیں،اپنی ہمیشہ کی زندگی کی فکر کرو،اس کے لیے اتنی محنت کرو تو بات بنتی ہے۔رزق کا وعدہ تو خدا نے کر ہی رکھا ہے،وہ تو انسان کو مل کر ہی رہے گا پھر کیوں انسان رزق کے حصول کے لیے اتنا پریشان رہتا ہے۔

شعری کتاب ''اک کتھا انوکھی'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''پرندو'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے انسان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی عارضی ہے۔اس کا مقصد خدا کو راضی کرنا ہے،رہا رزق کا مسئلہ تو اس کے بارے میں پریشان مت ہو کیونکہ اس کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے،وہ ہر کسی کو رزق دیتا ہے۔شاعر نے مزید کہا ہے کہ کل کی فکر مت کرو،پرندوں کی سی زندگی بسر کرو۔پرندے صبح سویرے خدا کا ذکر کرتے ہیں،دن چڑھتے ہی رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں،وہ کل کے رزق کے بارے میں سوچ کر پریشان نہیں ہوتے۔شعری مجموعہ ''عجب اک مسکراہٹ'' میں اس عنوان پر مشتمل نظم کا نام ''کھلونے'' ہے۔اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ انسان ایک کھلونا ہے بلکہ کائنات کی ہر شے ایک کھلونا ہے مراد یہ ہے کہ ہر شے عارضی ہے،کمزور ہے۔شاعر نے نظم میں کچھ یوں کہا ہے:

ہست۔۔۔۔اک ٹوٹا کھلونا ہے
سجا کر میں جسے
اپنی ہتھیلی پر
دکھاتا پھر رہا ہوں ''نیستی'' کی بند آنکھوں کو(۷۶)
(کھلونے)

وزیر آغا نے ''پردیس'' کے موضوع کو اپنی شاعری میں کہیں کہیں لایا ہے۔ اکثر شعرا نے اس موضوع پر شاعری کی ہے۔ اُن کی نظموں میں پردیس جانے والوں کو اپنے وطن کے لیے اپنی توانائیاں استعمال کر کے وطن کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور اس کے علاوہ پردیسیوں کو اُن کے پیچھے رہنے والوں کے حالات سے آگاہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اپنے پیچھے رہ جانے والے اپنے اعزہ و اقارب کو نہ بھولیں اور ان کی زندگی میں جو خلا وہ پیدا کر کے گئے ہیں، اس کو کسی نہ کسی طرح سے پُر کریں جس کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے وطن اور اپنے پیارے رشتوں کے پاس واپس آ جائیں۔

''یار، اتنی دیر کیوں کر دی؟'' کے نام سے نظم وزیر آغا کے شعری مجموعہ ''ہم آنکھیں ہیں'' میں موجود ہے جس میں اُنہوں نے پردیس گئے اپنے کسی عزیز کے غم میں اپنی حالتِ زار کا اظہار کیا ہے۔ پردیس جانے والے عزیز سے التجا کی گئی ہے کہ جلدی اپنے گھر لوٹ آؤ، تمھارے گھر والے تمھاری جدائی کے غم میں نڈھال ہیں۔ ایک اور مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ شاعر بیرون وطن جانے والے اپنے ہم وطنوں سے کہہ رہا ہو کہ تم اپنے وطن لوٹ آؤ کہ تمھارے اپنے وطن کو تمھاری تعلیم اور تجربے کی زیادہ ضرورت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بہت سے پاکستانی بہتر روزگار کے لیے بیرون ملک کا رخ کرتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ملک میں اپنے علم کا استعمال کر کے اس کی ترقی میں حصہ لیں۔ شاعر نے کچھ یوں کہا ہے:

تم لوٹ آؤ گے
تو وہ چاندی سا اجلا گھر
جسے روتا ہوا تم چھوڑ کر
پردیس کی جانب سدھارے تھے (۷۷)
(یار اتنی دیر کیوں کر دی؟)

وزیر آغا کی نظموں کا تجزیہ اس بات کا اظہار ہے کہ ان کا مشاہدہ اور زندگی کا تجربہ بہت گہرا ہے۔ انہوں نے زندگی کے تجربات کو اپنی نظموں میں بیان کر کے انسانی احساسات اور جذبات کو ابھارا ہے۔ اپنی زندگی کے تجربات کے ذریعے انسان کے باطن اور خارج کی عکاسی بھی کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دیکھ دھنک پھیل گئی، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، مئی ۲۰۰۳، ص ۶۶

۲۔ فیصل ہاشمی، ''وزیر آغا کی نظم ASTRAL FEELINGS کا تجزیاتی مطالعہ''، مشمولہ سہ ماہی اسالیب ڈاکٹر وزیر آغا نمبر، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۷

۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ہوا تحریر کر مجھ کو، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۲

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، چٹکی بھر روشنی، مکتبہ کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۰۵، ص ۴۴

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، عجب اک مسکراہٹ، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، مارچ ۱۹۹۷، ص ۳۹

۶۔ ایضاً، ص ۸۹

۷۔ ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، مکتبہ کاغذی پیرہن، سرگودھا، طبع اول، ۲۰۰۱ء، ص ۹۹

۸۔ علی دانش، ''چٹکی بھر روشنی''، مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: شاہد شیدائی، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۰

۹۔ ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۱۰۵

۱۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، چناہم نے پہاڑی راستہ، مکتبہ کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۳۴

۱۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، کاسۂ شام، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۱۱ء، ص ۳۶

۱۲۔ مرتبہ: مولوی نورالحسن نیّر، نوراللغات، جلد چہارم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۶۵

۱۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع ثانی، جنوری ۱۹۷۹، ص ۵۲

۱۴۔ انور سدید، ''نشرگاہ''، مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: شاہد شیدائی، ص ۳۶

۱۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، اظہار سنز، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۸

۱۶۔ وزیر آغا، چٹکی بھر روشنی، ص ۲۳

۱۷۔ ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲۸

۱۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، کاسۂ شام، ص ۴۱، ۴۲

۱۹۔ میاں بہادر شاہ ظفر کاکاخیل، ظفر اللغات، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، سن ندارد، ص ۱۲۴۶

۲۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، چنا ہم نے پہاڑی راستہ، ص ۷

۲۱۔ ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۱۰۴

۲۲۔ ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۱۳۱

۲۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، ص ۱۰۱

۲۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ہوا تحریر کر مجھ کو، ص ۱۷

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۲۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، چنا ہم نے پہاڑی راستہ، ص ۲۸

۲۷۔ پروین طاہر، ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں'' مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: شاہد شیدائی، ص ۱۱۶

۲۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، کاسۂ شام، ص ۲۶

۲۹۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۴۶۲

۳۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۳ء، ص ۶۴

۳۱۔ انور مسعود، ''فیض صنعت'' مشمولہ رونامہ ایکسپریس، فیصل آباد، منگل ۲۸ مئی ۲۰۱۵ء، ص ۱۳

۳۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام اور سائے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع ثانی، ۱۹۸۵، ص ۴۹، ۵۰

۳۳۔ ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۴۱

۳۴۔ ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا ہے، ص ۱۱۷

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۳۶۔ ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۵۸

۳۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دیکھ دھنک پھیل گئی، ص ۴۸

۳۸۔ علی محمد فرشی، ''یہ آواز کیا ہے'' مشمولہ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: شاہد شیدائی، ص ۹۸

۳۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، یہ آواز کیا ہے، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، ۱۹۹۵ء، ص ۴۲

۴۰۔ ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۸۴

۴۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ہوا تحریر کر مجھ کو، ص ۷۰

۴۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، چٹکی بھر روشنی، ص ۲۹

۴۳۔ ناصر عباس نیر، دن ڈھل چکا تھا، ص ۱۱۵

۴۴۔ ناصر عباس نیر، دن ڈھل چکا تھا، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۶

۴۵۔ارمان نجمی، بیاضِ شب وروز،ص ۶۹

۴۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، اک کتھا انوکھی، مکتبہ فکر وخیال، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۹۰ء، ص ۴۲

۴۷۔ارمان نجمی، بیاضِ شب وروز،ص ۶۷

۴۸۔ایضاً،ص ۹۳

۴۹۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چنا ہم نے پہاڑی راستہ،ص ۶۶

۵۰۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، آسان کلیات اقبال، مکتبہ دانیال، لاہور، سن ندارد، ص ۳۴۵

۵۱۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام اور سائے،ص ۵۱

۵۲۔ایضاً،ص ۱۱۷

۵۳۔ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا،ص ۵۲

۵۴۔فرحت ہاشمی، ڈاکٹر، حسن اخلاق، الہدیٰ انٹرنیشنل، اسلام آباد، طبع اوّل، فروری ۲۰۰۶ء، ص ۱۲

۵۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، دیکھ دھنک پھیل گئی،ص ۲۴

۵۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چٹکی بھر روشنی،ص ۸۶

۵۷۔ارمان نجمی، بیاضِ شب وروز،ص ۸۸

۵۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، عجب اک مسکراہٹ،ص ۷۳

۵۹۔حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر، آسان کلیات اقبال،ص ۲۳۶

۶۰۔ایضاً،ص ۲۳۶

۶۱۔ایضاً،ص ۲۵۲

۶۲۔ایضاً،ص ۴۲۵۔۴۳۳۔۴۴۸۔۴۶۸۔۴۷۲۔۴۷۵

۶۳۔ایضاً،ص ۴۹۶

۶۴۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چنا ہم نے پہاڑی راستہ،ص ۱۰۷

۶۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، صفحہ نمبر ۲۷

۶۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، یہ آواز کیا ہے،ص ۴۵

۶۷۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام اور سائے،ص ۹۵

۶۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، کاسۂ شام،ص ۴۸

۶۹۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چنا ہم نے پہاڑی راستہ،ص ۷۷

۷۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، اک کتھا انوکھی، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۹۰ء، ص ۴۷

۷۱۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چٹکی بھر روشنی، ص ۱۸

۷۲۔وزیر آغا، ڈاکٹر، نردبان، ص ۸۷

۷۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چنا ہم نے پہاڑی راستہ، ص ۹۴، ۹۵

۷۴۔ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، ص ۹۷

۷۵۔ذوالفقار احسن، ''وزیر آغا کی نظم نگاری ''چٹکی بھر روشنی'' کے حوالے سے''، مشمولہ سہ ماہی اسالیب ڈاکٹر وزیر آغا نمبر، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۲

۷۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، عجب اک مسکراہٹ، ص ۶۲، ۶۳

۷۷۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ہم آنکھیں ہیں، ص ۱۶

حاصلات ونتائج

وزیر آغا اردو نظم نگاری کا اہم نام ہیں اور ان کی نظمیں موضوعاتی سطح پر داخلی اور خارجی دونوں جہات کا احاطہ کرتی ہیں۔ داخلی جہات جہاں ان کی باطنی شخصیت کو ہمارے سامنے لاتی ہیں، اسی طرح ان کی نظموں کی خارجی جہات کا تجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ان کی شخصیت اپنے خارج کے پھیلاؤ سے ہم آہنگ تھیں اور وہ خدا، انسان اور کائنات کی مثلث کو اپنے تفکرات کا تخلیقی حصہ بنائے ہوئے تھی۔

وزیر آغا اہل تشیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ہاں محرّم میں ہر سال مجالس ہوا کرتی تھیں جن میں میر انیس اور دبیر کے مرثیہ پڑھے جاتے تھے۔ ان مجالس میں پڑھے جانے والے مراثی نے ان کو بچپن سے ہی شاعری کی طرف راغب کیا۔ اس کے بعد مڈل سکول میں انہیں ایک شاہ صاحب استاد میسر آئے جنہوں نے ان میں موجود شاعری کی صلاحیت دیکھ کر ان کی تربیت کرنی شروع کی۔ انہوں نے کم عمری میں بہت زیادہ اشعار زبانی یاد کر لیے۔ بچپن میں ہی وہ اور دیگر ان کے گھر میں موجود بچے وزیر آغا کے والد کے ہمراہ ریل گاڑی پر سیر کی غرض سے سفر کے لیے گئے تو رستے میں وزیر آغا فطرتی مناظر دیکھ کر اپنی خیالی دنیا میں کھو گئے۔ ان فطرتی مناظر نے ان کو بہت متاثر کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شروع سے ہی فطرت سے لگاؤ اور ادبی ذوق رکھتے تھے لیکن انہوں نے باقاعدہ طور پر شاعری کالج کے زمانہ میں شروع کی۔ کالج میں بھی انہیں اچھے اساتذہ میسر آئے جنہوں نے ان کے فن کو مزید نکھارا۔ ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ سیر و سیاحت کی۔ اس سیر و سیاحت کے دوران وہ کئی پُر فضا مقامات پر گئے جہاں موجود قدرتی نظاروں نے وزیر آغا کو شاعری پر اکسایا۔ اسی لیے اُن کی نظموں میں قدرتی مناظر سے لگاؤ کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔

وزیر آغا نے شاعری میں نظم نگاری کو چنا۔ گو یا وہ بعد میں غزل بھی کہتے رہے لیکن وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میری اصل نظم نگاری ہے۔ انہیں نظم سے بے حد لگاؤ تھا۔ چونکہ وہ ایک مفکر اور نقاد تھے اور وہ اس حوالے سے نثر نگار بھی تھے۔ عموماً نثر نگار اور فکری نثر لکھنے اور پڑھنے والے نظم نگاری کو چنتے ہیں کیونکہ نظم میں غزل کے مقابلے میں نثر کی طرح تفصیلِ اظہار کا موقع ملتا ہے۔ ان کی پہلی باقاعدہ نظم ''دھرتی کی آواز'' حلقہ ارباب ذوق کی سالانہ بہترین نظموں میں چنی گئی۔ یوں وزیر آغا کا شاعری میں باقاعدہ نقطۂ آغاز نظم بنا جسے انہوں نے مرتے دم تک جاری رکھا۔ وہ نظم کہے بغیر رہ نہ سکتے تھے کیونکہ وہ نظم میں اپنی اندرونی کیفیات اور جذبات کا صحیح

اظہار کر لیتے تھے۔ انہوں نے زندگی بھر نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنائے رکھا اور چودہ نظموں کے مجموعے تخلیق کیے جوان کا نظم سے بے پناہ محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بڑھاپے کی عمر میں پہنچ کر انہوں نے نظم نگاری ترک کرنے کا ارادہ کیا لیکن کچھ لوگوں نے ان کی نظموں کا خوب مذاق اڑایا جس نے ان کو مایوس کرنے کے بجائے مزید ابھارا اور پھر انہوں نے مرتے دم تک نظم لکھنی جاری رکھی۔ نظم وہ واحد صنفِ ادب ہے جسے وزیر آغا نے آغاز سے انتہا تک نہ چھوڑا، یہ بات بھی ان کی نظم سے بے پناہ محبت کو عیاں کرتی ہے۔

وزیر آغا نے اپنی زندگی میں بہت محنت، جستجو اور تگ و دو کی۔ انہوں نے بہت سے علوم کا مطالعہ کیا جس میں نفسیات اور طبیعات جیسے علوم بھی شامل ہیں جس کی بدولت وہ زندگی کے کئی راز جان گئے ہوں گے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں زمان و مکان کے اسرار جاننے کا ذکر بار بار کیا ہے اور اس کے علاوہ عالم کے بارے میں بھی مختلف انداز سے بات کی ہے مثلاً عالم سب کچھ جان چکا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی زبان خاموش ہو جاتی ہے، وہ کسی سے وہ بھید بیان نہیں کر پاتا جو وہ جان چکا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں میں صنعتی ترقی پر چوٹ بار بار کی گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گاؤں کے آدمی تھے، شہر میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ گاؤں کی کھلی اور تازہ فضا شہر میں میسر نہیں آتی اور اس کی وجہ شہروں میں صنعتوں کا قیام ہے جنہوں نے شہری فضا کو آلودہ کر رکھا ہے۔ اس لیے وزیر آغا نے صنعتی ترقی پر سخت تنقید کی ہے۔ وزیر آغا کی زندگی میں کئی صدمے آئے، ایسا نہیں کہ وزیر آغا کے ساتھ ایسا ہوا بلکہ دنیا کے ہر انسان کا زندگی میں کئی صدموں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا نے اس آفاقی موضوع ''دکھ'' کو اپنی نظموں میں بہت زیادہ لایا ہے۔ جب بھی انہیں زندگی نے کوئی صدمہ دیا، انہوں نے اپنا غم نظم کی صورت میں کاغذ پر بیان کر دیا مثلاً ان کی والدہ کی وفات کا غم ہو یا اہلیہ کا، داماد کی وفات کا دکھ ہو یا دوست کے بیٹے کی اچانک وفات کا صدمہ، یہ سب کے سب دکھ ان کی نظموں میں با آسانی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ بڑھاپے میں انہیں تنہائی کا احساس بہت ستانے لگا، اس احساس کا اظہار بھی انہوں نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔

اردو ادب کی شروع کی شاعری محض بادشاہوں کی تعریفوں اور دل جوئی کے مضامین پر مبنی تھی۔ اس کی بڑی وجہ مسلمانوں کا اقتدار کے نشے میں دھت ہو کر خارجی مظاہر کو شاعری میں بیان کرنا اور مادّی فائدے حاصل کرنا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی بجائے آہستہ آہستہ زوال کی طرف جانے لگے۔ کسی بھی زبان کا ادب اس زبان کے بولنے والوں کی سوچ، فکر اور جذبات کا عکاس ہوتا ہے۔ اردو ادب کے آغاز کی شاعری پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایسی قوم کی شاعری ہے جو عقل و شعور سے عاری اور مادّیت پرستی کی طرف گامزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان برّصغیر میں روز بروز کمزور ہونے لگے اور بالآخر غلامی

ان کا مقدّر ٹھہری۔ جب ۱۸۵۷ء میں مسلمان اپنی غلطیوں کی سزا جنگِ آزادی میں شکست کے ذریعے پا چکے تو اس وقت کے کچھ سمجھ دار مسلم طبقے نے اپنے ادب کو بہتر کرنے کی طرف خاص توجہ دی۔ آغاز میں سرسید احمد خاں نے اپنے رفقاء کے ذریعے اردو شاعری کو غزل سے نجات دلا کر نظم نگاری کی طرف توجہ دی۔ جس کے نتیجے میں اردو ادب میں جدّت پیدا ہوئی۔ سرسید اور ان کے رفقاء اردو شاعری کو بادشاہوں کی تعریفوں اور خارجی پہلوؤں سے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگے اور نظم نگاری کے ذریعے اردو شاعری کو باطن اور حب الوطنی کے جذبات سے آشنا کرنے لگے۔ یہیں سے باقاعدہ طور پر اردو ادب میں جدید نظم نگاری کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل نظیر اکبر آبادی نے بھی اردو نظم میں نئے نئے موضوعات لا کر اردو نظم میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن سرسید کے رفقاء نے ایک باقاعدہ تحریک چلا کر نئی نظم کی داغ بیل ڈالی۔ اردو ادب نے عالمی اثرات کو بھی قبول کیا جن کی بدولت اردو ادب میں نظم معرّا، آزاد نظم اور نثری نظم آئیں اور ان کا اردو نظم نگاروں نے بہت اچھا استعمال کیا۔ جہاں نظم کے اثرات قبول کیے گئے وہیں عالمی ادبی تحریکوں کے اثرات بھی اردو ادب پر مرتب ہوئے جن کی بدولت اردو میں رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق جیسی ادبی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان تمام تحاریک نے اردو ادب اور خاص طور پر جدید نظم کو بہت فروغ بخشا۔ حلقہ ارباب ذوق کے دور میں وزیر آغا ادب میں کافی حد تک بالغ ہو چکے تھے۔ انہوں نے بھی جدید نظم میں طبع آزمائی کی اور نئے نئے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصّہ بنا کر جدید اردو نظم کو وسعت عطا کی۔

وزیر آغا نے انسان کا دکھ سے گہرا تعلق بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کو اپنی پہچان کرنے کی بار بار نصیحت کی ہے کیونکہ اگر انسان خود کو پہچان جائے تو وہ کائنات کے اسرار و رموز جان جاتے ہیں۔ اس کی زندگی بامقصد ہو جاتی ہے اور وہ ایک مفید فرد بن جاتا ہے۔ ''نیکی و بدی'' کا موضوع بھی وزیر آغا کی نظموں میں بیان کیا گیا ہے۔ وزیر آغا نے اس بات پر حیرانی کا اظہار کیا ہے کہ جب سے دنیا تخلیق ہوئی ہے، ہمیشہ سے بُرائی کا بول بالا رہا ہے اور نیکی کا فقدان رہا ہے۔ اس کے علاوہ مزید کہا ہے کہ نیکی صبح اور روشنی ہے جب کہ بُرائی رات اور تاریکی ہے اور تاریکی کے بعد اجالا ضرور ہوتا ہے اس لیے بُرائی کا خاتمہ ضرور ہو کر رہے گا۔ ''امید و ناامیدی'' کے موضوع کو بھی وزیر آغا نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب انسان مایوس ہو جاتا ہے تو امید کی روشنی کے باعث ہی وہ دوبارہ زندگی کی طرف واپس آتا ہے۔

''بہادری''، ''محبت'' اور ماں جیسے موضوعات بھی وزیر آغا کی شاعری میں موجود ہیں۔ انہوں نے اس انسان کو بہادر قرار دیا ہے جو ظلم کے خلاف آواز بلند کرے اور جو اتنی ہمت نہیں رکھتا، اسے بزدل اور کمزور قرار دیا ہے۔ ''محبت'' کے جذبے کو بھی انہوں نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ یہ ایسا جذبہ ہے

جوانسان کوامن کی طرف لے جاتا ہے، اگراس کی جگہ نفرت کا جذبہ لے لے تو ہر طرف بدامنی اور انتشار پھیل جاتا ہے۔ والدہ کی وفات کا صدمہ ہر انسان کے لیے نا قابل برداشت اور نا قابل فراموش ہوتا ہے۔ ماں کی جدائی برداشت کرنا دنیا کا سب سے بڑا غم ہے۔ وزیر آغا والدہ کی وفات پر جب اس اندوہ ناک واقعے سے گزرے تو انہوں نے ماں کے بارے میں اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کو نظم کے ذریعے بیان کیا۔ ہر انسان کی طرح وہ بھی ماں سے جدائی کا غم برداشت نہ کر سکے۔

''انسانی ارتقاء''، ''انسان کی حیثیت'' اور ''انسانی مجبوری و لاچاری'' جیسے موضوعات کو وزیر آغا نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ وہ انسان کی ارتقائی منازل کو شاعری میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ شروع کا انسان بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور آج جدید مشینی دور نے انسان کو بہت سے فطرتی مناظر کے لطف سے بے بہرہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی نظم نگاری میں انسان کی حیثیت جیسے اہم عنوان کو زیر بحث لائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر انسان خود کو پہچان لے تو اس سے قیمتی اور اہم کوئی اور شے نہیں اور اگر وہ خود کو نہ پہچانے تو اس سے بے کار کوئی شے نہیں۔ یوں انہوں نے انسان کو اپنی پہچان کرنے کا درس دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر وہ اپنی حیثیت جان لے تو وہ کائنات کا سب سے اہم حصہ بن جائے گا۔ ''انسانی مجبوری ولاچاری'' کو موضوع بناتے ہوئے وزیر آغا نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ انسان خود مختار ہونے کے باوجود کئی طرح کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ انسان کی ان مجبوریوں سے بہت تنگ ہیں اور وہ تمام راز جاننا چاہتے ہیں جو انسان سے مخفی رکھے گئے ہیں۔ جگہ جگہ وہ اللہ تعالی سے یہی سوال کرتے ہیں کہ اس نے انسان کو کچھ امور میں اتنا بے بس اور مجبور کیوں بنایا ہے؟

''پرانی یادیں''، ''زندگی کے مختلف ادوار'' اور ''بڑھاپا'' بھی وزیر آغا کی شاعری کے اہم انسانی موضوعات ہیں۔ انہوں نے اس پرانی یاد کے احساس کو بہت شدّت سے محسوس کیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا ایک اہم موضوع بنایا ہے۔ ان کے نزدیک اچھی پرانی یادیں انسان کو تنہائی میں مسرّت بخشتی ہیں اور تنہائی کا احساس کم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی کے مختلف ادوار کو بیان کیا ہے۔ بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی اور بڑھاپا ان تمام کے تمام ادوار کو شاعری کی زبان میں بیان کیا ہے۔ خاص طور پر بڑھاپا ان کی شاعری کا الگ سے ایک اہم عنوان رہا ہے۔ انہوں نے بڑھاپے میں پہنچ کر اپنی کیفیات کو شاعری کے ذریعے بیان کے ہے جو یقیناً صرف ان کی کیفیات نہیں بلکہ ہر بوڑھے انسان کی کیفیات ہوتی ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے یہ بات بیان کی ہے کہ بڑھاپے میں تنہائی انسان کا ساتھی بن جاتی ہے جو اُس کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتی چیز ہوتی ہے۔

''موت''، ''اہلیہ کی وفات''، ''سردی''، ''ہوا'' اور ''تنہائی'' جیسے عنوانات بھی وزیر آغا کی نظموں میں بیان ہوئے ہیں۔ موت کے بارے میں ان کے خیالات کچھ یہ ہیں کہ یہ تو ہر انسان کو آنی ہے لیکن نیک انسان کی موت بہت آسان ہوتی ہے بلکہ اس کے لیے خوشی کے پیغام لاتی ہے جبکہ بُرے شخص کے لیے موت کا تجربہ بہت خوفناک ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی میں جب اہلیہ کی وفات کا صدمہ سہا تو اس کے بارے میں اپنے احساسات کو بھی شاعری میں بہت شدّت سے بیان کیا۔ ان کی اہلیہ کی وفات کے دور میں ان کی لکھی ہوئی زیادہ تر نظموں میں یہی عنوان زیر بحث رہا ہے۔

وزیر آغا کی نظموں میں موجود معاشرتی و سماجی موضوعات میں ''کائنات کے اسرار و رموز جاننا''، ''وقت کی قدر''، ''محنت میں عظمت'' اور ''عالم'' وزیر آغا کے چند اہم سماجی موضوعات ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو انسان تعلیم یافتہ ہوتا ہے، اس کے ذہن و قلب میں کائنات کے اسرار و رموز جاننے کی تڑپ ضرور ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان کو وقت کی قدر کا جا بجا درس دیتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ وقت کی قدر کرنا زندگی کو قیمتی بناتا ہے۔ اس کے علاوہ وزیر آغا نے انسان کو سستی و کاہلی کو دور بھگانے اور محنت کرنے پر اُکسایا ہے کیونکہ اس دنیا میں جتنے نامور لوگ گزرے ہیں یا جن کے نام آج زندہ ہیں، ان سب نے اپنی زندگی میں بے شمار محنت کی۔ اس لیے شاعر ہمیں بھی محنت کرنے کا درس دیتا ہے اور کاہلی و سستی کو انسان کا دشمن قرار دیتا ہے۔ ''عالم'' کا موضوع وزیر آغا کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ وہ اپنی نظموں میں بیان کرتے ہیں کہ اہلِ علم لوگ جب کائنات کے اسرار و رموز جان جاتے ہیں تو ان کی زبان گنگ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ ایسے راز جان جاتے ہیں جنہیں انجان لوگ قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ کسی کو بتاتے نہیں ہیں لیکن دوسری طرف وزیر آغا عالموں سے کہتے ہیں کہ وہ اپنا علم دوسروں تک پہنچائیں ورنہ ان کے علم کی مثال تالات اور جوہڑ کے ٹھہرے ہوئے پانی جیسی ہوگی۔ ''صنعتی ترقی کا ردّ'' اور ''نئی نسل کی تباہی'' بھی وزیر آغا کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ صنعتی ترقی کو ماحول اور فطرتی خوبصورتی کا قاتل قرار دیتے ہیں اور اس سے بہت نفرت رکھتے ہیں۔ وہ وہی پہلا دور چاہتے ہیں جب انسان فطرتی مناظر سے لطف اندوز ہو کر زندگی گزارتا تھا۔ ان کے نزدیک صنعتوں نے انسان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس کے علاوہ نئی نسل کی مغربی تہذیب کو اختیار کر کے بے راہ ہونے کا بھی شدید ردّ وزیر آغا کی شاعری میں موجود ہے۔ ''ظلم کے خلاف آواز''، ''اسلاف کی پیروی'' اور ''رہنما کی ضرورت'' بھی اہم موضوعات ہیں۔ اپنے اردگرد ظلم کا بازار گرم دیکھ کر وزیر آغا نے لوگوں میں اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت پیدا کی ہے اور اسی میں معاشرے کی بہتری قرار دی ہے ورنہ ظالم کو تقویت ملتی رہے گی اور معاشرہ کبھی پُر امن نہیں ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ اپنے بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اگر دوبارہ

دنیا میں عزت حاصل کرنی ہے تو اس کے اسلاف کی اطاعت کرنا ناگزیر ہے۔ معاشرے کے حالات دیکھ کر ایک ایسے رہنما کی ضرورت بھی وزیر آغا نے محسوس کی ہے جو افراد کو اس معاشرتی تباہی سے نکال دے۔

مختصر یہ کہ وزیر آغا جدید اردو نظم نگاری کے اہم شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات کو بیان کرتی ہیں۔ انہوں نے انسان کے باطن اور خارج کو اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کے مطابق پیش کیا۔ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ انہوں نے مختلف ادبی اصناف میں طبع آزمائی کی اور مختلف علوم پر تحقیق کی مثلاً علمِ نفسیات اور علمِ طبعیات۔ یوں ان کی سوچ و فکر کا دائرہ خاصا وسیع ہے جس کا احساس ان کی اکثر نظمیں پڑھ کر ہوتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات

۱۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''شام اور سائے (نظمیں)''، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع ثانی، ۱۹۸۵ء

۲۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''دن کا زرد پہاڑ (نظمیں اور غزلیں)''، جدید ناشرین، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۶۹ء

۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''نردبان (نظمیں)، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع ثانی، جنوری ۱۹۷۹ء

۴۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''آدھی صدی کے بعد (طویل نظم)''، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۱ء

۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''گھاس میں تتلیاں (نظمیں)''، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، طبع اوّل، جولائی ۱۹۸۵ء

۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''اک کتھا انوکھی (نظمیں و غزلیں)''، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۹۰ء

۷۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''یہ آواز کیا ہے (نظمیں)''، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، ۱۹۹۵ء

۸۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''عجب اک مسکراہٹ (نظمیں)''، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، مارچ ۱۹۹۷ء

۹۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''چناہم نے پہاڑی راستہ (نظمیں)''، مکتبہ کاغذی پیرہن،، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۹۹ء

۱۰۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''ہم آنکھیں ہیں (نظمیں)''، مکتبہ کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، جون ۲۰۰۱ء

۱۱۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''دیکھ دھنک پھیل گئی (نظمیں)''، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، مئی ۲۰۰۳ء

۱۲۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''چٹکی بھر روشنی (نظمیں)''، مکتبہ کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۰۵ء

۱۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''ہوا تحریر کر مجھ کو''، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۹ء

۱۴۔وزیر آغا، ڈاکٹر، ''کاسۂ شام''، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۱۱ء

ثانوی ماخذات

۱۔ارمان نجمی، بیاض شب و روز، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۰۱ء

۲۔اشتیاق حسین، علامت نگاری (انتخاب مقالات)، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۰۵ء

۳۔الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۱ء

۴۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، طبع پنجم، ۲۰۰۶ء

۵۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع چہارم، ۱۹۹۹ء
۶۔انور سدید، ڈاکٹر، ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۳ء
۷۔انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا۔ شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء
۸۔ایم نذیر احمد تشنہ، اردو ادب کا ارتقاء، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء
۹۔جابر علی سید، جدید شعری تنقید، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۲ء
۱۰۔جمیل ملک، ادبی منظر نامے، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳
۱۱۔حمید احمد خاں، پروفیسر، ارمغان حالی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، جنوری ۲۰۱۰ء
۱۲۔حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظم معرا اور نظم آزاد، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
۱۳۔خاطر غزنوی، جدید اردو ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء
۱۴۔خلیق انجم، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلی، ۱۹۹۶ء
۱۵۔خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، انتخاب زریں اردو نظم، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء
۱۶۔ذوالفقار احسن، تنقیدی افق، نقش گر، راولپنڈی، طبع اول، ۲۰۱۴ء
۱۷۔رالف رسل، اردو ادب کی جستجو، مترجم: محمد سرور رجا، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۳
۱۸۔رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم، مئی ۲۰۰۷، ص ۱۲۸، ۱۲۹
۱۹۔رشید امجد، ڈاکٹر، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، دستاویز مطبوعات، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء
۲۰۔رشید امجد، ڈاکٹر، جدید ادبی تناظر، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع اوّل، ۲۰۱۲ء
۲۱۔رشید نثار، ڈاکٹر وزیر آغا اور ہمارا عہد، پنڈی اسلام آباد ادبی سوسائٹی، راولپنڈی، ۱۹۹۸ء
۲۲۔رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء
۲۳۔رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء
۲۴۔ساقی فاروقی، ہدایت نامہ شاعر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
۲۵۔ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳
۲۶۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، طبع انتیس، ۲۰۰۹ء
۲۷۔سید محمد ابوالخیر کشفی، اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پسِ منظر، نشریات، لاہور، ۲۰۰۷ء
۲۸۔شاذیہ ناہید شفاعت، نظم جدید اور فضا اعظمی کی طویل نظم نگاری، نقش پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء
۲۹۔: شاہد شیدائی، نئے مکالمات، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۱۰ء

۳۰۔شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء
۳۱۔صفیہ بانو، ڈاکٹر، انجمن پنجاب تاریخ وخدمات، کفایت اکیڈمی، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۷۸ء
۳۲۔طاہرہ نیر، ڈاکٹر، اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۹۹ء
۳۳۔عابد خورشید، وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۷ء
۳۴۔عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
۳۵۔عتیق اللہ، ڈاکٹر، اردو نظم، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۰ء
۳۶۔عزیز حامد مدنی، جدید اردو شاعری (حصہ دوم)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۹۴ء
۳۷۔غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء
۳۸۔غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۳ء
۳۹۔فاطمہ تنویر، ڈاکٹر، اردو شاعری میں انسان دوستی، مطبع بھارت آفسٹ، دہلی ۶، نومبر ۱۹۹۴ء
۴۰۔فخر الحق نوری، محمد، ڈاکٹر، مطالعۂ راشد (چند نئے زاویئے)، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ستمبر ۲۰۱۰ء
۴۱۔فرحت ہاشمی، ڈاکٹر، حسن اخلاق، الہدیٰ انٹرنیشنل، اسلام آباد، طبع اوّل، فروری ۲۰۰۶ء
۴۲۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
۴۳۔قمر رئیس۔سید عاشور کاظمی: مرتبین، ترقی پسند ادب، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء
۴۴۔کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء
۴۵۔گوپی چند نارنگ، بیسویں صدی میں اردو ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء
۴۶۔گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء
۴۷۔محسن عباس، ڈاکٹر، وزیر آغا کی نظم نگاری، مثال پبلشرز، فیصل آباد
۴۸۔محمود احمد اسیر، ڈاکٹر، مولانا صلاح الدین احمد احوال وآثار، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۹ء
۴۹۔منظر ایوبی، پروفیسر، اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش، انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، کراچی، طبع اوّل، ۲۰۱۰ء
۵۰۔ناصر عباس نیّر، دن ڈھل چکا تھا، مکتبہ نردبان، سرگودھا، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء
۵۱۔ناہید قاسمی، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۲ء
۵۲۔وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، اظہار سنز، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۹ء

۵۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء
۵۴۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، آفتاب ادب۔ ڈاکٹر وزیر آغا نقش گر، راولپنڈی، طبع اوّل، اکتوبر ۲۰۱۱ء
۵۵۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، سرگودھا میں وزیر آغا شناسی، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۴ء
۵۶۔ ہارون الرشید، پروفیسر، جدید اردو شاعری۔ تاریخ و تنقید، میڈیا گرافکس، کراچی، ۲۰۱۰ء
۵۷۔ یونس حسنی، ڈاکٹر، اختر شیرانی اور جدید اردو ادب، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع دوم، ۲۰۰۹ء

رسائل و اخبارات

۱۔ اخبار اردو، ماہنامہ، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۱۰ء
۲۔ اخبار اردو، ماہنامہ، اسلام آباد، مارچ اپریل ۲۰۱۵ء
۳۔ اردو دنیا، ماہنامہ، دہلی، اکتوبر ۲۰۱۴ء
۴۔ اسالیب، سہ ماہی، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء
۵۔ اوراق، ماہنامہ، لاہور، جولائی، اگست ۱۹۹۷ء
۶۔ تجدید نو سہ ماہی ڈاکٹر وزیر آغا نمبر، لاہور، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء
۷۔ دریافت، شمارہ: ۱۰، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۱ء
۸۔ کاغذی پیرہن، ماہنامہ، مکتبہ کاغذی پیرہن، لاہور، مارچ، اپریل ۲۰۱۱ء
۹۔ کتابی سلسلہ کولاژ 2، مدیران: اقبال نظر، شاہدہ تبسم، کولاژ پبلیکیشنز کراچی، سن ندارد
۱۰۔ معیار ۵، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، سن ندارد
۱۱۔ نقاط ۹، فیصل آباد، جون ۲۰۱۰ء
۱۲۔ ایکسپریس، روزنامہ، فیصل آباد، منگل ۲۶ مئی ۲۰۱۵ء
۱۳۔ ایکسپریس، روزنامہ، فیصل آباد، ۲۸ مئی ۲۰۱۵ء

لغات

۱۔ جامع اللغات، جلد اوّل، عبدالمجید، خواجہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، طبع اوّل، مارچ ۱۹۸۹ء
۲۔ جامع نسیم اللغات اردو، مرتبین: سید قائم رضا نسیم امروہوی، سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، شیخ غلام علی اینڈ

سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، سن ندارد
۳۔ جواھر اللغات، بشیر احمد صدیقی، پروفیسر، کتابستان پبلشنگ کمپنی، لاہور، سن ندارد
۴۔ ظفر اللغات، میاں بہادر شاہ ظفر کاکاخیل، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، سن ندارد
۵۔ فرہنگ آصفیہ، مئولف: سید احمد دہلوی، مرتبہ: خورشید احمد خاں، جلد دوم، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، لاہور، طبع سوم، سن ندارد
۶۔ فرہنگ تلفظ، مرتبہ: شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، طبع چہارم، ۲۰۱۲ء
۷۔ نور اللغات، جلد چہارم، مرتبہ: مولوی نور الحسن نیّر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء

بالمشافہ

۱۔ ذوالفقار احسن، ''راقم سے گفتگو'' بوقت: ۱۰ بجے صبح، بمقام گلی نمبر ۴، مکان نمبر ۸۵/۸، اسلام پورہ،، سرگودھا، مورخہ ۸ جولائی ۲۰۱۲ء
۲۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، ''راقم سے گفتگو'' بوقت: ۱ بجے دن، بمقام چک ۵۶ جنوبی، وزیر کوٹ، سرگودھا، ۱۷ جولائی ۲۰۱۲ء
۳۔ ذوالفقار احسن، ''راقم سے گفتگو'' بوقت: ۹ بجے صبح، بمقام گلی نمبر ۴، مکان نمبر ۸۵/۸، اسلام پورہ،، سرگودھا، مورخہ ۱۲ اگست ۲۰۱۳ء
۴۔ ذوالفقار احسن، ''راقم سے گفتگو'' بوقت: ۱۰ بجے صبح، بمقام ایضاً،، سرگودھا، مورخہ ۱۲ جولائی ۲۰۱۴ء
۵۔ ذوالفقار احسن، ''راقم سے گفتگو'' بوقت: ۸ بجے صبح، بمقام ایضاً، سرگودھا، مورخہ ۱۵ اپریل ۲۰۱۵ء